اسلام آباد سے کابل
براستہ پشاور

عقیل یوسفزئی

اسلام آباد سے کابل

براستہ پشاور

عقیل یوسفزئی

نام کتاب	:	اسلام آباد سے کابل براستہ پشاور
مصنف	:	عقیل یوسفزئی
سرورق	:	تیمور ندیم
اشاعت	:	ستمبر 2011ء
تزئین	:	زاہد عمران
قیمت	:	450 روپے
تعداد	:	ایک ہزار
مطبع	:	شرکت پریس، لاہور

ISBN:978-969-9645-01-3

پوسٹ بکس نمبر 2110، اسلام آباد

فون: 051-2291586

ای میل: info@narratives.pk

ویب سائٹ: narratives.pk

فہرست

اپنی بات ________ 7

قومی سلامتی

1) نہ ہی خدا ملا نہ دیدار صنم ________ 10
2) گوریلا وار اور پاکستان کی عسکریت پسند تنظیمیں ________ 16
3) زمینی حقائق کا ایک خاکہ ________ 21
4) دوراہے پر کھڑے پاکستان کا مستقبل ________ 26
5) پاکستان خطرات کی زد پر ________ 32
6) کراچی کے پختونوں کا المیہ ________ 37
7) لاپتہ افراد کا مستقبل ________ 44
8) گرفتار حملہ آوروں کی رہائی، لمحۂ فکریہ ________ 48
9) فرقہ ورانہ دہشت گردی کے نئے رجحان کا آغاز ________ 53
10) پشتونوں کی تباہی، ان کا مقدمہ اور بڑھتی ناامیدی ________ 58
11) غلطیوں سے سبق سیکھنے کا موقع ________ 61
12) کہنے میں کیا حرج ہے؟ ________ 64
13) جب خاموشی موت کو جنم دیتی ہے ________ 68
14) اگر مگر سے کب تک کام چلتا رہے گا ________ 72
15) بدنصیبی سے خونِ ناحق کی ارزانی تک ________ 76
16) بلوچستان کی بغاوت کے ذمہ دار ________ 80

17) جنگ ابھی جاری ہے ______ 84

18) ٹارگٹ کلنگ سے نسل کشی تک ______ 88

19) بے بسی سے بے حسی تک ______ 91

20) عدالتی نظام میں اصلاحات کی ضرورت ______ 95

طالبان

21) تاریخ سے رجوع کرنے کی ضرورت ______ 100

22) پنجابی طالبان کا پسِ منظر ______ 104

23) القاعدہ اور طالبان کو الگ کرنے کی کوششیں ______ 110

24) کیا پاکستانی طالبان سے مفاہمت ممکن ہے؟ ______ 115

25) طالبان کے نام پر نئی ڈالر گیم کا آغاز ______ 120

26) طالبان اور ہماری یکطرفہ خواہش ______ 125

خیبر پختونخوا و قبائلی علاقے

27) فاٹا کی تاریخ اور مستقبل ______ 129

28) پشتونوں کا امیج اور عالمی رائے عامہ ______ 140

29) امن لشکر اور عوام کی تشویش ______ 146

30) علم سے محرومی، موجودہ مسائل کی بنیادی وجہ ______ 152

31) امن برائے فروخت ______ 157

32) فاٹا عسکریت پسندوں کے نشانے پر ______ 161

33) دنیا کی اڑھائی ارب آبادی میں بے چینی کی لہر ______ 166

34) نیٹو کی سپلائی لائن کو لاحق خطرات ______ 170

35) کیا اب شمالی وزیرستان کی باری ہے؟ ______ 173

36) کرم ایجنسی میں تشدد کا پسِ منظر ______ 177
37) غلطیاں دہرانے کا ریاستی سلسلہ ______ 184
38) کلچر انڈر ٹرائل ______ 189
39) فاٹا، بفرزون سے وارزون تک ______ 194
40) ''ٹرننگ پوائنٹ'' ______ 200
41) وہ کون تھا؟ ______ 204
42) پڑھنا منع ہے ______ 208
43) قیامِ امن کے لیے چند تجاویز ______ 211

افغانستان

44) ڈیورنڈ لائن انڈر پریشر ______ 215
45) بہتری کی شاہراہ پر گامزن افغانستان ______ 220
46) خطے میں بڑھتی ہوئی پیچیدگیاں ______ 225
47) پاکستان کی افغان پالیسی ______ 230
48) خطے کی تاریخ کا بدترین دور ______ 235
49) گلے میں پھنسی ہڈی ______ 239

اپنی بات

میدانِ جنگ یا شورش زدہ علاقوں میں رپورٹنگ کرنا، حالات کا درست مشاہدہ کرنا اور اس کے تناظر میں تجزیہ یا تبصرہ کرنا ایک مشکل کام ہوتا ہے۔ 02-2001ء کے بعد ہم جیسے قلم کے مزدور تمام تر مشکلات کے باوجود یہی کچھ کرتے آئے ہیں، کیونکہ اس عرصہ کے دوران ہمارے خطے میں دوسری جنگ عظیم کے بعد ایک طویل ترین، بہت زیادہ پیچیدہ اور بڑی جنگ لڑی گئی۔ اس جنگ نے ڈیورنڈ لائن کے اطراف کی پشتون بیلٹ کو بالخصوص سیاسی، معاشرتی، اقتصادی اور ثقافتی سطح پر ناقابل بیان نقصان پہنچایا ہے جس سے اس خطے کے مستقبل پر سوالیہ نشان لگ گیا ہے۔ افغانستان میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی لگائی ہوئی آگ صرف وہاں تک محدود نہیں رہی بلکہ دوسرے مرحلے میں یہ آگ فاٹا، خیبر پختونخوا اور آخر میں پورے پاکستان میں پھیل گئی، جس کے باعث پاکستان اور افغانستان میدانِ جنگ بن گئے۔ اس خطے کے عوام کی زندگی امن، محبت اور معاشرتی استحکام کیلئے ترستی رہی۔ امن پسند لوگوں کو اپنے علاقوں سے بے دخل کر دیا گیا، ان کو ذبح کیا گیا یا ان پر گولیاں برسائی گئیں اور یوں معاشرے میں ظالم اور مظلوم جبکہ قاتل اور مقتول کا فرق ختم ہو کر رہ گیا۔ اس تمام تر صورتحال کے باوجود یہ تعین نہیں کیا جا سکا کہ ہمارے دوست اور دشمن کون ہیں۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ پاکستان میں ان تلخ اعداد و شمار کے باوجود کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں فورسز کے علاوہ چالیس ہزار سے زائد عام پاکستانی ہلاک ہو چکے ہیں، بہت زیادہ ابہام پایا جاتا ہے۔ 08-2007 کے بعد یہ خطہ بدترین خوف، بے چینی اور بدامنی کا شکار رہا ہے۔ اس کے باوجود دہشت گردی اور عسکریت پسندی سے ہونے والے نقصانات اور ان کے بارے میں درست معلومات کا فقدان ہے۔ پشتون صحافیوں، سیاستدانوں، ماہرین اور دانشوروں کا کردار اس عرصہ کے دوران بہت محدود رہا۔ پیچیدہ گوریلا جنگ اور اس کے اسباب، کرداروں اور مقاصد کا کبھی سنجیدگی سے نہ تو تجزیہ کیا گیا اور نہ ہی اس صورتحال سے نکلنے کے لیے مکالمے یا مشاورت جیسے عوامل پر توجہ دی گئی اور اس طرز عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم درست معلومات کی فراہمی میں

بھی ناکام رہے۔

زیرنظر کتاب ان صحافتی رپورٹوں، مضامین اور کالموں پر مشتمل ہے جو 11-2010 کے دوران مختلف اخبارات اور رسائل بالخصوص روزنامہ ''مشرق'' پشاور، ماہنامہ ''تجزیات'' اسلام آباد اور ماہنامہ ''نوٹ بک'' کراچی میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا مقصد اس عرصہ کے دوران ہونے والے واقعات کا تاریخی و تجزیاتی ریکارڈ محفوظ کرنا ہے تاکہ اس سے وہ قارئین بھی مستفید ہو سکیں جو کہ بوجوہ اس سے محروم رہے ہیں۔ اس ضمن میں طالبانائزیشن، انتہا پسندی، دہشت گردی، پاک فوج کی کارروائیوں، افغانستان اور قبائلی علاقوں کے حالات، پاک افغان تعلقات، پاک امریکہ تعلقات، القاعدہ کے کردار اور پختونخوا میں امن و امان کی صورتحال کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ 11-2010 کے اہم ملکی، علاقائی اور عالمی واقعات ایک ترتیب سے آپ کے ساتھ چلتے دکھائی دیں گے۔ تمام تر کمزوریوں اور غلطیوں کے باوجود یہ کاوش ہم سب کو ان تلخ واقعات کی یاد دلاتی رہے گی، جن کا ماضی کی غلط پالیسیوں کے باعث خطے کے عوام نے ان دو برسوں کے دوران سامنا کیا ہے۔ یہ مستقبل کی ہماری نسل کو بھی ہم پر گزرے ان سانحات کی یاد دلاتی رہے گی۔ آپ کو کئی بار تکرار اور تشنگی کا احساس بھی ہوگا، تاہم معلومات کی فراہمی اور پس منظر کے جامع بیان کے باعث آپ مایوس نہیں ہوں گے۔

مجھے اس بات کی بہت زیادہ خوشی ہورہی ہے کہ میری گزشتہ دو کتابوں ''طالبانائزیشن'' (2009) اور ''آپریشن ناتمام'' (2010) کی اشاعت کے بعد میری یہ تیسری کاوش ان صاحب الرائے لوگوں اور قارئین تک کسی وقفے کے بغیر پہنچ رہی ہے جنہوں نے مذکورہ کتابوں کی اشاعت کے بعد توقعات سے بڑھ کر میری حوصلہ افزائی کی اور دونوں کتابوں کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ میں اس کتاب کی اشاعت کو ممکن بنانے کے لیے یقینی طور پر پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز (PIPS) کے ڈائریکٹر اور اپنے بھائی محمد عامر رانا کا مشکور ہوں جنہوں نے میرے علاوہ ان لوگوں کی خواہش کو بھی عملی جامہ پہنایا، جن کا خیال تھا کہ یہ رپورٹس اور کالم کتابی صورت میں شائع ہونے چاہئیں۔ میں روزنامہ مشرق کے چیف ایڈیٹر ایاز بادشاہ کا بھی مشکور ہوں جنہوں نے اپنے اخبار اور میگزین میں روٹین کے میٹریل کے علاوہ میری بعض وہ

رپورٹس اور کالم بھی شائع کیے جن کی اشاعت کے بعد متعدد بار میرے علاوہ جناب ایاز بادشاہ کو بھی بعض طاقتور حلقوں کی جانب سے سخت ردعمل اور ناپسندیدگی کا سامنا کرنا پڑا مگر انہوں نے میری حوصلہ افزائی جاری رکھی اور مخالفانہ طرز عمل کے مقابل بہادری سے ڈٹے رہے۔ موضوعات کی نشاندہی اور معلومات کی فراہمی کے سلسلے میں جن صحافیوں، سیاسی دوستوں اور سینئرز نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی، ان کا ذکر کرنا بھی لازمی تصور کرتا ہوں۔ اس ضمن میں سلیم صافی، ایمل خٹک، حسن خان، میرویس افغان، سمیع یوسفزئی، ڈاکٹر فاروق خان مرحوم، تحسین اللہ خان، فضل رحیم مروت، ڈاکٹر خادم حسین، طاہرہ عبداللہ، مجتبیٰ راٹھور، بشیر شیرانی، عباداللہ، سلطان شاہ، واجد علی خان، لطیف آفریدی، عبدالجلیل جان، میجر محمد عام، سعداللہ جان برق، ڈاکٹر ہمایوں ہما، سلیم راز، حمید اختر، یوسف عالمگیرین، سعید علی خان اور وہ بے شمار قارئین میرے لئے انتہائی اہم رہے جنہوں نے نہ صرف یہ کہ معلومات اور موضوعات کے انتخاب میں میرا بھرپور ساتھ دیا بلکہ جب میرے قدم ڈگمگانے لگے، ان لوگوں نے قدم قدم پر مجھے گرنے، جھکنے یا ٹوٹنے سے بچایا۔ میں ''نوٹ بک'' کی چیف ایڈیٹر اور اے پی این ایس ایوارڈ یافتہ شائلہ داؤد ماتری اور اس ماہنامہ کے ایڈیٹر جاوید صدیقی کی حوصلہ افزائی کا بھی ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

آخر میں ملک کے نامور صحافی، کالم نگار اور اینکر حامد میر کا بطور خاص شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جنہوں نے میری پچھلی دو کتابوں کے دوران میری زبردست رہنمائی کی۔ اس کے ساتھ ہی وہ مجھے یہ حوصلہ بھی دیتے رہے کہ میں وارزون میں رہتے ہوئے بھی تمام تر دباؤ، خوف اور بعض عناصر کی دھمکیوں کے باوجود اپنی فہم اور بساط کے مطابق درست معلومات کی فراہمی کا اپنا محدود سلسلہ جاری رکھوں۔ اگر جناب حامد میر کی مسلسل سرپرستی، فیڈ بیک، رہنمائی اور بے پناہ محبت میری ہمسفر نہ ہوتی تو میں بھی متعدد دوسروں کی طرح اپنی دھرتی پر مسلط کی گئی اس جنگ سے لاتعلق ہو کر خاموش بیٹھ جاتا اور دوسروں کے علاوہ اپنے ضمیر کے سامنے بھی شرمندہ ہو رہا ہوتا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس تمام عرصہ کے دوران مجھے جو بھی فیڈ بیک اور محبت ملی ہے یا اگر یہ کاوش آپ کو پسند آجاتی ہے تو اس کا زیادہ کریڈٹ حامد میر، محمد عامر رانا اور سید ایاز بادشاہ ہی کو جاتا ہے۔

عقیل یوسفزئی

نہ ہی خدا ملا نہ دیدارِ صنم

پاکستان اسّی کی دہائی میں اپنے مفادات کے حصول کے لیے جس حکمتِ عملی کے تحت افغانستان میں سرگرم ہوا تھا، اس کے باعث ملک خود شدید خطرات کی لپیٹ میں آگیا ہے۔ نائن الیون کے بعد امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے پاکستان پر واضح کرنا شروع کر دیا کہ عسکریت پسند قوتوں کی مزید سرپرستی اس ملک کی سیاست، معاشرت اور سب سے بڑھ کر خارجہ تعلقات پر منفی اثرات مرتب کر سکتی ہے۔ اسّی کی دہائی میں پاکستان افغان جنگ میں کودا تھا، اس جنگ کے دوسرے اہم کھلاڑیوں میں امریکہ، یورپ، عرب دنیا اور ایران کے علاوہ اور بہت سارے سوویت یونین مخالف ممالک بھی شامل تھے، تاہم جنگ کے خاتمے کے بعد تمام ممالک میدانِ جنگ سے رُخصت ہو گئے جبکہ پاکستان اکیلا رہ گیا۔ اس دوران اس نے افغانستان میں اپنے نئے ساتھیوں کی تلاش کا کام جاری رکھا کیونکہ جن مجاہدین پر پاکستان نے سرمایہ کاری کی تھی، وہ بوجوہ پاکستان سے مایوس اور ناراض ہو کر دوسری صفوں میں کھڑے ہو گئے تھے۔ پاکستان کو خوف تھا کہ اگر بھارت نے کابل میں اپنا اثر و رسوخ بڑھایا تو اس کی مغربی سرحدیں بھی غیر محفوظ ہو جائیں گی، جس کے باعث مجاہدین پاکستان پر یہ الزام عائد کرتے رہے کہ پاکستان تعمیری کردار ادا کرنے کی بجائے اپنے مفادات کے تناظر میں مداخلت پر مبنی پالیسی آگے بڑھا رہا ہے۔ اس ایشو نے مجاہدین کو اسلام آباد سے بہت دور کر دیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فریقین کے درمیان غیر اعلانیہ کشیدگی کا نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔ امریکہ نے پاکستان کو یا پاکستان نے امریکہ کو استعمال کیا؟ اس سوال پر بہت بحث ہو چکی ہے، تاہم جو حقیقت سامنے آئی، وہ یہ ہے کہ افغان جنگ یا جہاد کا سارا فائدہ امریکی بلاک کو ہی پہنچا ہے۔ امریکہ کا مقصد ویت نام میں اپنی ناکامی کا بدلہ لینا اور سوویت یونین کو فوجی اور اقتصادی طور پر کمزور کرنا تھا اور یہ کام اس نے سعودی مجاہدین اور پاکستان کے

ذریعے پورا کرلیا تھا۔اس کے بعد افغانستان یا پاکستان میں اس کی وہ دلچسپی نہیں رہی، جو کہ پہلے تھی۔ پاکستان ہی وہ ملک تھا جس نے خارجہ تعلقات اور مفادات کے حوالے سے نقصان اٹھایا۔ وہ جہادی کمانڈر جنہیں ذوالفقار علی بھٹو، سردار داؤد خان کے خلاف منظم کرنے کے لیے پشاور لائے تھے، اب وہ دوسری صف میں کھڑے تھے اور پاکستان پر اعتماد کرنے کو تیار نہیں تھے۔ پاکستان کی حامی جماعت حزبِ اسلامی بھی پیچھے ہٹ گئی، کیونکہ پاکستان نے نئے ساتھیوں کی تلاش شروع کر دی تھی۔اس دوران پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں نے پنجابی اور کشمیری عسکریت پسند قوتوں پر توجہ دینا شروع کردی۔اس پالیسی کا مقصد کشمیر میں بھارت کو ٹف ٹائم دینا تھا۔

دوسری طرف نوے کی دہائی میں القاعدہ نامی جس منظم اور خطرناک تنظیم کا قیام عمل میں لایا گیا، اس نے عالمگیر جہادی تحریک کی صورت اختیار کرلی۔ یہ اعزاز بھی پاکستان ہی کو حاصل رہا کہ اس تنظیم کا قیام پشاور میں عمل میں لایا گیا اور اس کا باقاعدہ تنظیمی ڈھانچہ بھی یہاں پر ہی تشکیل پایا۔ پشاور کا یونیورسٹی ٹاؤن اور حیات آباد اس عرصہ کے دوران عرب جنگجوؤں کے دفاتر اور رہائش گاہوں سے بھرا پڑا تھا اور ہمارے ادارے ان کو مکمل تعاون اور پروٹوکول فراہم کرتے رہے۔ القاعدہ کو تعاون فراہم کرنے کا مقصد یہ بھی تھا کہ افغانستان اور کشمیر میں پاکستان کے مفادات کا تحفظ کیا جائے اور تمام جہادی قوتوں کو اپنے قابو میں رکھا جائے۔ عسکریت پسند تنظیمیں (پاکستانی) مقبوضہ کشمیر پر حملہ آور ہوگئیں تو بھارت اور پاکستان کے تعلقات کشیدہ ہوگئے اور تین چار بار جنگ کی صورتحال پیدا ہوئی۔ 90ء ہی کی دہائی میں بے نظیر بھٹو کے دور حکومت میں طالبان کراچی سے براستہ کوئٹہ، چمن اور قندھار کا روٹ استعمال کر کے افغانستان داخل ہوگئے اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنی پیش قدمی کے ذریعے پورے ملک کو فتح کرنا شروع کر دیا۔ نصیر اللہ بابر مرحوم، مولانا سمیع الحق اور مرحوم مفتی شامزئی ان طالبان کو اپنے بچے قرار دیتے رہے، جبکہ انہیں ہمارے خفیہ اداروں کی مکمل آشیر باد حاصل رہی۔ مجاہدین چونکہ ڈاکٹر نجیب حکومت کے خاتمے کے بعد اتفاق رائے سے کوئی اچھی حکومت قائم کرنے میں ناکام رہے تھے اور ملک جنگجوؤں کے رحم وکرم پر تھا، اس لئے طالبان کو عوام کی حمایت بھی حاصل ہونے لگی اور یوں پاکستان نے طالبان کی کامرانیوں کو اپنی کامیابی کا نام دینا شروع کر دیا۔ طالبان، افغانستان پر قابض ہونے کے بعد فلسطین اور کشمیر کی آزادی کی

بات بھی کر رہے تھے اور طالبان کی یہ پالیسی پاکستان اور سعودی عرب جیسے ممالک کے لئے بہت اہم تھی، اس لئے طالبان کی حکومت کو تسلیم کرنے والے تین ممالک میں پاکستان، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات شامل تھے۔ بعض حلقوں کے مطابق طالبان کو ابتداء میں امریکہ کی مکمل حمایت بھی حاصل تھی کیونکہ پاکستان اور سعودی عرب نے اسے یقین دہانی کرائی تھی کہ طالبان افغانستان میں امن قائم کر رہے ہیں اور یہ کہ وہ امریکہ کے خلاف کوئی منفی عزائم نہیں رکھتے۔ بے نظیر بھٹو اور نصیر اللہ بابر نے امریکہ کو یہ یقین دہانی کروانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ بعدازاں تیل کی دو بڑی کمپنیوں کے آپس کے اختلافات نے طالبان اور مغرب کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ان میں سے ایک کمپنی نے وسطی ایشیاء سے تیل اور گیس کو افغانستان اور پاکستان کے قبائلی علاقوں کے راستے عالمی منڈیوں تک پہنچانا تھا۔ ان دونوں کمپنیوں کے اختلافات نے پورے خطے کے تعلقات کو متاثر کیا۔ اس عرصہ کے دوران القاعدہ کی اعلیٰ قیادت بھی بعض مجاہد کمانڈروں کے ذریعے طالبان کے قریب آ گئی تھی۔ اسامہ بن لادن صوبہ ننگر ہار میں موجود تھے اور وہ مسلکی اختلافات کے باوجود طالبان کو مکمل عسکری اور اقتصادی تعاون فراہم کرنے میں مصروف تھے۔ سعودی عرب بھی اس تمام کھیل میں ایک اہم کھلاڑی کا کردار ادا کر رہا تھا۔ اس کی تین بنیادی وجوہات تھیں۔ ایک یہ کہ افغانستان میں ایران مخالف حکومت قائم ہو، دوسرا یہ کہ یہ افغان حکومت امریکہ اور پاکستان کے لئے بھی قابل قبول ہو، کیونکہ دونوں ممالک اتحادی تھے۔ تیسرا، افغانستان میں جو قوت برسر اقتدار آئے، وہ عربوں کی حمایتی اور پشتون ہو۔ سعودی شہزادہ ترکی الفیصل اس تمام گیم میں بہت اہم کردار کا حامل تھا۔ انہوں نے دبئی سے طالبان کے لئے سینکڑوں گاڑیوں کا ایک سکواڈ بھی بطور تحفہ بھیجا تھا۔ سعودیوں کا یہ بھی خیال تھا کہ اگر القاعدہ افغانستان میں مصروف ہو گئی تو سعودی عرب میں اس کی سرگرمیاں خود بخود ختم ہو جائیں گی۔

پاکستان نے طالبان نامی جس قوت کو سعودیہ اور امریکہ کی مدد سے میدان میں اتارا تھا، اس کے باعث مذکورہ دونوں ممالک ایک بار پھر پاکستان کو اہمیت دینے لگے، تاہم دوسری طرف ایران، روس، وسطی ایشیائی ریاستیں اور بھارت طالبان کے سخت گیر رویئے سے خوف زدہ ہونے لگے۔ طالبان نے بامیان میں بدھا کے مجسموں کی مسماری کی مہم چلائی تو چین، جاپان اور کوریا جیسے

ممالک میں بھی تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ یوں پاکستان کے حوالے سے بعض دوست ممالک کے خدشات بھی بڑھنا شروع ہو گئے۔ جنگ کے دوران پاکستان کے دیوبندی مدارس سے ہزاروں طلبا افغانستان جانا شروع ہو گئے۔ یہ طلباء چونکہ پاکستانی تھے، اس لئے ان کی آمدورفت نے پاکستان خصوصاً فاٹا، صوبہ خیبر پختونخوا اور بلوچستان کی پشتون بیلٹ میں ایک نئے فکری رجحان کی بنیاد رکھی اور ان عناصر کے باعث طالبان کو مذہبی رجحانات رکھنے والے پاکستانیوں کی حمایت حاصل ہونے لگی۔ پاکستان کی حکومت عوام کی توقعات پر پورا نہیں اتر رہی تھی، جس کے باعث پاکستان کے مذہبی لوگ طالبان کے افغانستان کی طرف دیکھنے لگے۔ اس رجحان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پاکستان کی مذہبی قوتوں نے بھی طالبان کی طرز پر تنظیم سازی کا سلسلہ شروع کر دیا اور ان کو مقبولیت بھی حاصل ہونے لگی۔ اسی طرز فکر کا نتیجہ تھا کہ مولانا فضل الرحمان کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ وہ پارلیمانی سیاست کی بجائے نظریاتی سیاست کا راستہ اپنا رہے ہیں اور یہ کہ وہ کسی الیکشن میں حصہ نہیں لیں گے۔ مالاکنڈ ڈویژن میں صوفی محمد کی قیادت میں ایسی ہی ایک پرتشدد تحریک کی ابتداء ہوگئی جبکہ فاٹا میں بھی سرگرمیاں شروع ہوگئیں۔

طالبان کی حکومت میں القاعدہ کا اثر رسوخ بڑھنا شروع ہوا تو متعدد حلقوں کو تشویش لاحق ہونا شروع ہوگئی۔ اگرچہ القاعدہ نے اپنی کارروائیوں کا مرکز افغانستان اور پاکستان کو بنایا تھا، تاہم اس کی نظریں بیت المقدس کی آزادی' اسرائیل کی شکست اور عرب ممالک کے آمر حکمرانوں کو کمزور کرنے پر لگی ہوئی تھیں۔ ایک وقت وہ آیا جب اسامہ بن لادن کی طاقت افغانستان کے سربراہ ملا عمر کے ہم پلہ ہوگئی، یعنی وہ طالبان حکومت کی فیصلہ سازی کے عمل پر بھی اثر انداز ہونے لگے۔ دوسری جانب طالبان اور ایران کے درمیان ایک مرحلے پر حالات اتنے کشیدہ ہو گئے کہ ایران کو ہرات کی سرحد پر ایک لاکھ فوج تعینات کرنا پڑی۔ اس دوران پاکستان میں جنداللہ نامی تنظیم کا قیام عمل میں لایا گیا، جس نے ایران کے خلاف کھل کر اعلان جنگ کیا اور اس پر ایران نے پاکستان سے شدید احتجاج بھی کیا۔ وسطی ایشیائی مسلم ریاستیں بھی ان تنظیموں کا ہدف بننے لگیں جو کہ ان کے بقول افغانستان میں فعال تھیں۔ یہ سلسلہ تمام تر پیچیدگیوں کے ساتھ بہت سے سوالات پیدا کرتے ہوئے آگے بڑھتا رہا کہ 2001ء کو نائن الیون کا وہ واقعہ رونما ہوا، جس نے

دنیا کی تاریخ کو ہی بدل کر رکھ دیا۔ امریکہ نے اس واقعہ کی ذمہ داری القاعدہ پر عائد کی جبکہ القاعدہ کے بعض رہنماؤں نے یہ بھی کہنا شروع کر دیا کہ یہ حملہ اس کی کارروائی ہی ہے۔ امریکہ نے طالبان سے اسامہ بن لادن کی حوالگی کا مطالبہ کیا اور اس مقصد کے لئے پاکستان اور سعودی عرب پر بھی دباؤ ڈالنا شروع کیا، کیونکہ ان ممالک کے طالبان کے ساتھ خصوصی مراسم تھے۔ یوں طالبان اور ان کے حامیوں کے لیے مشکل وقت آ گیا۔ عالمی دباؤ یکطرفہ طور پر بڑھنے لگا۔ قندھار میں طالبان اور علماء اکٹھے ہو گئے۔ انہوں نے اسامہ بن لادن کی حوالگی کے حوالے سے مثبت طرز عمل کا مظاہرہ کیا، تاہم ملا عمر سمیت متعدد نے مؤقف اختیار کیا کہ ایک تو امریکہ ثبوت فراہم نہیں کر رہا اور دوسرا یہ کہ افغان اپنی روایات کے مطابق اپنی سرزمین پر موجود کسی شخص کو دشمن کے حوالے نہیں کریں گے۔ اس لئے اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔ بعض معتبر حلقوں کا خیال تھا کہ امریکہ نے چونکہ ہر حال میں حملے کا ذہن بنایا ہوا ہے، اس لئے اسامہ بن لادن کی حوالگی کے باوجود اس بات کی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ وہ حملہ نہیں کرے گا۔

امریکہ نے اقوام متحدہ کی ایک قرارداد کے تحت نومبر 2001ء کو افغانستان پر حملہ کر دیا اور کچھ ہی عرصے میں طالبان کو اقتدار سے رخصت کر دیا۔ اس کے بعد 2004ء تک حالات اس کے قابو میں رہے، تاہم خطے میں طویل عرصے تک قیام کے منصوبے' پاکستان اور ایران پر نظر رکھنے اور دوسرے مخالف ممالک کو اپنی موجودگی کے ذریعے دباؤ سے دوچار کرنے کے اسباب کے باعث امریکہ نے اس طرح کا آپریشن نہیں کیا جس سے طالبان اور القاعدہ کی قوت ختم ہو جاتی اور متبادل سیاسی نظام قائم ہو جاتا۔ اپنے افغان اتحادیوں پر اعتماد اور انحصار کرنے کی بجائے امریکہ اپنے معاملات خود چلاتا رہا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنگ طوالت اختیار کرتی گئی۔ 07-2006ء کے بعد پاکستان بھی القاعدہ اور طالبان کے حملوں کی زد میں آنے لگا اور 2007ء میں تحریکِ طالبان پاکستان کا قیام عمل میں لایا گیا جس نے بعدازاں پاکستانی ریاست اور معاشرے کو ہلا کر رکھ دیا۔ 2001ء سے 2011ء تک افغانستان میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے نو ہزار سات سو فوجی ہلاک ہوئے تھے جبکہ 2007ء سے اب تک پاکستان میں سکیورٹی فورسز کے 800 0 اہلکاروں سمیت 40 ہزار شہری ہلاک ہو چکے ہیں۔

دو مئی 2011ء کو ایبٹ آباد میں اسامہ بن لادن کی ہلاکت اور اس کے بعد عالمی دباؤ کے نئے سلسلے نے پاکستان کو بدترین قسم کے حالات سے دوچار کیا۔ اس دوران صرف ایک ماہ کے دوران ریاستی اداروں پر چودہ حملے کئے گئے، جن میں شبقدر کا واقعہ اور سانحہ مہران بیس بھی شامل ہیں۔ اس ماہ کے دوران چھ بار ڈرون حملے بھی کئے گئے جبکہ ایبٹ آباد آپریشن کی طرح کی دوسری کارروائیاں کرنے کے امریکی اعلانات بھی جاری ہوئے۔ چار جون کو انکشاف ہوا کہ جنوبی وزیرستان میں 2 جون کو ہونے والے ڈرون حملے میں القاعدہ کی قیادت کا امیدوار اور خطرناک عسکری کمانڈر الیاس کشمیری بھی نشانہ بنا ہے۔ وزیرستان کے انچارج ابوحمزہ کے نشانہ بننے کا دعویٰ بھی سامنے آیا۔ یہ وہی الیاس کشمیری ہے جس کی تنظیم کو مہران بیس حملے کا ذمہ دار قرار دیا جا رہا ہے، جبکہ وہ پاکستان اور افغانستان میں پنجابی اور کشمیری طالبان کی قیادت بھی کرتا رہا ہے۔ اسے جس روز نشانہ بنایا گیا، اسی روز دو سے چار سو تک افغان شدت پسند اپر دیر میں فورسز (پولیس، لیویز) پر حملہ آور ہوئے، انہوں نے 40 لوگوں کو ہلاک کیا اور 39 گھنٹوں تک فورسز کے ساتھ لڑائی لڑی۔ حالات اس قدر خراب ہو گئے کہ ان پر ہیلی کاپٹرز کے ذریعے حملے کیے گئے اور علاقہ میدان جنگ بنا رہا۔ اس تمام صورتحال سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ Strategic Depth کی پاکستانی حکمتِ عملی فائدے کی بجائے نقصان دیتی آئی ہے۔ دوسرا یہ کہ کل تک جو ممالک پاکستان کے اتحادی اور دوست تھے، آج وہ سب اس کے خلاف ہو گئے ہیں۔ تیسرا یہ کہ مسلسل غلطیوں کے باعث افغانستان کی جنگ اب پاکستان میں منتقل ہو گئی ہے۔ چوتھا یہ کہ پاکستان عالمی سطح پر تنہا ہو گیا ہے اور اس پر مختلف قسم کے اندرونی و بیرونی حملے کئے جا رہے ہیں۔ پانچواں یہ کہ پاکستان کے دفاعی ادارے بدترین دباؤ اور حملوں کی زد میں ہیں اور سب سے اہم یہ ہے کہ پاکستان میں اب بھی ان عناصر کی موجودگی بارہا ثابت ہو رہی ہے جن سے نہ صرف خطے اور عالمی برادری بلکہ خود پاکستانی ریاست اور معاشرے کو بھی سنگین خطرات لاحق ہیں، جبکہ پاکستان کی سیاسی، عوامی اور ادارہ جاتی صف بندی بھی کمزور ہوئی ہے۔

گوریلا وار اور پاکستان کی عسکریت پسند تنظیمیں

اس اَمر پر طالبان کے حامیوں اور مخالفین کے علاوہ تمام حقیقت پسند تجزیہ کار متفق ہیں کہ عسکریت پسند تحریک خطے کے حالات، عالمی طاقتوں کے مقاصد اور حکومتوں کے کمزور ریاستی ڈھانچوں کے باعث طویل عرصہ تک موجود اور قائم رہے گی کیونکہ اس قسم کی تحاریک اور تنظیموں کے خاتمے کیلئے جن سنجیدہ پالیسیوں، اصلاحات اور شعوری کوششوں کی ضرورت ہوتی ہے، وہ فی الحال ہمیں پاکستان اور افغانستان کی حد تک نظر نہیں آ رہی ہیں۔ طالبان کی تحریک کو محض حکومت مخالف تحریک کا نام نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ اس کی نظریاتی مذہبی بنیادیں نہ صرف یہ کہ کافی مضبوط ہیں بلکہ اس تحریک پر بے شمار عالمی اسلامی تنظیموں اور انتہائی ذہین مذہبی سکالرز نے بہت بڑی فکری سرمایہ کاری کی ہوئی ہے۔ ان تنظیموں کے فکری اور تنظیمی ڈھانچے کا جائزہ لیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ ان کی نظریاتی وابستگی بہت مضبوط ہے۔ ان کو نہ صرف یہ کہ لاکھوں مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل ہیں بلکہ مسلمانوں کی بالادستی کو عالمی سطح پر منوانے کی ایک نظریاتی اور تنظیمی بنیاد بھی میسر ہے۔ شاید ہی دنیا میں کوئی ایسا ملک ہو جہاں پر القاعدہ اور طالبان کے حامی موجود نہ ہوں۔ طالبان طرز کی تحریکوں کے خلاف اب تک دنیا میں جتنی بھی ریاستی کارروائیاں ہوئی ہیں، ان کی حکمتِ عملی یہ رہی ہے کہ ان تحریکوں کے نظریات اور تنظیمی وابستگی کو ان کے دلائل اور طریقۂ کار کے اندر رہ کر کمزور کیا جائے، کیونکہ ان تحریکوں یا تنظیموں کے خلاف کارروائیوں سے ان کے نظریات زیادہ مؤثر اور زیادہ خطرناک رُخ اختیار کر جاتے ہیں۔

دوسرے آپشن کے طور پر ان کے خلاف ریاستی کارروائیاں مثلاً آپریشن، گرفتاریاں یا سزاؤں وغیرہ کا عمل دخل آتا ہے، جن قوموں یا حکومتوں نے ان پر تشدد تنظیموں کو لگام ڈالنے میں کامیابی حاصل کی ہے، انہوں نے دونوں ہی پہلوؤں پر کام کر کے عسکریت پسندوں کی قوت توڑنے کا راستہ اختیار کیا ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان میں پہلے آپشن پر ہنوز سیاسی، معاشرتی اور ریاستی سطح پر وہ توجہ نہیں دی گئی، جس کی اشد ضرورت تھی۔ ہمارے اداروں نے صرف فوجی کارروائیوں پر انحصار کی پالیسی کے باعث طالبان اور ایسی دوسری تنظیموں کا فکری اثر ورسوخ ختم

کرنے کی ضرورت کو بری طرح نظرانداز کر دیا ہے۔ 'گڈ' اور 'بیڈ' طالبان کی مستقل پالیسی کے باعث تمام تر قربانیوں کے باوجود فوجی کارروائیاں اتنی دیرپا، مؤثر اور کامیاب ثابت نہیں ہوسکیں جس قدر کہ انہیں ہونا چاہئے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ طالبان اور ان کی اتحادی تنظیموں کی قوت نہ صرف یہ کہ برقرار ہے، بلکہ ان کی کارروائیاں کسی خاص وقفے کے بغیر جاری بھی رہتی ہیں اور وہ ریاست اور پورے معاشرے کیلئے خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ القاعدہ کے نظریاتی اور تنظیمی ڈھانچے کے تحت فعال پاکستانی اور افغان عسکریت پسند تنظیمیں انٹیلی جنس روابط، افرادی قوت، وسائل اور بین الاقوامی جہادی نیٹ ورکس کے ساتھ وابستگی کے علاوہ نظریاتی طور پر بھی خاصی کمٹڈ کہلائی جاسکتی ہیں۔ محض یہ کہہ کر خود اور دوسروں کو مغالطے میں نہیں رکھا جاسکتا کہ یہ لوگ محض پیسے لے کر یا پیسے دے کر اتنی بڑی تحریک چلا رہے ہوں گے۔ کسی بھی گوریلا تحریک کیلئے نظریاتی اساس اور تنظیمی ڈھانچے جیسے عوامل بنیادی اہمیت رکھتے ہیں اور ان تنظیموں کے پاس یہ ''دولت'' موجود ہے۔ ہزاروں لوگ نہ صرف یہ کہ ذہنی طور پر یکسو ہو کر اس تحریک کا حصہ بنتے ہیں بلکہ ہر سال ہزاروں کی تعداد میں نئے لوگ بھی ان کے فلسفۂ جہاد سے متاثر ہو کر کسی رکاوٹ کے بغیر ان کی تعداد اور قوت میں اضافے کا سبب بن رہے ہیں۔ اب تک جتنی بھی گوریلا جنگیں لڑی گئی ہیں، ان کے بنیادی ڈھانچے، تنظیمی طریقۂ کار اور طریقہ جنگ میں کوئی بنیادی فرق نظر نہیں آیا۔ ایسی تمام تنظیموں کو ہم خیال غیر مقامی قوتوں کی سیاسی، تنظیمی اور کسی حد تک ریاستی تعاون جیسی سہولتیں میسر رہتی ہیں۔ ان کے اندر تنظیمی اختلافات نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں اور ان کا کمانڈ اینڈ کنٹرول سسٹم بہت مضبوط ہوتا ہے۔ ان کو مقامی آبادی کی حمایت بھی بوجوہ میسر ہوتی ہے۔ اگر کہیں میسر نہیں ہوتی تو یہ تشدد کے ذریعے مقامی آبادی کو اپنا ہم نوا بنالیتی ہیں۔ اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں، کچھ عرصہ قبل جب پاکستانی ریاست نے وزیرستان میں بیت اللہ محسود گروپ کے خلاف دوسرے گروپوں کو مزاحمت پر تیار کرنے کی پالیسی اختیار کی تو بالادست تنظیم یعنی تحریکِ طالبان پاکستان نے منحرف ہونے والے کمانڈروں کو ہلاک کرنے میں کوئی دیر نہیں لگائی جبکہ ان کے حامیوں پر بھی زمین تنگ کر دی گئی۔ اسی طرح جب بیت اللہ محسود کی موت واقع ہوگئی تو روایتی تجزیہ کاروں کا یہ خیال تھا کہ اس کے بعد نہ صرف یہ کہ ٹی ٹی پی کمزور ہو جائے گی بلکہ مختلف لیڈر یا کمانڈر آپس میں

بھی لڑ پڑیں گے، تاہم سب نے دیکھ لیا کہ نہ تو ٹی ٹی پی عملاً تقسیم ہوئی اور نہ ہی کمانڈروں میں قیادت کے معاملے پر کوئی بڑا اختلاف پیدا ہوا۔

گوریلا تنظیموں میں انٹیلی جنس کا نظام بہت فعال، خفیہ اور مربوط ہوتا ہے۔ ٹی ٹی پی کی کارکردگی بھی اس سلسلے میں انتہائی کامیاب رہی ہے۔ سی آئی اے، آئی ایس آئی اور دوسرے متعلقہ ادارے جدید ترین نیٹ ورک اور سہولیات کے باوجود افغانی اور پاکستانی طالبان کے فیصلوں، اقدامات، تیکنیک اور کارروائیوں کا درست اور بروقت سراغ لگانے میں بری طرح ناکام رہے ہیں اور اب بھی ان کی انسدادِ دہشت گردی کی پالیسی کو تسلی بخش یا مؤثر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ تمام گوریلا تنظیمیں لٹریچر، میڈیا اور ابلاغ کے دوسرے ذرائع کو انتہائی اہمیت دیتی ہیں، کیونکہ ان ذرائع کے ذریعے وہ عوام تک اپنا پیغام پہنچانے کے علاوہ مخالفین کو ڈرانے اور دھمکانے کا کام بھی کرتی ہیں۔ ہم جب پاکستانی عسکریت پسند تنظیموں کا جائزہ لیتے ہیں تو ثابت ہوتا ہے کہ یہ بھی ابلاغ کے ان ذرائع کو انتہائی اہمیت دیتی آئی ہیں۔ حال ہی میں القاعدہ کے اہم ترین رہنما ڈاکٹر ایمن الظواہری نے اپنے ایک پیغام میں کہا کہ یہ ذرائع ان کی تحریک کو آگے بڑھانے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ عسکریت پسند تنظیموں کو ہم خیال سیاسی اور مذہبی قوتوں اور حلقوں کی آشیر باد بھی حاصل رہتی ہے۔ اگر ہم پاکستانی طالبان کا جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ متعدد وہ پارٹیاں بھی طالبان کی بوجوہ حمایت کرتی دکھائی دیں گی جو کہ پارلیمان اور حکومت کا حصہ ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اکثر گوریلا تنظیمیں ماضی میں ایسی ہی سیاسی یا مذہبی قوتوں کی اتحادی یا ہم خیال رہی ہوتی ہیں، مثال کے طور پر اس وقت پشتون اور پنجابی طالبان تنظیموں کے جتنے بھی بڑے کمانڈر ہیں، ان میں سے تقریباً 80 فیصد ماضی میں پاکستان کی ان مذہبی اور جہادی پارٹیوں یا تنظیموں کے ساتھ وابستہ رہے ہیں جو کہ اسلام اور جہاد کے نام پر سیاست کرتی آئی ہیں اور اب بھی کر رہی ہیں۔ جماعت اسلامی، جے یو آئی، جے یو پی اور متعدد کشمیری گروہوں کی قیادت کو یہ اعزاز حاصل رہا ہے کہ انہوں نے موجودہ کمانڈروں کو ابتدائی تعلیم اور تربیت دیکر ان کو پرتشدد جدوجہد کی راہ دکھائی۔ ان جماعتوں کے ارکان پر جب یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ ان کے سیاسی یا مذہبی رہنما عملاً وہ کچھ نہیں کر رہے جو کہ وہ کہتے ہیں تو وہ ان سے باغی ہو جاتے ہیں اور وہ

اپنے دوسرے ہم خیال ساتھیوں کے ساتھ مل کر ان گروہوں کا حصہ بن جاتے ہیں جو کہ ان کے خیال میں عملاً زیادہ کمٹڈ ہوتے ہیں۔ ان گوریلا تنظیموں میں یہ قدر بھی مشترک ہوتی ہے کہ اکثر مواقع پر یہ اپنے ان حامیوں کے بھی خلاف ہو جاتی ہیں، جنہوں نے ان کی معاونت کی ہوتی ہے۔ اس ضمن میں ہم پاکستان کی بعض مذہبی تنظیموں اور آئی ایس آئی جیسے ریاستی اداروں کی مثال دے سکتے ہیں۔ آج طالبان کے بیشتر لیڈر اور کمانڈر نہ صرف یہ کہ ان کے خلاف ہیں بلکہ وہ موقع ملنے پر اپنے ان سابقہ اتحادیوں پر حملہ کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

ان گوریلا جنگجو تنظیموں کے لیے خود کو پوشیدہ رکھنے کے لیے درست مقام کا انتخاب بہت اہم ہوتا ہے، عموماً یہ ایسے علاقوں کا انتخاب کرتے ہیں جو ریاستی اداروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ افغانستان میں سوویت یونین اور امریکہ کے خلاف مجاہدین اور طالبان کی لڑی گئی جنگوں کے دوران عسکریت پسندوں کی کامیابی کا ایک نمایاں ترین سبب مناسب علاقوں کا انتخاب ہی رہا ہے۔ اگر سوویت یونین اور امریکہ کو بدترین مزاحمت اور حملوں کا سامنا کرنا پڑا ہے تو اس میں ان عسکریت پسندوں کی بہادری یا منصوبہ بندی کے بجائے ان کے خفیہ ٹھکانوں کا کردار نمایاں رہا ہے۔ عسکریت پسند تنظیموں نے سری لنکا، ویت نام، کشمیر، یمن اور اب پاکستان میں اسی پالیسی پر عمل کیا ہے۔ اگر عراق میں بھی جنگجوؤں کو محفوظ ٹھکانے میسر آ جاتے تو شاید امریکہ کو افغانستان کی طرح ہی عراق میں بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ کچھ ایسی ہی مشکلات پاکستانی فورسز کو سوات، وزیرستان اور باجوڑ میں بھی درپیش رہی۔

گوریلا تنظیمیں کمزور ریاستی ڈھانچے اور بدحال معاشی صورتحال سے بھی بھرپور فائدہ اٹھاتی ہیں۔ ان کی جڑیں نسبتاً فعال ریاستوں اور خوشحال معاشروں میں بہت کمزور ہوتی ہیں۔ یہ ان علاقوں کا انتخاب کرتی ہیں جہاں کے باشندے ریاست سے ناراض ہوں اور معاشی مشکلات میں جکڑے ہوئے ہوں۔ پشتون بیلٹ میں چونکہ عوام معاشی بدحالی کا شکار ہیں اور ریاست سے نالاں بھی ہیں، اس لئے القاعدہ سمیت دوسری طالبان تنظیموں نے اپنے قیام اور سرگرمیوں کیلئے ان علاقوں کا ہی انتخاب کیا۔ ایسی تنظیمیں ابتداء میں عوام میں گھل مل کر اور ان کے ساتھ مراسم بڑھا کر اپنے لئے ہمدردی پیدا کرتی ہیں، جبکہ مخالفین کو راستے سے ہٹانا اور معاشرے میں بدترین خوف

پیدا کرنا ان کا وہ ہتھیار ہے جو کہ یہ لوگ معاشرے کو تشویش اور ناامیدی کی صورتحال سے دوچار کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ وہ ممالک جہاں ایسی تحاریک یا تنظیموں پر قابو پا لیا گیا ہے، وہاں کی ریاست اور معاشرے نے محض فوجی کارروائیوں پر انحصار کرنے کا راستہ نہیں اپنایا بلکہ انہوں نے نظریاتی اور فکری سطح پر ان کا طرز عمل تبدیل کرنے اور ان کا عوامی اثر ورسوخ کم کرنے جیسے عوامل پر زیادہ توجہ دی ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان میں اس جانب تا حال کوئی توجہ نہیں دی جاسکی اور اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ پاکستان میں پرتشدد عسکریت پسند تنظیموں کی موجودگی اور سرگرمیوں نے ملک کے مستقبل پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے اور فی الحال ان کے تدارک کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا۔

زمینی حقائق کا ایک خاکہ

معتبر ادارے پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز (PIPS) نے حسب روایت سال 2010ء کے دوران بھی پاکستان بھر میں ہونے والے تشدد، خود کش حملوں، بم دھماکوں، ٹارگٹ کلنگ اور فرقہ ورانہ فسادات کے واقعات پر مبنی جو سکیورٹی رپورٹ شائع کی ہے، اس کے اعداد و شمار سے ثابت ہوتا ہے کہ ریاستی ادارے سال 2010ء کے دوران اپنے فوجی اور سیاسی اقدامات اور کارروائیوں کی کامیابی کے بارے میں اب تک جتنے بھی دعوے کرتے آئے ہیں، وہ اپنے نتائج کے حوالے سے زیادہ درست ثابت نہیں ہوئے۔ PIPS کے اعداد و شمار، دہشت گردی کے تواتر کے ساتھ ہونے والے واقعات اور دوسرے حقائق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سال 2010ء کے دوران پاکستان کے تمام بڑے شہروں اور فاٹا میں جاری تشدد، انتہا پسندی، حملوں اور دھماکوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ رپورٹ کے مطابق اس برس پاکستان میں انتہا پسندوں، فرقہ پرستوں اور دوسری تشدد پسند قوتوں کی جانب سے 2113 حملے کئے گئے، جن میں 2913 افراد زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے جبکہ 5824 زخمی ہوئے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس برس حملوں کی تعداد کے لحاظ سے فاٹا یا خیبر پختونخوا کی بجائے شورش زدہ بلوچستان سرفہرست رہا، جہاں پر 737 حملے کئے گئے۔ دوسرے نمبر پر فاٹا رہا جہاں 720 جبکہ تیسرے نمبر پر صوبہ خیبر پختونخوا رہا، جہاں 459 حملے کئے گئے۔ ان تین علاقوں میں ان حملوں کے نتیجے میں جتنی اموات ہوئیں، ان کی تفصیل کچھ یوں ہے؛ بلوچستان میں 836 افراد جاں بحق اور 1132 زخمی ہوئے۔ فاٹا میں 904 افراد زندگی کی بازی ہار گئے اور 1433 زخمی (یعنی اموات کی شرح فاٹا میں زیادہ رہی) ہوئے۔ خیبر پختونخوا میں 836 افراد ہلاک جبکہ 1850 زخمی ہوئے۔ پنجاب میں 309 افراد جاں بحق اور 897 زخمی ہوئے جبکہ صوبہ میں کل 62 حملے کئے گئے۔ صرف کراچی میں 93 حملے کئے گئے جن میں 233 افراد ہلاک اور 897 زخمی ہوئے (ان میں ٹارگٹ کلنگ کے واقعات شامل نہیں ہیں)۔ سندھ کے دیگر علاقوں میں اٹھارہ حملوں میں متعدد افراد جاں بحق اور زخمی ہوئے۔ اس طرح گلگت بلتستان میں تیرہ، آزاد کشمیر میں پانچ جبکہ اسلام آباد میں دہشت گردی کی چھ کارروائیاں ہوئیں۔ رپورٹ میں اس بات

کی نشاندہی بھی کی گئی ہے کہ سال 2009ء کے مقابلے میں فاٹا اور خیبر پختونخوا میں حملوں کی تعداد کم ہوئی، تاہم اس کمی کی شرح دس فیصد سے زیادہ نہیں رہی۔

یہ اعداد وشمار خاصے تشویش ناک ہیں۔خودکش حملوں کے بارے میں اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ان میں 22 فیصد کمی واقع ہوئی ہے جبکہ اس کے مقابلے میں فاٹا میں ڈرون حملوں کی شرح میں گزشتہ برس کے مقابلے میں 165 فیصد اضافہ ہوا ہے۔اپنی نوعیت کے اعتبار سے دہشت گردی کے واقعات کی فہرست کچھ یوں مرتب کی جاسکتی ہے؛ دہشت گرد حملوں میں 2913 جاں بحق ہوئے ،حملہ آوروں اور سکیورٹی فورسز کے درمیان جھڑپوں میں ہلاکتوں کی تعداد 2007 رہی۔سکیورٹی فورسز کی کارروائیوں میں 2631 ہلاکتیں ہوئیں۔ڈرون حملوں میں ہلاکتوں کی تعداد 961 رپورٹ کی گئی۔سرحدی تصادم کے واقعات میں مرنے والوں کی تعداد 65 رہی جبکہ سیاسی ولسانی تشدد کے واقعات میں 660 افراد جاں بحق اور 966 زخمی ہوئے۔مختلف قبائل یا گروہوں کے درمیان ہونے والے تصادم میں ہلاکتوں کی تعداد 766 بتائی گئی ہے۔اگر ہم حملوں کی نوعیت کی اس تقسیم کا جائزہ لیں تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پاکستان کی سکیورٹی، معاشرتی اور معاشی نظام کو جن عوامل سے خطرات لاحق ہیں، ان میں انتہا پسندی' فرقہ واریت' ڈرون حملے اور نسلی فسادات سرفہرست ہیں۔

افسوسناک امر یہ ہے کہ اس برس بھی کیے گئے حملوں اور کشیدگی کے دوران عام لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو نشانہ بنایا گیا، ان کی ہلاکتوں کی تعداد 3570 بتائی گئی ہے جو کہ خاصی تشویش ناک ہے۔2010ء کے دوران خیبر پختونخوا کے تقریباً ہر ضلع یا شہر پر حملے کیے گئے۔اس کی تفصیل میں جائے بغیر، اگر صرف اسی پر اکتفا کیا جائے کہ 2010ء کے دوران صرف صوبائی دارالحکومت پشاور میں 111 حملے ہوئے تو اس سے یہ اندازہ لگانا آسان ہو جائے گا کہ تمام تر حکومتی دعوؤں کے برعکس حالات کس قدر خراب رہے ہیں۔اس ضمن میں سوات کی مثال بھی دی جاسکتی ہے جہاں دہشت گردی کی 39 کارروائیاں ہوئیں، جبکہ کوہاٹ میں 71 اور ڈی آئی خان میں 24 دہشت گرد حملے ہوئے۔

2010ء کے دوران فاٹا میں کیے گئے حملوں کی تفصیل بھی خاصی تشویشناک ہے۔اس

رپورٹ کے مطابق اس برس فاٹا کی ساتوں ایجنسیوں میں دہشت گردی کی کارروائیاں ہوئیں، مجموعی طور پر فاٹا کو 720 بار نشانہ بنایا گیا۔ اس حوالے سے مہمند ایجنسی دہشت گردی کے 219 واقعات کے ساتھ سرفہرست رہی، جبکہ خیبر ایجنسی 158 حملوں کے ساتھ دوسرے اور باجوڑ ایجنسی 103 حملوں کے ساتھ تیسرے نمبر پر رہی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ 2010ء کا سال ان تینوں ایجنسیوں کے لیے خاصا مشکل تھا اور یہ کہ وزیرستان کی دونوں ایجنسیوں کے بجائے ان تین ایجنسیوں کو بار بار نشانہ بنایا گیا۔ رپورٹ میں سکیورٹی فورسز کے جانی نقصان کے حوالے سے بھی فہرست شامل کی گئی تھی۔ اس فہرست میں فرنٹیئر کور سرفہرست ہے جس کے 223 جوان جاں بحق جبکہ 434 زخمی ہوئے۔ پولیس فورس کے 183 اہلکار جاں بحق ہوئے جبکہ ہلاک ہونے والے فوجی اہلکاروں کی تعداد بھی اتنی ہی تھی، دیگر پیرا ملٹری فورسز کے اہلکاروں کی ہلاکتوں کی تعداد 50 بتائی گئی ہے۔

سیاسی تشدد کے حوالے سے صوبہ سندھ 205 حملوں اور 636 ہلاکتوں کے ساتھ سرفہرست رہا۔ ملک بھر میں صرف خودکش حملوں میں ہلاک ہونے والے افراد کی تعداد 1187 بتائی گئی ہے جو کہ خاصی تشویشناک ہے۔ یہ اَمر بھی قابلِ غور ہے کہ سال 2010ء میں فرقہ وارانہ تشدد کے واقعات میں اضافہ ہوا۔ رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ 2010ء میں نیٹو کی سپلائی لائنوں پر 146 حملے کیے گئے۔ ان حملوں میں بلوچستان 102 حملوں کے ساتھ سرِفہرست، فاٹا 24 کے ساتھ دوسرے اور خیبر پختونخوا 12 حملوں کے ساتھ تیسرے نمبر پر رہا۔

2010ء کے دوران ہونے والے سرحدی تصادم کے واقعات میں سے 24 پاک افغان سرحد پر جبکہ 39 پاک بھارت سرحد پر ہوئے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ پاکستان کو نہ صرف اندرونی بلکہ بیرونی محاذوں پر بھی تشویشناک صورتحال کا سامنا رہا۔ رپورٹ میں ڈرون حملوں کی تعداد اور ان علاقوں کی فہرست بھی شامل کی گئی ہے، جہاں یہ ڈرون حملے ہوئے۔ اعداد و شمار کے مطابق 2010ء کے دوران شمالی وزیرستان میں سب سے زیادہ 118 ڈرون حملے ہوئے، جن میں 806 افراد جاں بحق جبکہ 326 زخمی ہوئے۔ جنوبی وزیرستان 10 حملوں اور 100 ہلاکتوں کے ساتھ دوسرے، جبکہ خیبر ایجنسی پانچ حملوں اور 52 ہلاکتوں کے ساتھ تیسرے نمبر پر

رہی۔ ہلاکتوں کی مجموعی تعداد 961 تھی، جبکہ زخمیوں کی تعداد 383 بتائی گئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہلاکتوں کی تعداد زخمیوں سے زیادہ تھی۔

رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ 2010ء کے دوران ملک بھر سے 10161 مطلوب اور مشکوک افراد کو گرفتار کیا گیا۔ مختلف تنظیموں سے وابستگی کے اعتبار سے یہ فہرست کچھ یوں بنتی ہے؛ تحریکِ طالبان پاکستان سے تعلق رکھنے والے 8863 شدت پسند گرفتار کیے گئے۔ القاعدہ کے 50 ارکان گرفتار کئے گئے، جبکہ 288 افغان طالبان بھی گرفتار ہوئے جبکہ جنداللہ، لشکر جھنگوی اور سپاہ صحابہ پاکستان کے 200 سے زائد کارکن گرفتار ہوئے۔ القاعدہ کے گرفتار ہونے والے اہم کمانڈروں میں اعظم یحیٰ' عمر المصر ی' ابوریان الزرقاوی' ابوموسیٰ' یحیٰ مجادن' عبدالوہاب' شیرین آغا' محمد ابراہیم جلالی اور روح اللہ ازبک بھی شامل ہیں۔

2010ء کے دوران کراچی کی صورتحال کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے، وہ بہت تشویشناک صورتحال کی نشاندہی کر رہا ہے۔ رپورٹ کے مطابق کراچی میں اغواء کے 693 واقعات ہوئے، یہ تعداد 2009ء کے مقابلے میں 206 فیصد زیادہ ہے۔ قتل کے واقعات میں بھی 116 فیصد اضافہ ہوا۔ اس برس 668 افراد کو قتل کیا گیا۔ دونوں برسوں کے تقابلی جائزے سے ثابت ہوتا ہے کہ کراچی میں اَمن وامان کی صورتِ حال گزشتہ برس کی نسبت مزید خراب ہوئی ہے۔ اگر حقائق' ترتیب وار واقعات اور ٹھوس اعداد وشمار پر مبنی اس سکیورٹی رپورٹ کے ان چیدہ چیدہ نکات اور انکشافات کا بغور جائزہ لیا جائے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سال 2010ء کے دوران نہ صرف پاکستان ہر قسم کے حملوں کی زد میں رہا بلکہ یہ انسدادِ دہشت گردی اور فوجی کارروائیوں کے باوجود حملوں کی نوعیت' مختلف صوبوں تک ان کے پھیلاؤ اور مختلف حلقوں کو نشانہ بنائے جانے کے واقعات کے تناظر میں بھی بدترین صورتحال کا شکار رہا۔ اس ضمن میں اس اَمر کی نشاندہی بھی ضروری ہے کہ اگر اس برس حملوں کی شدت' تعداد اور ہلاکتوں کی شرح میں کمی بھی واقع ہوئی ہے تو وہ بہت کم ہے۔ یہ بھی ثابت ہو گیا ہے کہ پاکستان کو صرف انتہا پسندوں سے خطرات لاحق نہیں ہیں بلکہ متعدد گروہ اور قوتیں بھی ریاست اور معاشرہ کے خلاف برسر پیکار ہیں، جن کے خلاف کارروائی کرنے یا ان کا سنجیدگی سے نوٹس لینے کی ضرورت سے مکمل طور پر صرفِ نظر کیا جاتا رہا

ہے۔ اس ضمن میں پنجاب میں فرقہ واریت' فاٹا میں ڈرون حملے' بلوچستان میں بڑے پیمانے پر دہشت گردی کی کارروائیاں اور کراچی میں لسانی فسادات کے علاوہ ان متعدد تنظیموں کی مثال بھی پیش کی جاسکتی ہے جو تشدد پر عمل پیرا ہو کر ریاست کی سکیورٹی کو بار بار چیلنج کرتی رہی ہیں اور ریاست ان کے پھیلاؤ کے خطرناک سلسلے کو کم یا ختم کرنے میں اس کے باوجود ناکام رہی کہ سال بھر فورسز' پولیس اور انٹیلی جنس اداروں کی کارروائیوں کا سلسلہ بغیر کسی تعطل کے جاری رہا۔ جامع' ناقابل تردید اور انتہائی ذمہ داری کے ساتھ مرتب کی گئی مذکورہ رپورٹ میں بعض ان اسباب کی نشاندہی بھی کی گئی ہے جن کے باعث اس تمام عرصہ کے دوران یہ ملک عدم استحکام' تشدد اور بے یقینی کی مسلسل بڑھتی ہوئی صورتحال کا شکار رہا۔ زمینی حقائق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حالات بدتر سے بدتر ہوئے ہیں اور سال 2010ء کے دوران رونما ہونے والے واقعات' حملوں اور دوسرے خطرات سے مایوس کن مستقبل کا خاکہ بنانا کوئی مشکل کام نہیں رہتا۔

دوراہے پر کھڑے پاکستان کا مستقبل

2 مئی کے بعد پاکستانی ریاست اور یہاں کے عوام کو جس ذہنی اذیت' عدم تحفظ' مایوسی اور بداعتمادی کی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا ہے، اس کے اثرات ملک کی سلامتی' خودمختاری اور مستقبل کے لئے انتہائی اہم سمجھے جا رہے ہیں۔ بعض حلقے اس واقعہ کو سقوط ڈھاکہ کے بعد ملکی تاریخ کا سب سے بڑا سانحہ قرار دے رہے ہیں، جبکہ بعض کا خیال ہے کہ پاکستان اندرونی اور بیرونی دباؤ اور بداعتمادی کے باعث بند گلی میں محصور ہو کر رہ گیا ہے۔ پاکستان اپنی خارجہ پالیسی اور عالمی تعلقات کے حوالے سے بدترین ناکامی کا شکار ہوا ہے اور اسی وجہ سے ارباب اختیار کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ ان حالات سے کیسے نکلا جائے اور صورتحال کو معمول پر لایا جائے۔ پاکستان کو 2 مئی 2011ء کے بعد تین قسم کی مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلی مزاحمت امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی طرف سے سامنے آئی، جن کا کہنا تھا کہ پاکستان القاعدہ اور طالبان کے حوالے سے عالمی برادری کے ساتھ ڈبل گیم کھیلتا آیا ہے، اس کے باوجود کہ اسے ہر برس اربوں ڈالرز کی فوجی اور اقتصادی امداد دی جا رہی ہے۔ یہ الزام پریشان کن تھا کہ آئی ایس آئی کے بعض حلقے اسامہ بن لادن کو پناہ دیئے ہوئے تھے اور وہ اس مطلوب شخص کو سونے کی چڑیا سمجھ کر امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو دھوکہ دے کر مال بٹورنے کا ذریعہ سمجھ بیٹھے تھے۔ یہ الزام بھی انتہائی سنگین ہے کہ اگر آئی ایس آئی یا پاکستانی ریاست کو ایبٹ آباد آپریشن کے بارے میں کہا جاتا تو وہ اسامہ بن لادن کو بچانے کی کوشش کرتے اور یوں آپریشن ناکام ہو جاتا۔

پاکستان کو 2 مئی کے بعد صرف امریکہ کی مزاحمت اور سوالات کا ہی کا سامنا نہیں کرنا پڑا، بلکہ 50 سے زائد ممالک بھی سوال اٹھاتے نظر آ رہے ہیں، جنہوں نے اقوام متحدہ کی 2001ء کی اس قرارداد میں مرکزی کردار ادا کیا تھا جس کی رو سے اتحادی فورسز نے افغانستان سے شدت پسندوں کا خاتمہ کرنا تھا۔ حسب معمول اس نازک موقع پر چین کے ایک محتاط بیان کے علاوہ کسی اور دوست ملک نے ہماری اخلاقی مدد بھی نہیں کی کیونکہ اسامہ بن لادن کی ہلاکت اور پاکستان میں موجودگی کا مسئلہ اتنا اہم اور گمبھیر تھا کہ کسی کو ہمارے حق میں آواز اٹھانے کی ہمت نہیں ہو سکی۔ اگر

حقیقت پسندی سے کام لیا جائے تو پاکستان اپنی تاریخ میں کبھی ایسی تنہائی کا شکار نہیں رہا۔ آئی ایس آئی کو جس طریقے سے آڑے ہاتھوں لیا گیا، اس کی مثال بھی نہیں ملتی ۔ آئی ایس آئی پر نہ صرف یہ کہ عالمی برادری نے سوالات اٹھائے بلکہ پاکستان کے مختلف حلقوں اور عوام نے بھی پہلی بار بیک آواز ہو کر اس کی پالیسی اور کارکردگی کو کھل کر تنقید کا نشانہ بنایا۔ بھارت اور افغانستان جیسے ممالک اس واقعے سے فائدہ اٹھا کر باقاعدہ مہم جوئی پر اتر آئے جبکہ عالمی میڈیا نے تو آسمان ہی سر پر اٹھا دیا۔ امریکی کانگرس میں پاکستان کی امداد بند کرنے کا بل جمع کروایا گیا جبکہ پاکستانی حکمرانوں، عسکری اداروں اور میڈیا نے متضاد الخیال مؤقف اختیار کر کے صورتحال کو اور بھی مشکوک اور پیچیدہ بنا دیا۔

امریکی صدر اوباما نے 6 مئی کو اپنی تقریر میں کھل کر کہا کہ القاعدہ کے خاتمے اور شدت پسندوں کی مکمل بیخ کنی تک ان کی جنگ جاری رہے گی ۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ افغانستان کو شدت پسندوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جائے گا، جس شام وہ اپنے کمانڈرز سے یہ خطاب کر رہے تھے، اس سے چند لمحے قبل امریکہ نے یہ انکشاف بھی کر ڈالا کہ ایبٹ آباد سے قبل اسامہ ہری پور میں رہائش پذیر تھے جبکہ اس پر بھی سب کا اتفاق تھا کہ شواہد کی روشنی میں موصوف کم از کم پانچ سال سے پاکستان میں تھے ۔ اسی روز امریکہ نے شمالی وزیرستان پر ایک اور ڈرون حملہ کر کے 14 افراد کو ہلاک کر دیا۔ یہ اس جانب واضح اشارہ تھا کہ عسکری قیادت اور بعض سیاسی قوتوں کی مزاحمت کے باوجود ڈرون حملے جاری رکھے جائیں گے اور یہ کہ امریکہ کو پاکستان کے احتجاج کی کوئی پرواہ نہیں ہے ۔ اوبامہ کی تقریر سے واضح ہو گیا کہ امریکہ شدت پسندوں کے ساتھ کسی قسم کی رعایت کا ارادہ نہیں رکھتا ۔ اسی روز القاعدہ کی آفیشل ویب سائٹ نے اسامہ بن لادن کی موت کی تصدیق کی اور ساتھ یہ بھی اعلان کیا کہ امریکہ کے ساتھ پاکستان میں بھی دہشت گردی کی کارروائیاں کر کے اسامہ کی موت کا بدلہ لیا جائے گا۔ اسی روز کوئٹہ میں بم دھماکے میں پانچ اور کراچی میں ہونے والی دہشت گردی کی کارروائی میں چار افراد ہلاک ہو گئے ۔ اس سے قبل 2 مئی کے روز چارسدہ میں دھماکہ ہوا تھا، جس میں چھ افراد جاں بحق ہوئے تھے ۔ اگر ہم چھ مئی ہی کا تجزیہ کریں تو ثابت ہوتا ہے کہ پاکستان کو امریکہ نے ڈرون جبکہ شدت پسندوں نے بم حملوں کا نشانہ بنایا۔ اس کا مطلب

یہ ہے کہ پاکستان سے نہ امریکہ مطمئن ہے اور نہ ہی وہ طالبان یا شدت پسند جنہیں پاکستان کے بعض عسکری اور جہادی حلقے پاکستان کا اثاثہ قرار دیا کرتے تھے۔

دوسری طرف عوام کی مایوسی بھی عروج پر رہی۔ عوام کھلے عام سوال کرتے رہے کہ اگر ریاست امریکہ اور طالبان دونوں کو جواب نہیں دے سکتی اور حکمران عوام کو سچ یا اپنی پالیسی کے حوالے سے اعتماد میں لینے سے گریزاں ہیں تو ریاست اور دفاعی اداروں کا فائدہ ہی کیا ہے، یعنی ریاست کو بیک وقت تین چار اطراف سے مزاحمت اور ناراضگی کا سامنا ہے۔ ایک کمزور ملک اس مزاحمت اور دباؤ سے کیسے نکل سکتا ہے، اس کا جواب فی الحال کسی کے پاس نہیں ہے۔ عوام کا مورال ناامیدی کی جس سطح پر دیکھا گیا، وہ انتہائی مایوس کن حالات کی عکاسی کرتا ہے۔ امریکی سینیٹرز نے ایک اہم اجلاس کے دوران اس قدر سنگین حالات میں وزیراعظم گیلانی کے دورہ فرانس پر انتہائی حیرت کا اظہار کیا، جبکہ ایک دوسرے سینیٹر نے صدر کی واشنگٹن پوسٹ میں شائع ہونے والی تقریر پر بھی طنز کیا۔ ایک اور سینیٹر کا کہنا تھا کہ اگر آئی ایس آئی بن لادن کی پاکستان میں موجودگی سے آگاہ تھی اور اس نے ہمیں خبر نہیں کی یا اس کے خلاف کارروائی سے گریز کی پالیسی اپنائی تو پاکستان کی امداد فوری طور پر بند کی جائے۔

ان حالات میں پاکستان کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا اور شاید اسی دباؤ کا نتیجہ تھا کہ چھ مئی ہی کو آئی ایس آئی کے سربراہ امریکہ کے ہنگامی دورے پر چلے گئے۔ دوسری طرف اسی روز یہ خبر بھی آئی کہ امریکہ میں پاکستان کے سفیر حسین حقانی نفسیاتی دباؤ کے باعث ہسپتال میں داخل ہیں۔ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ہماری ریاست دم توڑ رہی ہو اور ارباب اختیار کو حالات کی سنگینی کا کوئی احساس ہی نہ ہو۔ قومی سیاسی قیادت تو کئی روز گزرنے کے باوجود سکتے کے عالم سے باہر نہیں نکلی بلکہ عملاً غائب رہی۔ بعض حلقوں نے القاعدہ کی طرف سے پاکستان سے انتقام لینے کے اعلان پر بھی انتہائی تشویش کا اظہار کیا کیونکہ سب کو ہی علم ہے کہ پاکستان میں القاعدہ اور اس کے فکری اتحادی کس قدر مضبوط ہیں۔ ہر جگہ یہی سوال پوچھا جاتا ہے کہ پاکستان کے لئے بیک وقت امریکہ اور القاعدہ سے نمٹنا کیونکر ممکن ہوگا۔ اسی روز یہ بھی پتہ چلا کہ سی آئی اے نے ایبٹ آباد میں باقاعدہ اڈہ قائم کر رکھا تھا اور ہماری انٹیلی جنس ایجنسیاں اسامہ بن لادن کی طرح اس ٹھکانے سے بھی بے خبر

رہیں۔ خفیہ اداروں کی مسلسل ناکامیوں پر کھلے عام بحث اور تنقید کا آغاز ہو گیا، جبکہ ان کے دفاع کے لئے کوئی سامنے نہیں آیا یا اگر کچھ لوگ سامنے آئے بھی تو وہ ان کا دفاع کرنے کی صلاحیت اور دلائل سے محروم تھے۔

القاعدہ سے مبینہ ہمدردی اور گڈ اور بیڈ طالبان کے مبہم فارمولے نے ہماری توقعات کے برعکس ہمیں عملاً دیوار سے لگا دیا۔ یقیناً اس میں مبالغہ نہیں کہ ہم بے رحم مخالفین کے درمیان پھنس کر رہ گئے ہیں۔ اس تشویشناک صورتحال کے باعث یہ سوال ابھر کر سامنے آیا ہے کہ اب کیا ہوگا؟ امریکہ اور پاکستان اور پاکستان اور القاعدہ کے درمیان مستقبل میں تعلقات کار کی نوعیت کیا ہو گی۔ دفاعی اور سیاسی ماہرین کے مطابق پاکستان کو امریکہ اور القاعدہ میں سے کسی ایک کے ساتھ سنجیدہ تعلقات قائم کرنا ہوں گے، کیونکہ دونوں متحارب قوتوں کے ساتھ بیک وقت تعلق رکھنا اس کے لئے اب ممکن نہیں رہا ہے۔ پاکستان کو تعلقات پر نظرثانی کے علاوہ اپنے مفاد اور درپیش سنگین خطرات کا بھی ازسرنو جائزہ لینا ہو گا کیونکہ دونوں ہی قوتیں 2 مئی کے بعد اب پاکستان کو ہی دشمن قرار دینے کی پالیسی پر عمل پیرا ہوں گی۔

پاکستان نے 2007ء کے بعد جاری جنگ میں تقریباً 40 ہزار جانوں کا نذرانہ پیش کیا ہے، ان میں سکیورٹی فورسز کے افسروں کی تعداد 200 جبکہ جوانوں کی تعداد 6000 سے زائد ہے۔ اس دوران 900 سیاسی کارکن، 40 علماء، سابق وزیراعظم بے نظیر بھٹو سمیت پانچ ارکانِ اسمبلی اور ہزاروں عام اور معصوم لوگ بھی ہلاک ہوئے۔ اس عرصہ کے دوران شدت پسندوں کی جانب سے پاکستان میں 310 خودکش حملے بھی کیے گئے۔ صرف 2010ء کے دوران پاکستان میں پرتشدد کارروائیوں میں ہونے والی ہلاکتوں کی تعداد عراق اور افغانستان سے زیادہ ہے۔ آئی ایس آئی کے دفاتر کو پانچ اور ایف آئی اے کے دفاتر کو چار بار نشانہ بنایا گیا، جبکہ جی ایچ کیو پر بھی حملہ کیا گیا۔ پولیس پر 200 سے زائد حملے کئے گئے ہیں، جبکہ اغواء برائے تاوان اور بعض سابق اور حاضر سروس افسروں کی ہلاکتوں کی تعداد بھی نظرانداز نہیں کی جاسکتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شدت پسندوں نے پاکستان کو ہٹ لسٹ پر رکھا ہوا ہے۔

دوسری طرف امریکہ کا دباؤ اور عالمی برادری کے مطالبات بھی بڑھتے جا رہے ہیں۔ ملک

کو اندرونی سطح پر بیڈ گورننس، کرپشن، لسانی فسادات، علیحدگی پسند تحاریک، فرقہ واریت اور بدترین مہنگائی جیسے سنگین مسائل کا بھی سامنا ہے۔ دوسری طرف ہماری سنجیدگی کا یہ عالم ہے کہ ہم افغانستان میں اپنا حصہ مانگنے کے شوق میں خود کو بھی داؤ پر لگانے کی اندھی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ اس بات میں اب کوئی ابہام نہیں رہا کہ امریکہ کو ہر زمانے میں ایک دشمن کی ضرورت ہوتی ہے اور آثار بتا رہے ہیں کہ امریکہ، عراق اور افغانستان کے بعد تیسری جنگ پاکستان کے ساتھ کرنے کا تہیہ کر چکا ہے کیونکہ شدت پسندوں کی سرگرمیوں اور اسامہ بن لادن کی پاکستان میں موجودگی اور ہلاکت کے باعث امریکہ کے لیے جنگی نقطۂ نظر سے حالات سازگار ہو چکے ہیں۔ ماہرین کے مطابق عسکری اور سیاسی قیادت کے درمیان کوآرڈی نیشن کے فقدان اور بعض ایشوز پر خاموش اختلافات کے باعث قومی اتفاق رائے ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا جبکہ ملک کی سلامتی داؤ پر لگی ہوئی ہے اور اس کے گرد گھیرا تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ اگر مستقبل میں پاکستان میں کسی اور مطلوب دہشت گرد کی نشاندہی ہوتی ہے اور امریکہ نے اس کے خلاف ایسی ہی کوئی کارروائی کی تو اس کے اثرات اور نتائج کے بارے میں صرف تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔ غیر جانبدار ماہرین کا خیال ہے کہ اس نازک موڑ پر پاکستان کو ڈبل اور ٹرپل گیم کی بجائے اب لکیر کے کسی ایک طرف کھڑا ہونا پڑے گا اور ماضی کی طرح مبہم پالیسیوں سے کلی اجتناب کا راستہ اپنانا ہوگا، کیونکہ پاکستان کے دشمنوں کی تعداد جس تیزی کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہے، اس سے پیدا ہونے والی صورتحال سے نکلنا روایتی پالیسیوں کے ذریعے ممکن نہیں ہے۔ عوام کے بڑھتے ہوئے عدم اعتماد اور علاقائی اور عالمی قوتوں کے دباؤ اور خدشات کا مقابلہ کرنے کے لیے عوام، عسکری قیادت، صاحب الرائے افراد اور حکومت کو اب یکجا ہو کر کام کرنا ہوگا۔

اسامہ بن لادن کا تین بار انٹرویو کرنے والے ملک کے نامور صحافی حامد میر کا کہنا ہے کہ اسامہ بن لادن پاکستانی فوج کو پسند نہیں کرتے تھے اور وہ انٹیلی جنس اداروں سے بھی دور رہا کرتے تھے، وہ اگر ایسا نہ کرتے تو اس قدر طویل عرصے تک ان کی پہنچ سے بچ نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے اپنی موت کے بعد اپنے دو بڑے مخالفین یعنی سی آئی اے اور آئی ایس آئی کو ایک دوسرے کے مدِ مقابل لا کھڑا کیا اور یہی ان کی بعد از موت بڑی کامیابی بھی قرار دی جا سکتی

ہے۔ ''مجھے نہیں لگتا کہ آئی ایس آئی اور بن لادن کے درمیان کوئی رابطہ یا تعلق تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو جو تنظیمیں آئی ایس آئی سمیت دوسرے ریاستی اداروں کو نشانہ بناتی رہی ہیں، ایسا کرنے سے گریز کرتیں کیونکہ اسامہ ان سب کے ہیرو اور آئیڈیل تھے۔ القاعدہ ہر اس قوت کی مخالف تھی جو کہ امریکہ کی حامی تھی۔'' حامد میر کے مطابق؛ پاکستان کے عوام اور ریاست کی رائے اور پالیسیوں میں بہت فرق ہے اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم موجودہ جنگ کے حوالے سے کوئی ہم آہنگی پیدا نہیں کر سکے۔ بظاہر اس بات کا بہت کم امکان پایا جاتا ہے کہ اسامہ بن لادن کی موت سے القاعدہ کی سرگرمیاں ختم ہو جائیں گی، امکان یہ ہے کہ ان میں اور شدت آ جائے گی۔ ہمارے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے کہ اسامہ پاکستان میں کیا کر رہے تھے اور جب امریکی ان کو مار کر واپس جا رہے تھے تو ہمارے ادارے کیا کر رہے تھے۔ یہ خاصی پیچیدہ اور تشویشناک صورتحال ہے۔

نامور افغان صحافی اور ویب سائٹ ''خبریال'' کے ڈائریکٹر میرویس افغان کے مطابق؛ امریکہ اسامہ بن لادن کی موت کے بعد بھی افغانستان سے نکلنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ سب سے اہم سوال تو یہ ہے کہ کیا امریکہ محض اسامہ کو ڈھونڈنے یا مارنے کے لیے یہاں آیا تھا یا اس کے کچھ اور مقاصد بھی تھے۔ میرا خیال ہے کہ امریکہ کے لیے اُس کی دیگر ترجیحات اسامہ کی ہلاکت سے زیادہ اہم ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ وہ افغانستان میں اپنی فورسز کی تعداد کم کرے گا اور اپنی پسند کے سیاسی ڈھانچے کے قیام کے لئے کوشش کرے گا۔ میرویس افغان مزید کہتے ہیں کہ پاکستان اور افغانستان کو امریکہ یا کسی دوسرے فریق پر زیادہ انحصار کرنے کی بجائے ایک دوسرے پر اعتماد کر کے اپنے مسائل کا خود حل نکالنا ہوگا کیونکہ دونوں ممالک ایک دوسرے کے لئے ناگزیر ہیں اور دونوں کے درمیان بہت سی چیزیں مشترک بھی ہیں۔ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ خلوص نیت سے بیٹھا جائے اور اعتماد کا ماحول بنایا جائے۔ اسی میں دونوں ممالک کا فائدہ ہے اور یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر خطے میں امن کے قیام کو ممکن بنایا جا سکتا ہے۔

پاکستان خطرات کی زد پر

معتبر پاکستانی، امریکی اور عرب میڈیا کی رپورٹس پر مبنی یہ اطلاع یا یہ خدشہ خاصا تشویشناک ہے کہ نیٹو فورسز پاکستان کی طرف سے فاٹا خصوصاً شمالی وزیرستان میں القاعدہ اور طالبان کے خلاف عالمی اتحاد کے تقاضوں کے مطابق مؤثر ترین کارروائی نہ کرنے کے باعث پاکستان کے اندر زمینی کارروائی کے آپشن پر سنجیدگی سے غور کر رہی ہیں۔ بہت سے لوگ اس کے باوجود اس امکان کو مسترد کرتے دکھائی دے رہے ہیں کہ امریکہ اس سے قبل ایک درجن سے زائد ممالک میں اس قسم کی کارروائیاں کر چکا ہے اور اس عالمی طاقت کی قوت اور اہمیت کا راز ہی یہ ہے کہ یہ دوسرے ممالک پر چڑھائی کرنے میں دیر نہیں لگاتا۔ وہ تجزیہ کار جو اس امکان کو مسترد کر رہے ہیں، ان کا مؤقف ہے کہ نیٹو کی جانب سے کرم ایجنسی میں چند ماہ قبل ہیلی کاپٹرز کی آمد کے واقعہ پر پاکستان نے شدید احتجاج کر کے سپلائی لائن کی بندش کا جو اقدام اٹھایا تھا، اس کے بعد امریکہ کے ہوش ٹھکانے آ گئے ہوں گے اور اتحادی فورسز سرحدوں کی خلاف ورزی کی جرأت نہیں کریں گی، تاہم یہ تجزیہ کار ایسا کہتے یا لکھتے وقت یہ بھول رہے ہیں کہ امریکہ اپنے ڈرون حملوں کی تعداد میں دن بدن نہ صرف یہ کہ اضافہ کر رہا ہے بلکہ پاکستان کے خلاف اس کے ریاستی ردِ عمل اور الزامات کا سلسلہ بھی شدت اختیار کر گیا ہے۔ اگر پاکستان واقعتاً امریکہ کے مقابل مزاحمت کا ارادہ یا قوت رکھتا تو پارلیمنٹ کی قراردادوں اور اکثریتی عوامی، سیاسی حلقوں کی مخالفت کے باعث ڈرون حملوں کے بڑھتے ہوئے سلسلے کا راستہ روک دیتا۔ یہ معلوم نہیں کہ بعض حلقے مداخلت کا کیا مفہوم اخذ کرتے ہیں، جس کی بنا پر وہ پاکستان سے عملی مزاحمت کی توقع رکھتے ہیں۔ ہماری معلومات اور تجزیوں کی تو حالت یہ ہے کہ ہم فاٹا اور پاکستان کے دوسرے جنگ زدہ علاقوں کے متعلق بنیادی اطلاعات کے لئے بھی مغربی خصوصاً امریکی اداروں پر انحصار کر رہے ہوتے ہیں جبکہ اہم پالیسیوں کے بارے میں بھی اکثر مواقع پر ہماری معلومات نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ عملاً ہماری اپنی معلومات اور انٹیلی جنس امریکیوں کے مقابلے میں کمزور یا ناقص ہے تو زیادہ غلط نہیں ہوگا۔ یہ بات بھی ثابت ہو چکی ہے کہ امریکی انٹیلی جنس نیٹ ورک پاکستان

خصوصاً فاٹا میں ہم سے اگر زیادہ مؤثر نہیں تو کم بھی نہیں ہے۔ اس ضمن میں ہم ڈرون حملوں کے اہداف کی مثال دے سکتے ہیں جن کے دوران کوئی نہ کوئی اہم کمانڈر نشانہ بن ہی جاتا ہے اور ہماری سرزمین پر ایسے لوگوں کی ہلاکتوں کی اطلاعات ہمیں پینٹاگون' نیویارک ٹائمز یا سی این این سے ہی مل رہی ہوتی ہیں۔ فاٹا، پختونخوا' بلوچستان اور کراچی کے بارے میں تبصرہ اور تجزیہ کرتے وقت امریکیوں کی معلومات اکثر مواقع پر اتنی ٹھوس، حقیقت پسندانہ اور غیر جانبدارانہ ہوتی ہیں کہ ہمیں ندامت محسوس ہونے لگتی ہے۔ ہم آج بھی 1971ء کی پاک بھارت جنگ کے دنوں میں استعمال ہونے والے ذرائع معلومات اور سرکاری پروٹوکول کی اس روایت سے باہر نہیں نکل پائے، جب ریڈیو پاکستان ڈھاکہ میں ہماری افواج کی کامیاب پیش قدمی کا جھوٹا پروپیگنڈہ کرنے میں مصروف تھا اور بی بی سی سے یہ خبر دی جارہی تھی کہ پاک فوج نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور پھر وقت نے ہمیں غلط اور بے خبر جبکہ بی بی سی کو درست ثابت کر دیا۔ آج بھی ہمارا سرکاری ریڈیو' سرکاری ٹیلی ویژن اور انفارمیشن کے دوسرے سرکاری ادارے عملاً 1971ء والی صورتحال سے مختلف نہیں ہیں۔ ہم اس تصور سے ہنوز باہر نہیں نکل سکے کہ امریکہ ہمارے بغیر کچھ نہیں کر سکتا، حالانکہ ہم خود بدترین جنگ کا سامنا کر رہے ہیں۔ سرکاری میڈیا کے اداروں اور جہادی تبصرہ نگاروں کی کتنی خبریں' اطلاعات اور تبصرے صرف نائن الیون کے بعد ہی غلط ثابت ہو گئے ہیں۔ ان کا اگر ریکارڈ مرتب کیا جائے، تو بہت سے لوگوں کی اہلیت اور اصلیت سامنے آ جائے گی۔ ضرورت اس اَمر کی ہے کہ درست واقعات اور حقیقت پسندانہ تجزیے کیے جائیں اور لوگوں کو اصل صورتحال سے آگاہ کیا جائے اور امریکہ کے اہداف کے تناظر میں درست تبصرے کر کے عوام کے علاوہ حکمرانوں اور بعض سیاستدانوں کی خوش فہمی کو بھی دور کیا جائے۔

اس حقیقت کو کون جھٹلا سکتا ہے کہ امریکہ کی سیاست' ریاست اور معیشت بنیادی طور پر جنگوں پر انحصار کرتی ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ نہ صرف یہ کہ مختلف ممالک اور اقوام کے درمیان کشیدگی پیدا کرتا ہے، بلکہ ان کو لڑا کر اپنا اسلحہ بھی فروخت کرتا ہے، جبکہ جہاں بھی اس کو اپنے معاشی مفادات کے تناظر میں مداخلت کی ضرورت پڑتی ہے، وہ ایسا کرنے کے لئے بہانہ بنا کر جنگ مسلط کر دیتا ہے اور ایسا کرتے وقت وہ نتائج یا مخالفت کی پروا بھی نہیں کرتا۔ بعض لوگوں کی

رائے یہ ہے کہ اگر امریکہ نے دہشت گردی کی آڑ میں پاکستان پر ڈرون حملوں کے بعد زمینی کارروائی جیسا کوئی دوسرا آپشن آزمایا تو ہمارا ساتھ دینے کے لئے چین میدان میں اتر آئے گا۔ ان سے اگر یہ سوال کیا جائے کہ جو چین اپنے ہی ہانگ کانگ اور تائیوان کے معاملے پر امریکہ کی کوششوں کے باوجود امریکہ کے خلاف میدان میں نہیں اترا، وہ ہمارے لئے اتنا بڑا رسک کیونکر لے گا۔ ہماری تو حالت یہ ہے کہ ہم علاقائی اور عالمی قوتوں کی بداعتمادی کے باعث عالمی گھیراؤ یا حصار میں ہیں۔سی آئی اے کے مطابق پاکستان میں 150 ٹھکانے ایسے ہیں جہاں پر انتہا پسند پناہ لئے ہوئے ہیں یا انہیں استعمال کر رہے ہیں، جبکہ پاکستان سمیت حالیہ جنگ میں شامل تمام اتحادی اس حکمتِ عملی پر عمل کرنے کے پابند ہیں، جس کے مطابق اگر کسی ملک میں شدت پسند مرکز یا ایسی سرگرمیوں کی نشاندہی کی جائے گی اور متعلقہ ملک ان کے خاتمے میں ناکام ثابت ہوگا تو اتحادی ممالک کو خود ایسے ٹھکانوں کے خلاف کارروائی کا حق حاصل ہوگا۔ اس فارمولے پر اگر پاکستان متفق ہے (یقیناً متفق ہے) تو سوال یہ ہے کہ اس صورت میں ہم نیٹو کو اس حق سے کیسے محروم رکھ سکتے ہیں، جس پر ہمارا اتفاق رائے ہو چکا ہے۔

ایک رپورٹ کے مطابق ایف بی آئی اور سی آئی اے 2004ء سے اب تک پاکستان میں پچاس سے زائد ایسی کارروائیاں کر چکی ہیں جبکہ صرف 2010ء میں ہم نے 121 ڈرون حملے برداشت کئے اور یکم جنوری کو نئے سال کے تحفے کے طور پر ہمیں چار ڈرون حملوں میں اکیس افراد کی قربانی دینا پڑی۔ برطانیہ کے ایک سابق فوجی کمانڈر نے کہا تھا کہ سی آئی اے نے 2006ء میں برطانیہ کے ایک فوجی دستے کو اسامہ بن لادن کو نشانہ بنانے سے منع کیا تھا کیونکہ اس کمانڈر کے مطابق امریکہ محض القاعدہ یا طالبان کے خاتمے کے لئے خطے میں نہیں آیا ہے۔روزنامہ مشرق کے سنڈے میگزین (جولائی 2010ء میں) میں جب ہم نے نشاندہی کی کہ امریکی اور نیٹو حکام فاٹا میں زمینی حملوں کے آپشن پر غور کر رہے ہیں اور اس کی ابتداء 2011ء میں ہو سکتی ہے تو ہمیں بے خبری کے بہت طعنے سننا پڑے تھے۔اب یہ تمام باتیں بہت سے معتبر ادارے اور لوگ کر رہے ہیں۔ضرورت اس اَمر کی ہے کہ امریکی عزائم، اہداف اور طریقۂ واردات کا درست تجزیہ کرتے ہوئے اپنی کمزوریوں کے تناظر میں مزاحمت یا ہٹ دھرمی کی بجائے حقیقت پسندی سے کام لیا جائے۔

دوسری طرف سیاسی اور دفاعی ماہرین ان خدشات کا اظہار کررہے ہیں کہ شمالی وزیرستان آپریشن میں اگر فورسز نے سوات کی طرح حملہ آور قوتوں کے خلاف کارروائی کی اور ان کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتی گئی تو ردعمل کے طور پر کالعدم تنظیموں کے لوگ ملک کے دوسرے علاقوں کو نشانہ بنانے کی پالیسی اپنا کر ریاست کو سخت مشکل میں ڈال دیں گے۔ اس طرح اگر افغانستان میں معتدل طالبان، کرزئی حکومت اور حزب اسلامی کے درمیان جاری رابطے کسی کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں اور تشدد پسند تنظیموں کے لئے افغانستان کے پشتون علاقے ماضی کی طرح محفوظ نہیں رہتے تو وہ ٹھکانوں کی تلاش میں بہ امر مجبوری فاٹا ہی کا رخ کریں گے اور اس صورت میں پاکستانی طالبان کی قوت اور صلاحیت میں اضافہ ہوگا۔ اس حقیقت میں کوئی شک نہیں ہے کہ ڈیورنڈ لائن کے اطراف میں موجود پشتون علاقے بدترین خوف' انارکی اور بے چینی کی حالت میں ہیں۔ فاٹا اب بھی عملاً طالبان یا پاکستانی فورسز کے ہاتھوں یرغمال بنا ہوا ہے۔ پشاور جیسے شہر کی حالت یہ ہے کہ یہاں پر ایک محتاط اندازے کے مطابق 45 سے زائد چیک پوسٹیں قائم ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ افغانستان کے بھی ان علاقوں میں ہی جنگ جاری ہے جو کہ پشتون آبادی پر مشتمل ہے۔ غیر پشتون علاقے نہ صرف یہ کہ پرامن ہیں بلکہ وہ تیزی سے ترقی اور خوشحالی کی راہ پر بھی گامزن ہیں۔

پشتون آبادی کو بلوچستان اور کراچی میں بھی دو سے زائد قوتوں کی نفرت' مخالفت اور حملوں کا سامنا ہے۔ دوسری طرف دونوں اطراف کے پشتونوں کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ ان کو سنجیدہ، جرأت مند اور باکردار قیادت میسر نہیں ہے۔ یہ سوال بڑی شدت کے ساتھ اب بھی موجود ہے کہ اگر اے این پی جیسی قوم پرست قوت نے اپنا قبلہ درست کر کے عوام کا اعتماد بحال نہیں کیا اور صورتحال جوں کی توں رہی تو بداعتمادی کی صورت میں پشتون بیلٹ میں جو سیاسی خلاء پیدا ہوگا، وہ کیسے اور کن کے ذریعے پُر ہوگا کیونکہ دوسری مروجہ پارٹیاں اس خطے میں کوئی تنظیمی ڈھانچہ یا نظریاتی بنیادیں نہیں رکھتیں۔ اگر ان حالات میں طالبان نے اپنے سخت گیر رویہ پر نظر ثانی کر کے سیاسی رویہ اپنایا اور افغانستان کی طرح عوام نے ان پر اعتماد کرنا شروع کر دیا تو اس کے کیا نتائج برآمد ہو سکتے ہیں؟ بعض حلقوں کے نزدیک ایسا ہونا ممکن ہے اور دوسری جانب طالبان کے بعض

سنجیدہ حلقے اس آپشن کا جائزہ بھی لے رہے ہیں۔ اس ضمن میں چند ماہ قبل کراچی میں پشتونوں کے قتل عام پر قاری حسین کے اس بیان کی مثال دی جاسکتی ہے جس میں انہوں نے خالصتاً سیاسی موٴقف اختیار کرتے ہوئے ایم کیو ایم اور اے این پی دونوں کو دھمکی دے کر کہا تھا کہ تحریکِ طالبان پاکستان اس صورتحال پر خاموش نہیں رہ سکتی۔ اس حوالے سے 90 کی دہائی میں افغانستان کے حالات کی مثال بھی دی جاسکتی ہے جب ڈاکٹر نجیب اللہ کی حکومت کے خاتمے کے بعد جہادی تنظیموں کی آپس کی لڑائیوں سے تنگ آکر افغانیوں نے نہ صرف یہ کہ طالبان کو خوش آمدید کہا بلکہ بائیں بازو کی بعض تنظیمیں بھی طالبان کی حمایت کرتی ہوئی نظر آئیں۔ طالبان' حزب اسلامی اور کرزئی کی قربت کو بھی بعض حلقے پشتون قوم پرستی کے تناظر میں دیکھ رہے ہیں۔
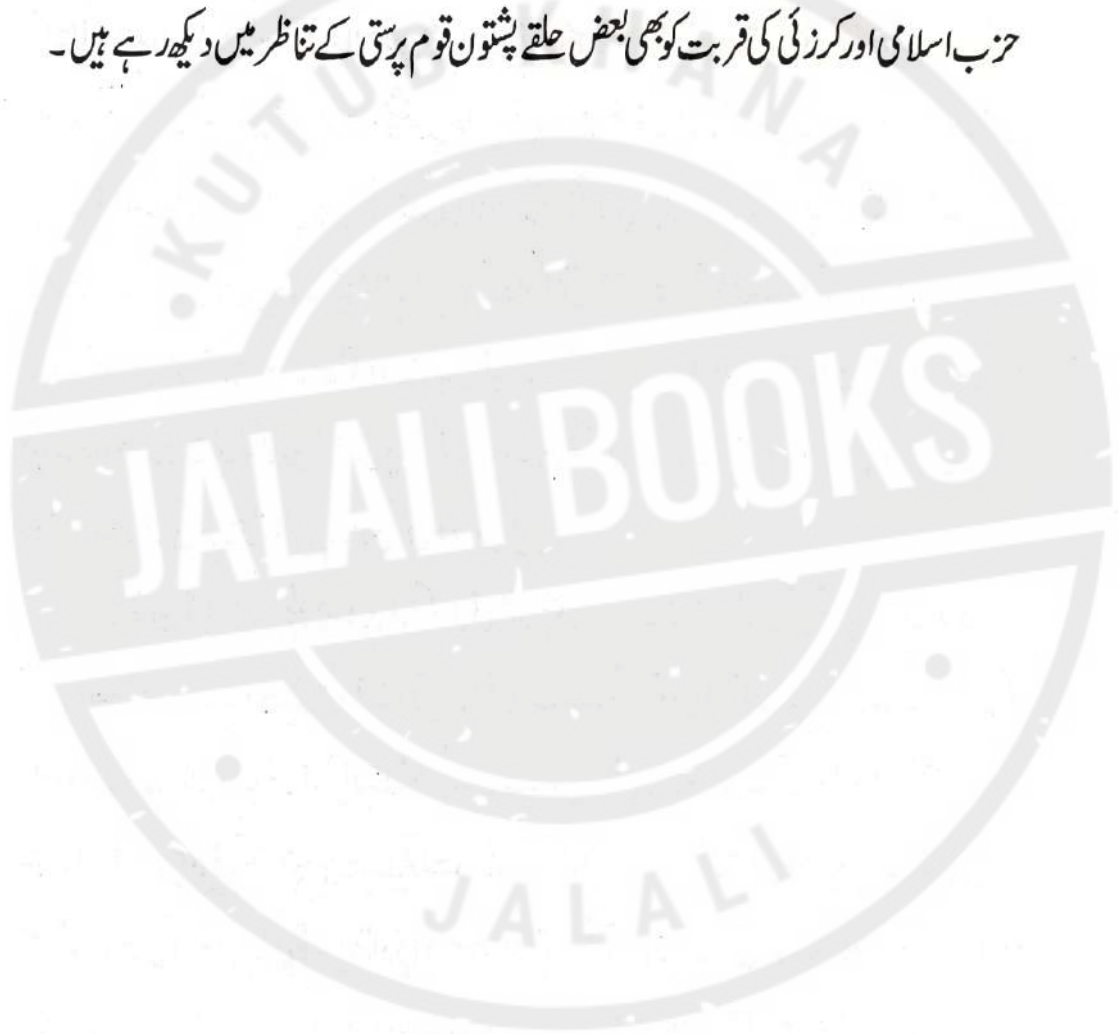
کراچی کے پختونوں کا المیہ

پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی میں متحارب قوتوں کے درمیان جاری تصادم اس شہر کے مستقبل کے لئے سنجیدہ نوعیت کا مسئلہ ہے اور امن و امان کی صورتحال دن بدن خراب ہوتی جا رہی ہے۔ کراچی وہ واحد شہر ہے جہاں ملک کے ہر حصے' علاقے اور قومیت کے لوگ کاروبار اور روزگار کے زیادہ مواقع کے باعث مستقل طور پر قیام پذیر ہیں۔ اگر کسی نے پاکستان کے مجموعی قومی مزاج کا تجزیہ کرنا ہے تو وہ کراچی کی بودوباش کا مشاہدہ کرسکتا ہے۔ یہ شہر 1984ء کے بعد سے مختلف قومیتوں اور طبقات کے درمیان کشیدگی اور اختلافات کا مرکز بنا ہوا ہے اور تمام تر کوششوں کے باوجود حالات کی بہتری کا امکان نظر نہیں آ رہا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق 85-1984ء سے اب تک کراچی میں لسانی، مسلکی اور سیاسی اختلافات میں تقریباً تین لاکھ افراد اپنی جانیں گنوا چکے ہیں۔ اگر ان اعداد و شمار کا جائزہ لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ کراچی دنیا کا خطرناک ترین شہر ہے۔ یہ اَمر باعثِ حیرت ہے کہ دنیا میں پختونوں کا سب سے بڑا شہر کراچی ہے اور یہاں پر 35 سے 45 لاکھ تک پختون رہ رہے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کراچی کی ملکیت کا دعویٰ کرنے والی ایم کیو ایم اور پختون کمیونٹی کے درمیان اب تک درجنوں خونریز جھڑپیں ہوئی ہیں اور اب بھی شہر میں ان دو قوتوں کے درمیان کشیدگی اور تصادم کی فضا قائم ہے۔ فریقین کے درمیان انفرادی اور اجتماعی تصادم کے کئی ایک واقعات کے دوران افسوسناک اور سفاکانہ واقعات بھی رونما ہوئے ہیں۔ مخالفین کو مارنا' ان کی لاشوں کے ٹکڑے کرنا' خواتین کی بے حرمتی کرنا اور کسی بھی عمر کے لوگوں کو نشانہ بنانے کے بے شمار واقعات نے اس شہر کو خوف کی علامت بنا دیا ہے۔

ایک وقت تھا جب اردو بولنے والے مہاجرین پختونوں' سندھیوں اور بلوچوں کے شخصی اور گروہی امتیاز اور حملوں کی زد میں رہا کرتے تھے۔ اردو بولنے والے لوگوں کی زیادہ تعداد جماعت اسلامی سے وابستہ تھی کیونکہ وہ پیپلز پارٹی کو سندھیوں کی پارٹی سمجھ کر اس سے دور ہی رہتے تھے۔ جماعت اسلامی اس زمانے میں کراچی اور حیدر آباد کی ایک مؤثر قوت تھی۔ اس حقیقت کو رَد نہیں کیا جا سکتا کہ ایم کیو ایم کے قیام میں دوسری قومیتوں کے اس جارحانہ رویئے نے بہت بنیادی

کردار ادا کیا جو کہ وقتاً فوقتاً یہ لوگ اردو بولنے والوں کے ساتھ روا رکھا کرتے تھے۔ ان رویوں اور بعض واقعات نے مہاجروں کو مجبور کیا کہ وہ اپنے دفاع کے لئے خالصتاً اپنے مفادات کے تناظر میں کوئی تنظیم قائم کریں اور یوں 80ء کی دہائی میں مہاجر سٹوڈنٹس آرگنائزیشن کا قیام عمل میں لایا گیا۔ شہر میں چونکہ مہاجروں کی آبادی سب سے زیادہ تھی اور وہ تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ کاروبار میں بھی آگے تھے، اس لئے ان کی اس تنظیم نے خوب ترقی کی اور 80ء کی دہائی میں مہاجروں کو الطاف حسین اور ان کے دوسرے ساتھیوں کی صورت میں فعال قیادت میسر آ گئی۔ یہی وہ فیصلہ کن موڑ تھا جب کراچی میں ایک نئے مگر خونریز دور کا آغاز ہوا اور پرتشدد سیاست کی بنیاد پڑی۔ اس دوران ایک پختون ڈرائیور سے ہونے والے حادثہ میں ایک مہاجر لڑکی کی ہلاکت کے واقعہ نے پختونوں اور مہاجروں کو ایک دوسرے کے آمنے سامنے لا کھڑا کیا اور برسوں گزرنے کے باوجود بھی یہ دونوں قومیتیں ایک دوسرے کے خلاف پرتشدد کارروائیوں میں ملوث ہیں۔ ایم کیو ایم کے مضبوط تنظیمی ڈھانچے اور نظم وضبط کو دیکھ کر پختونوں نے بھی سیاسی طور پر فعال ہونے کا فیصلہ کیا اور یوں ان کی نظرِ انتخاب عوامی نیشنل پارٹی پر آ کر ٹھہر گئی، کیونکہ اے این پی پختونوں کے حقوق کی دعویدار سیاسی قوت تھی۔ یوں کراچی کے پختونوں نے اے این پی کو اپنی نمائندہ جماعت تسلیم کر لیا اور اس جماعت کی سیاسی قوت میں اضافہ ہونے لگا۔

اگر ہم کراچی کی حد تک ایم کیو ایم اور اے این پی کی تشکیل کو مہاجروں اور پختونوں کے اپنے اپنے مفادات کے تناظر میں اختیار کی گئی پالیسی یا ایک مجبوری کا نام دیں تو غلط نہیں ہوگا۔ مہاجروں کو سندھیوں کی صورت میں ایک اور دشمن کا بھی سامنا تھا کیونکہ ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ حکومت میں سندھیوں نے مہاجروں کو دیوار سے لگا دیا تھا اور دیہی' شہری سندھ کی دوری نے فریقین کو غیر اعلانیہ جنگ کی طرف دھکیل دیا تھا، تاہم چونکہ ابتداء میں دونوں لسانی طبقات تشدد سے گریز کی پالیسی پر عمل پیرا تھے، اس لئے ان کے درمیان تصادم کے زیادہ واقعات نہیں ہوئے۔ ایم کیو ایم اور اے این پی کے درمیان زیادہ کشیدگی رہی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنا دشمن تصور کرنے لگے۔ 80ء کی دہائی میں دونوں گروہوں کا مسلح کشیدگی کے باعث خاصا جانی اور مالی نقصان ہوا، تاہم خان عبدالولی خان جیسے زیرک سیاست دان نے کراچی

میں ایم کیو ایم کے ساتھ مذاکرات کر کے معاملات کو اور بگڑنے سے روک دیا۔ ولی خان کا مؤقف تھا کہ پختون چونکہ روزگار کی تلاش میں یہاں آئے ہیں اور ان کے مالی حالات ان کو تصادم کی اجازت نہیں دیتے، اس لئے مسلسل کشیدگی سے زیادہ نقصان پختونوں کا ہی ہوگا۔ ولی خان نے ایم کیو ایم خصوصاً الطاف حسین کے ساتھ مثبت تعلقات کی بنیاد رکھ دی اور یوں آئندہ کے کئی سال پرسکون اور پرامن گزرے۔ دونوں پارٹیوں کے درمیان مثبت تعلقات کا آغاز ہوا۔ الطاف حسین اپنی تقاریر میں باچا خان کا نام بہت عزت کے ساتھ لیا کرتے تھے۔ اگلے دس بارہ سال پرامن طریقے سے گزرے۔ اگرچہ فریقین ایک دوسرے کے خلاف تشدد پر اُتر آتے تھے مگر ایسے واقعات کی شرح زیادہ نہیں تھی۔

ایک دور تھا جب سندھی اور بلوچی قیادت پختونوں یا اے این پی کا ساتھ دینے کی پالیسی پر عمل پیرا تھی کیونکہ ان کے آپس میں سیاسی اتحاد ہوا کرتے تھے اور اول الذکر دو قومیں مہاجروں کو قابو میں رکھنے کے لئے پختونوں کی حمایت کو ناگزیر تصور کرتی تھیں۔ سندھیوں کی پالیسی یہ رہی کہ دونوں قومیں آپس میں دست و گریباں رہیں اور سندھ میں طاقت کا توازن سندھیوں کے ہاتھ میں واپس آ جائے کیونکہ سندھی مختلف پارٹیوں میں تقسیم تھے اور ان کی آبادی بھی کم تھی۔ اصل مسئلہ اے این پی اور ایم کیو ایم کے درمیان ہی موجود رہا۔ چند برس قبل اس کشیدگی میں اضافہ ہوگیا اور خونریز جھڑپوں اور حملوں کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہوگیا۔ اب شاہی سید کی شکل میں اے این پی کو ایک ایسا رہنما میسر آ گیا تھا جو اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا قائل تھا۔ وہ نظریاتی کم اور کاروباری شخص زیادہ تھا۔ شاہی سید نے اسفندیار ولی خان کی آشیرباد سے دوسرے سینئر رہنماؤں کو پرے دھکیل دیا اور اپنے طور پر فیصلے کرنا شروع کر دیئے۔ بعض خفیہ عناصر نے بھی ان کی حمایت کی کیونکہ وہ ایم کیو ایم سے خوفزدہ اور ناراض تھے اور اے این پی یا شاہی سید کے ذریعے اس قوت کو لگام دینا چاہتے تھے۔ اے این پی کے ان خفیہ ہمدردوں میں پنجابی لابی بھی موجود تھی کیونکہ وہ کراچی میں اپنا کاروباری تحفظ چاہتی تھی اور اربوں کے کاروبار میں ان کا بہت بڑا حصہ تھا۔ بعض خفیہ ایجنسیاں بھی ایم کیو ایم سے شاکی تھیں اور ایم کیو ایم کی قوت میں مزید اضافہ ان کے لیے باعثِ تشویش تھا۔ یوں تمام ایم کیو ایم مخالف قوتوں اور قومیتوں نے اے این

پی کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا اور اے این پی اور ایم کیو ایم ایک طویل جنگ لڑنے کے لیے میدان میں اتر آئیں۔ اس صورتحال نے عام پختونوں کو بہت سی مشکلات سے دوچار کیا کیونکہ ان کی کراچی آمد کا مقصد جنگ لڑنا نہیں بلکہ روزگار حاصل کرنا تھا۔

کراچی میں پختون اور مہاجر دو بڑی اور واضح قوتیں بن کر ابھری تھیں، جس کے باعث شہر کی سیاست سے دیگر پارٹیاں خارج ہوگئیں، یہاں تک کہ اکثریتی پارٹی پی پی پی بھی اپنا اثر ورسوخ کھو بیٹھی۔ چند برس قبل شاہی سید نے پختون ایکشن کمیٹی کے قیام کا اعلان کر کے ان طبقوں اور تنظیموں کو بھی اپنے ساتھ ملالیا جن کا سیاست یا کسی پارٹی سے کوئی تعلق نہیں تھا، بلکہ ان کو اپنے گروہی اور کاروباری مفادات کی فکر لاحق تھی۔ ان میں لینڈ مافیا کے لوگ بھی تھے' جرائم پیشہ بھی تھے' بھتہ خور بھی اور ٹرانسپورٹرز بھی، یوں یہ سب قوتیں پختون ایکشن کمیٹی کے جھنڈے تلے یکجا ہوگئیں اور انہوں نے اپنے مطالبات کے حق میں زبردست قسم کی ہڑتالوں کی کالیں دے دے کر ایم کیو ایم کے علاوہ دوسری قوتوں کو بھی پریشان کر دیا۔ ملٹی نیشنل کمپنیاں اور کاروباری حلقوں کو بھی تشویش ہوئی کیونکہ کراچی مکمل طور پر جام ہوگیا تھا اور زندگی رک سی گئی تھی۔ اس وقتی کامیابی نے اے این پی خصوصاً شاہی سید کی قوت میں اضافہ کیا، تاہم مخالفین بھی الرٹ ہوگئے اور وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ اگر یہ سلسلہ آگے بھی چلتا رہا تو پختونوں کو قابو کرنا مشکل ہو جائے گا۔ یوں ایم کیو ایم تشدد پر مبنی ایک نئی مگر خطرناک پالیسی وضع کر کے پوری قوت کے ساتھ پختونوں کے خلاف میدان میں نکل آئی اور تشدد کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ اے این پی کے مقابلے میں چونکہ ایم کیو ایم زیادہ منظم اور طاقتور قوت تھی، اس لئے اس مرحلے میں اس کا پلہ بھاری رہا اور پھر 12 مئی کا خون آلود دن طلوع ہوا، جب 50 سے زائد پختون شہید کر دیئے گئے۔ ماہرین کے مطابق یہ اے این پی کے خلاف ایم کیو ایم کا کھلا اعلان جنگ تھا۔ اب ایم کیو ایم ہر پختون کو اے این پی کا کارکن یا ہمدرد سمجھ کر نشانہ بنانے لگی اور یوں عام پختونوں کو نہ چاہتے ہوئے بھی اے این پی کا سہارا لینا پڑا۔ اس کے ساتھ ہی وہ غیر نظریاتی یا غیر سیاسی گروہ جو پختون ایکشن کمیٹی میں شامل ہوگئے تھے، وہ اپنے اپنے اہداف کے حصول کے لیے نکل کھڑے ہوئے اور ایم کیو ایم پختونوں کے خلاف انتہائی منظم سیاسی اور ریاستی قوت کے ساتھ میدان میں نکل آئی۔ کمزور اور جذباتی

پختون قیادت بعض مواقع پر دوسروں کے ہاتھوں میں کھیلنے لگی اور یوں پختونوں کو فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوا۔ یہ محسوس ہونے لگا کہ مرکزی قیادت نے تمام اختیارات شاہی سید کے ہاتھ میں دے دیئے ہیں اور وہ قیادت کے سامنے جوابدہ نہیں ہیں۔ تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ 12 مئی کے بعد اسفند یار ولی اور شاہی سید نے سندھ حکومت یا ایم کیو ایم کے ساتھ جو معاملات طے کیے، ان میں ذاتی مفادات کے حصول کو ترجیح حاصل تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ پختونوں کو کوئی تحفظ اور احترام نہیں ملا۔ یہ الزام یا گلہ اب بھی کراچی میں زیر گردش ہے اور اے این پی وضاحت کرنے میں ناکام رہی ہے۔ یہ تاثر عام ہے کہ شاہی سید اور ان کے ساتھی اپنی مرکزی قیادت کے فیصلوں کا احترام نہیں کرتے۔ سندھ خصوصاً کراچی میں اے این پی شاہی سید کے ساتھ اس طرح جڑ چکی ہے، جیسا کہ صوبہ خیبر پختونخوا میں یہ بیگم نسیم ولی خان کے ساتھ منسلک ہوگئی تھی، حالانکہ دونوں کی اہلیت، پس منظر اور قابلیت میں بہت فرق ہے۔

کراچی میں سب سے بڑا المیہ اب یہ سامنے آرہا ہے کہ اے این پی پختونوں کے متعلق اسی پالیسی پر عمل پیرا ہے، جس پر کبھی ایم کیو ایم عمل پیرا رہی ہے۔ یعنی اے این پی اپنے عہدیداروں اور کارکنوں کے علاوہ باقی تمام پختونوں کے ساتھ کوئی تعاون یا رعایت نہیں برت رہی اور اکثر مواقع پر عام پختون اے این پی سے نالاں دکھائی دیتے ہیں۔ زمینوں اور عمارتوں پر قبضے جیسے واقعات کے دوران بھی پختونوں کو نہیں بخشا جاتا۔ پارٹی کے مراعات یافتہ گروہ قیادت کی آشیر باد سے اپنے دفاع کے نام پر دوسروں کے لیے تو کیا، اپنوں کے لئے بھی دردسر بنے ہوئے ہیں اور اب کے باران کے اپنے لوگ بھی یرغمال بنائے جا چکے ہیں۔ یعنی ایم کیو ایم کی طرح اب اے این پی بھی اپنوں کے خلاف ایکشن لینے سے گریز نہیں کر رہی اور اس رجحان کو عام پختون بہت تشویش کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ ایم کیو ایم ایک منصوبے کے تحت ہزارہ وال کو پختونوں خصوصاً اے این پی کے خلاف لانے کی کوشش میں ہے اور ان کو آپس میں لڑانے کی کئی کوششیں بھی کی جا چکی ہیں۔ دوسری طرف عام پختونوں کی زندگی کی بنیادی ضروریات تک رسائی نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود اے این پی کی مرکزی قیادت ٹس سے مس نہیں ہو رہی اور بلوچستان کی طرح وہ کراچی کے پختونوں کے مسائل سے بھی لاتعلق ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ

کراچی کے پختونوں کو بیک وقت ایم کیو ایم، سندھیوں، طالبان، ریاستی اداروں اور اپنوں کے منفی طرزِ عمل بلکہ حملوں کا سامنا ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ یہ کم وبیش وہی حالات ہیں جن کا سامنا شاید جنگ زدہ قبائلی علاقے کر رہے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ کراچی میں آباد پختون کہیں اور جا بھی نہیں سکتے اور اب بری طرح پھنس چکے ہیں۔

پختون فکری جرگہ کے سربراہ اور ممتاز سیاسی شخصیت امیر حمزہ مروت کے مطابق پختونوں کو موجودہ حالات تک پہنچانے میں اے این پی کے جذباتی اور غلط فیصلوں کا بہت عمل دخل ہے۔ طاقت اور حکمتِ عملی کے فقدان کے باعث پختونوں کو منظم ایم کیو ایم کے خلاف صف آراء کر کے ان کو بڑی مشکل میں ڈالنے کی پالیسی کو کسی صورت درست قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ہم خود کو کابل، فاٹا، پختونخوا اور کوئٹہ کے حالات سے لاتعلق نہیں رکھتے، مگر ان علاقوں کی پختون قیادت نے ہمیں یا تو تنہا چھوڑ دیا ہے یا ہم ایسے لوگوں کے رحم وکرم پر ہیں جن کا کوئی وژن اور اہلیت نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کراچی میں جاری کشیدگی کا ہمیں بہت نقصان ہو رہا ہے۔ ہم متحد اور منظم نہیں ہے۔ گولی اور بندوق کا سہارا لے کر ہم ایک صنعتی شہر میں اپنی ساکھ اور کاروبار کو کیسے بہتر اور محفوظ بنا سکتے ہیں۔

پیپلز پارٹی کے رہنما شاہ جہان خان نے بتایا کہ کراچی کے پختونوں کا معیار زندگی افسوسناک حد تک خراب ہے۔ جن علاقوں میں پختون بڑی تعداد میں قیام پذیر ہیں، وہ علاقے حکومت کی منصوبہ بندی اور نقشوں کا حصہ نہیں ہیں کیونکہ زیادہ تر علاقے قانونی دستاویزات کے بغیر ہیں۔ ایسے میں جب بجٹ مختص ہوتا ہے تو طریقہ کار کے مطابق ان علاقوں میں ترقی اور بنیادی سہولیات کی فراہمی ممکن نہیں ہو پاتی۔ یہی وجہ ہے کہ 90 فیصد پختون علاقے بنیادی انسانی سہولیات سے محروم ہیں۔ تعلیم کی طرف ان کا رجحان بہت کم ہے جبکہ وہ سرکاری ملازمتیں بھی نہیں کر رہے۔ ایسے میں آپ ان کی زندگی کو قابل رحم زندگی کا نام دیں گے تو غلط نہیں ہوگا۔ یہ اَمر باعثِ حیرت ہے کہ صدر زرداری کی ذاتی خواہش کے باوجود اتنی بڑی آبادی کے لئے پختونوں میں سے ایک مشیر کا انتخاب ممکن نہیں ہو سکا۔

کراچی کے ممتاز نوجوان صحافی ضیاء الرحمان کی رائے ہے کہ عدم تحفظ یہاں کے پختونوں کا سب سے سنگین مسئلہ ہے۔ تعلیم اور روزگار کے مواقع بھی بہت کم ہیں۔ 40 لاکھ کی آبادی سے

صرف تین ارکانِ اسمبلی منتخب ہوئے ہیں اور ان کی کارکردگی سے بھی عوام اور ووٹرز خوش نہیں ہیں۔ اگر آبادی کا تناسب نکالا جائے تو صوبائی اسمبلی میں پختونوں کے ارکان کی تعداد 25 جبکہ اراکینِ قومی اسمبلی کی تعداد پندرہ سے زائد ہونی چاہئے، مگر اس وقت ہمارا ایک بھی رُکن قومی اسمبلی نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی نے بھی حلقہ بندیوں کے دوران اس اہم ترین ایشو پر کوئی واضح مؤقف اختیار نہیں کیا۔

ہزارہ ڈویژن سے تعلق رکھنے والے مفتی ضیاء السلام ٹکروی کا کہنا ہے کہ ہم نے محض اسی جذبہ کے تحت ملیر سے اے این پی کے ایک رُکن کو کامیاب کرایا کہ وہ پختونوں کے حقوق اور امن کے قیام کی بات کر رہا تھا۔ کامیابی کے بعد موصوف نے ان لوگوں سے بھی منہ موڑ لیا جنہوں نے دن رات ایک کر کے ان کی انتخابی مہم چلائی تھی۔ یہ رویہ ہو گا تو ہمیں مایوسی تو ہو گی ہی، اس کے ساتھ ہی عوام آئندہ ووٹ بھی نہیں دیں گے۔ بدعنوانی' بدانتظامی اور اقرباء پروری ان کی بنیادی پالیسی ہے۔ جس ایم پی اے کو ہم نے ووٹ دیئے اور ان کے لئے مساجد اور مدارس میں اجتماعات منعقد کرائے، کامیابی کے بعد اب وہ ٹیلی فون پر بھی دستیاب نہیں ہوتے۔ ہزارہ سے تعلق رکھنے کے باوجود میں اے این پی کا ساتھ دیتا رہا ہوں اور ہم نے ایم کیو ایم کی ہر اس کوشش کو ناکام بنایا جس کے تحت وہ ہمیں اور پختونوں کو لڑانا چاہتے تھے، شاید اے این پی کو مصالحت' تعاون' مشاورت اور خدمت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ایسے میں پختون کراچی میں ذلیل وخوار ہی ہوں گے۔ ضرورت اس اَمر کی ہے کہ برابری کی بنیاد پر سب کی رائے' مسائل اور مطالبات تسلیم کرتے ہوئے اپنے تحفظ اور حقوق کا دفاع تشدد کے بجائے پرامن طریقے سے ممکن بنایا جائے۔

لاپتہ افراد کا مستقبل

عدالت کی جانب سے میریٹ ہوٹل حملے میں مبینہ طور پر ملوث چار ملزموں کی رہائی سمیت ملک کی مختلف عدالتوں سے ایسے دوسرے بے شمار افراد کی باعزت رہائی نے پاکستانی تفتیشی اداروں اور کسی حد تک عدالتوں کی کارکردگی اوران کے مقدمات کی سماعت کے طریقۂ کار پر بھی سوالیہ نشان لگادیا ہے۔ یہ سوال بڑی شدت سے اٹھایا جارہا ہے کہ انسداددہشت گردی کے علاوہ دوسری عدالتیں اب تک گرفتار ملزموں کوسزائیں دینے میں کیوں ناکام رہی ہیں؟ اعدادوشمار سے پتہ چلتا ہے کہ 2007ء سے اب تک پاکستان میں ایک اندازے کے مطابق چار ہزار سے زائد افراد دہشت گردی کے الزامات کے تحت گرفتار کیے جاچکے ہیں تاہم ان میں سے 10 فیصد کو بھی سزائیں نہیں ملی ہیں۔ایک رپورٹ کے مطابق صرف مالاکنڈ ڈویژن کے تین اضلاع یعنی سوات' دیراور بونیر سے دوہزار سے زائدافرادکوحراست میں لیا گیا، تاہم ان میں سے کسی کوسوات آپریشن کے اتنا عرصہ گزرجانے کے باوجود کسی عدالت میں پیش نہیں کیا گیا۔ بے شمار زیرحراست ملزم ایسے ہیں جن کے رشتہ داروں کو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ ان کوگرفتاری کے بعد کہاں رکھا گیا ہے۔اس کی ایک بڑی وجہ شاید یہ ہے کہ ایم ایم اے اوراے این پی کی حکومتوں نے تین مختلف مواقع پر طالبان کے ساتھ اپنے مذاکراتی عمل کے دوران دباؤ میں آکر ان سینکڑوں افراد کی رہائی کے احکامات جاری کیے، جن کو پولیس' فوج اور خفیہ ادارے اپنی حراست میں لے چکے تھے۔ خفیہ اداروں کے حکام کااس ضمن میں مؤقف ہے کہ ایسے تمام افرادرہائی کے کچھ عرصہ بعد ہی طالبان کے ساتھ مل کر دوبارہ اپنی شدت پسند سرگرمیاں شروع کردیتے ہیں۔اے این پی نے 09-2008ء کے دوران مولوی فضل اللہ اوراس کے بعد مولانا صوفی محمد کے ساتھ اپنے ناکام مذاکراتی عمل کے دوران جن گرفتار طالبان کو رہا کرنے کا اقدام کیا، ان کی تعداد چار سو سے زائد بتائی جاتی ہے، ان میں بعض کمانڈر بھی تھے۔ان افراد نے کچھ ہی عرصہ بعد شروع کی جانے والی مزاحمت کے دوران طالبان کے ساتھ مل کر اپنی کارروائیاں پھر سے شروع کردیں جبکہ ان میں سے کئی ایک فورسز کے ساتھ جھڑپوں میں ہلاک ہوگئے۔ خفیہ ادارے اورفوجی حکام ان تین تجربات کے بعد اس نتیجے پر پہنچے

کہ جب ایسے افراد کو سول حکومت یا عدالتیں رہا کرنے کے احکامات جاری کر دیتی ہیں اور ان کے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا جاتا ہے تو اس سے بہتر یہ ہے کہ ان کو نامعلوم مقامات پر اپنی تحویل میں رکھا جائے یا انہیں ہلاک کر دیا جائے۔ سکیورٹی ایجنسیاں اب تک اسی حکمتِ عملی پر عمل پیرا رہی ہیں اور قرینِ قیاس یہی ہے کہ اگر عدالتوں اور حکومت نے اس ضمن میں کوئی ٹھوس پالیسی نہیں اپنائی تو گرفتار افراد میں سے بیش تر خطرناک نتائج کا شکار ہو جائیں گے۔ یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ سپریم کورٹ پولیس کے تشدد اور ایسے دوسرے بے شمار واقعات کا تو منٹوں میں نوٹس لیکر کارروائی کر دیتی ہے، تاہم انتظامی صلاحیت اور اقدامات کا یہ عالم ہے کہ حکومت اور عدلیہ نے ایک سال کا عرصہ گزرنے کے باوجود سوات میں عوام کے مطالبے پر حکومت کے اعلان کردہ عدالتی نظام کے قیام کو تاحال ممکن نہیں بنایا۔ اس ایک واقعے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حکومت اور عدلیہ کے متعلقہ ارباب اختیار عوام کو سستا اور آسان انصاف فراہم کرنے میں کتنے مخلص ہیں، حالانکہ اس مسئلے کے ساتھ نہ صرف یہ کہ ہزاروں انسانوں کی زندگیاں اور مستقبل وابستہ ہے، بلکہ اس معاملے کو پاکستان میں جاری جنگ کے اثرات اور نتائج کے حوالے سے بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

یہ امر انتہائی تشویش ناک ہے کہ حکومت اور عدالتوں کی جانب سے گرفتار افراد کی ممکنہ رہائی کے خوف یا خدشے کے باعث بے شمار گناہ گاروں کا عدالتی ٹرائل بھی نہیں ہو رہا اور سینکڑوں لوگوں کے مستقبل کے سامنے سوالیہ نشان لگ گیا ہے۔ صدر مملکت آصف علی زرداری نے تقریباً ایک برس قبل انسداد دہشت گردی کے قوانین میں بعض ترامیم کی تھیں تاکہ جو لوگ مجرم اور گناہ گار ہیں، وہ تفتیشی عمل میں رہ جانے والے بعض نقائص کے باعث سزا سے نہ بچ سکیں، تاہم حکومت اور عدلیہ کے مجاز حکام یا اداروں نے اس آرڈیننس کی منظوری کے باوجود اپنے طریقۂ تفتیش اور نظام کو فعال بنانے میں عملاً کوئی دلچسپی نہیں لی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے ان گرفتار افراد کو عدالتوں میں پیش کرنے سے گریزاں رہے جو کہ ریاست اور عوام کے خلاف کارروائیوں میں ملوث رہے ہیں۔ اس دوران بعض ایسے واقعات بھی رونما ہوتے رہے کہ عدالتوں نے قانونی نقائص کے باعث جب بعض افراد کو رہا کرنے کا حکم دیا تو خفیہ اداروں نے رہائی کے چند گھنٹے یا چند روز گزرنے کے بعد ہی ان افراد کو دوبارہ گرفتار کر لیا اور اب کی بار ان کو ایسے مقامات پر رکھا گیا

کہ ان کے رشتہ داروں کو بھی ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا کہ انہیں کہاں رکھا گیا ہے۔ ایسا اس لئے کیا جاتا رہا کہ رہا ہونے والے افراد کے بارے میں خفیہ اداروں کو پورا یقین تھا کہ وہ گناہگار ہیں اور انہوں نے حراست کے دوران اپنے جرائم کا اعتراف بھی کیا۔

تفتیشی اور عدالتی نظام میں موجود نقائص اور عدالتوں کی عدم دلچسپی نے اس صورتحال کو بہت پیچیدہ اور کسی حد تک خطرناک بھی بنا دیا ہے۔ ریاستی ادارے مسلسل لاپرواہی اور غیر ذمہ داری کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ حساس اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے مؤقف کو اس لئے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان کو اس بات کا بارہا تجربہ ہوتا رہا ہے کہ عدالتی ٹرائل کے نتیجے میں قانونی کمزوریوں یا نقائص کا فائدہ اٹھا کر بہت سے ملزم بھی رہا ہو جاتے ہیں اور یوں ریاستی اداروں کی محنت نہ صرف یہ کہ رائیگاں چلی جاتی ہے بلکہ یہ لوگ رہائی کے بعد پھر سے ریاست کے خلاف سرگرم عمل ہو جاتے ہیں۔ پشاور میں خفیہ اداروں نے متعدد ایسے افراد کو دہشت گردی کی نئی کارروائیوں کے بعد پھر سے مشکوک حالات میں گرفتار کر لیا، جن کو عدالتوں کی جانب سے رہائی ملی تھی۔ خفیہ ادارے اور پولیس اس صورتحال کو انتہائی تشویش اور ناراضگی کی نظر سے دیکھ رہے ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ باامر مجبوری بے شمار گناہگاروں اور ان کے ساتھ ہی بے گناہوں کو بھی عدالتوں کے سامنے پیش کرنے سے گریزاں ہیں۔ اس ضمن میں ایک اور افسوسناک امر یہ ہے کہ صوبے کی حکمران جماعت اے این پی بھی سوات میں اپنے اعلان کردہ عدالتی نظام کے قیام میں ٹال مٹول کا مظاہرہ کرتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے، محض یہ کہہ کر اپنی ذمہ داریوں اور فرائض سے جان نہیں چھڑائی جا سکتی کہ اب گیند اعلیٰ عدلیہ کی کورٹ میں ہے۔ اے این پی نے اگر سوات کے عوام سے کئے گئے اپنے وعدے کو عملی جامہ نہیں پہنایا اور تعمیر نو کے سلسلے کی رفتار تیز کرنے کے علاوہ اپنے اعلان کردہ عدالتی سیٹ اپ کو یقینی نہیں بنایا تو صورتحال نہ صرف یہ کہ بہت زیادہ خراب ہو جائے گی بلکہ آئندہ کے لئے سوات سمیت کسی بھی علاقے کے عوام سیاسی اور حکومتی وعدوں پر اعتماد نہیں کریں گے۔ ارباب اختیار کو لاپتہ افراد کے علاوہ حالیہ جنگ کے دوران گرفتار ہونے والے سینکڑوں مبینہ ملزموں کے بارے میں بھی ٹھوس اور فوری اقدامات کرنا ہوں گے۔ خفیہ ایجنسیوں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کو بھی اپنی پالیسی پر از سر نو غور کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ان

کو گرفتاریوں کے دوران اس بات کا خاص خیال رکھنا ہوگا کہ ٹھوس اسباب اور درست معلومات کی بجائے محض لوگوں کی شکایتوں کی بنیاد پر کسی بے گناہ کو گرفتار کرنے کا قدم نہ اٹھایا جائے۔ یہ شکایت بہت عام ہو رہی ہے کہ ریاستی ادارے محض لوگوں کی شکایات پر عام شہریوں کو طالبان کے حامی قرار دے کر گرفتار یا غائب کر دیتے ہیں۔ ان اداروں کو یہ بات ذہن میں رکھنی ہوگی کہ بے شمار پرامن شہری محض اس خوف اور دباؤ کے باعث طالبان کے حامی بن گئے تھے کہ ایسا نہ ہونے کی صورت میں ان کی زندگی خطرات سے دوچار ہو جاتی، چونکہ ایک سال تک سوات میں طالبان کی حکومت قائم تھی اور ریاست کا وجود ختم ہو چکا تھا۔ اس لئے لوگ مجبوری کے باعث طالبان کی حمایت کر رہے تھے۔

عدالتیں اپنی ذمہ داریاں پوری کریں؛

بے گناہ افراد کی گرفتاریوں سے جہاں فورسز اور دوسرے اداروں کی ساکھ متاثر ہو رہی ہے وہاں عوام کی جانب سے فورسز اور حکومت کے ساتھ تعاون کا سلسلہ بھی بری طرح متاثر ہو رہا ہے۔ اس حقیقت کا اب سب کو ادراک ہونا چاہئے کہ مالاکنڈ ڈویژن کے دو اضلاع بونیر اور سوات میں فورسز کے رویئے کے بارے میں عام لوگوں کی شکایات دن بدن بڑھتی جا رہی ہیں اور ان کا دوستانہ رویہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جارحانہ ہوتا جا رہا ہے۔ فورسز اور حکومت کی جانب سے سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کی پالیسی کے بہت خطرناک اور منفی نتائج برآمد ہو سکتے ہیں بلکہ برآمد ہونا شروع بھی ہو گئے ہیں۔ فورسز اور حکومت کی جانب سے غیر دوستانہ رویئے سے طالبان کی حمایت اور حکومت کی مخالفت میں اضافے کو نظر انداز کرنے کے بہت منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ ریاست کو طالبان کے خلاف کارروائیوں کے ساتھ ساتھ اپنے حامیوں کی تلاش کا سلسلہ بھی جاری رکھنا ہوگا اور یہ تب ممکن ہے جب فورسز کا امن پسند لوگوں کے ساتھ رویہ دوستانہ ہوگا اور حکومت تعمیر نو کے سلسلے کو شفاف اور تیز بنانے کی پالیسی پر عمل پیرا ہوگی۔ عدالتوں پر بھی غیر معمولی توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ عدالتی نظام میں موجود کمزوریوں، سست روی اور نقائص کو دور کر کے بے گناہ افراد کی باعزت رہائی کے عمل کو یقینی بنایا جا سکے اور مجرموں کو سزائیں دی جا سکیں۔ یہ وقت کا تقاضہ ہے کہ عدالتیں اپنی قانونی ذمہ داریاں پوری کریں۔

گرفتار حملہ آوروں کی رہائی، لمحۂ فکریہ

پولیس کے ناقص نظام تفتیش اور خفیہ اداروں کے مبہم طریقۂ کار کے باعث عدالتوں کی جانب سے گرفتار دہشت گرد جہاں قانونی اور عدالتی نقائص کا فائدہ اٹھا کر سزاؤں سے بچ جاتے ہیں وہاں ان کوتاہیوں کی وجہ سے سینکڑوں ان بے گناہ قیدیوں کے ساتھ بھی بے انصافی کی جا رہی ہے، جن کو شک یا طالبان کی حمایت کرنے پر گرفتار کیا جا چکا ہے۔ انتہائی قابل احترام آزاد عدلیہ کے معزز جج صاحبان کو حکمرانوں، مخالف سیاستدانوں اور بعض وکلاء نے این آر او اور 18ویں ترمیم جیسے معاملات میں اتنا الجھا دیا کہ عدلیہ کو انصاف کی فراہمی کی راہ میں حائل بعض نقائص اور رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے درکار اقدامات اٹھانے کی فرصت ہی نہیں مل سکی۔ انسداد دہشت گردی کی عدالتیں بھی ان گرفتار افراد کو رہا کرنے میں مصروف عمل رہی ہیں، جن کی جہادی وابستگی، عملی کارروائیاں اور خود ان کا اعتراف جرم بالکل واضح ہوتا ہے۔ یہ باعثِ حیرت اَمر ہے کہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کی جانب سے گرفتار ہونے والے ہزاروں افراد میں سے کسی ایک کو بھی اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود سخت ترین سزا نہیں ملی۔ یہی وجہ ہے کہ متعدد گرفتار خودکش حملہ آوروں نے بعض مواقع پر میڈیا سے گفتگو کرتے وقت بڑے اعتماد سے یہ کہہ کر سب کو حیرت زدہ کر دیا کہ وہ ہر حال میں جیل سے نکل کر دوبارہ اپنے ساتھیوں کے درمیان ہوں گے۔ ایسے ہی ایک حملہ آور کو جب اسلام آباد سے بارودی مواد کے ساتھ گرفتار کیا گیا تو خفیہ اداروں یا پولیس نے اسلام آباد میں پیشہ ورانہ خدمات انجام دینے والے پشاور کے ایک صحافی کے ساتھ ان کی بات چیت کا اہتمام کروایا۔ اس بات چیت کے دوران موصوف نے بڑے اعتماد سے آن دی ریکارڈ یہ کہا کہ اسے مکمل یقین ہے کہ وہ رہا ہو جائے گا اور جب رہا ہو جائے گا تو اپنے ساتھیوں کے پاس جا کر اپنے جہادی مقاصد کی تکمیل کے لئے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کرے گا۔

بے شمار کمانڈرز تو ایسے بھی ہیں جنہوں نے رہائی سے قبل بعض حملوں کی پیشگی ذمہ داریاں بھی قبول کیں اور میڈیا پر یہ کہتے ہوئے نظر آئے کہ فلاں واقعہ میں وہ یا ان کے فلاں فلاں ساتھی ملوث رہے ہیں۔ متعدد ایسے دہشت گرد بھی ریاستی اداروں کی تحویل میں ہیں جنہوں نے موبائل

فونز اور سیٹلائٹ رابطوں کے ذریعے اپنے ساتھیوں کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے یا تو کسی حملے کی ذمہ داری قبول کی یا کسی حملے کے احکامات جاری کر دیئے۔ مہذب دنیا میں ایسی ہدایات اور احکامات کو سنگین ترین جرائم کے زمرے میں شمار کر کے ملزموں کو گرفتاری کے بعد سخت ترین سزائیں دی جاتی ہیں، تاہم ہمارے نظام کی اہلیت اور طریقہ کار کا یہ عالم ہے کہ ہم نے ہنوز کسی گرفتار حملہ آور کو سزا نہیں دی۔ معزز جج صاحبان کے احترام میں کوئی بھی ایسا شخص گستاخی کی جرأت نہیں کر سکتا جو آزاد عدلیہ کا حامی ہو، تاہم اس حقیقت یا تاثر کو اس کے نتائج کے حوالے سے قطعاً نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیئے کہ عدلیہ کو عدالتی نظام میں موجود نقائص دور کرنے کے لئے اب ٹھوس حکمتِ عملی وضع کرنا پڑے گی جن کے باعث عوام سمیت وہ حلقے یا افراد بھی تشویش کا اظہار کر رہے ہیں، جو آزاد عدلیہ کے قیام میں مرکزی کردار ادا کرتے ہوئے بہت سی قربانیاں بھی دے چکے ہیں۔ کسی بھی مہذب اور ذمہ دار ملک میں انتظامیہ' مقنّنہ اور عدلیہ جیسے اہم ترین اداروں میں وقتاً فوقتاً اصلاحات کا عمل جاری رہتا ہے۔ بدقسمتی سے ہم نے بعض دوسرے اداروں کی طرح عدلیہ کو 'مقدس' تصور کرتے ہوئے اسے کوئی بھی تجویز دینے یا اس سے کسی بھی قسم کے مطالبے کو توہین عدالت کے زمرے میں شمار کر کے یہ سوچنے کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ عدلیہ بھی ہمارا ایک ادارہ ہے اور اگر قوم اس ادارے سے کچھ زیادہ بہتر کرنے کی توقع رکھتی ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عدلیہ درست سمت میں نہیں جا رہی یا ہم اس پر عدم اعتماد کا اظہار کرنے لگے ہیں۔ موجودہ اعلیٰ عدلیہ کے جج صاحبان کی کارکردگی کا یہ عالم ہے کہ وہ عام آدمی کے ساتھ کی گئی کسی زیادتی کا بھی اتنا سخت نوٹس لے لیتے ہیں کہ لوگوں کو نہ چاہتے ہوئے بھی داد دینا پڑتی ہے۔ اسی عدلیہ نے وکلاء تحریک کے سرخیل علی احمد کرد کے اس بیان کا کچھ برا نہیں منایا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ "لگتا ہے ہمارے جج صاحبان اخبارات پڑھ کر یا نیوز چینلز دیکھ کر فیصلے دے رہے ہوتے ہیں۔" یہ مثال بھی ریکارڈ پر موجود ہے کہ اعلیٰ عدلیہ کے جج صاحبان نے اس نازک دور میں بھی توہین عدالت سے متعلق بعض ایشوز کو سہواً نظر انداز کر دیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ عام شہری، عدلیہ اور جج صاحبان کے حوالے سے اظہارِ رائے اور مطالبہ کرنے کے حوالے سے توہین عدالت کے خوف کا شکار نہ ہوں۔ بدقسمتی سے یہ تاثر پاکستان میں بہت عام ہونے لگا ہے کہ آزاد عدلیہ دوسرے ریاستی ستونوں کی اہمیت' کردار یا کارکردگی پر اثر انداز ہونے کی کوشش کر رہی

ہے، حالانکہ گزشتہ کچھ عرصہ کے دوران دیکھا یہ گیا ہے کہ عدلیہ خصوصاً سپریم کورٹ نے بعض ریاستی اداروں اور حکومتی شخصیات کے غیر ذمہ دارانہ بیانات اور اقدامات کے باوجود میرٹ ہی کو بنیاد بنا کر اس قسم کے بیانات یا اقدامات کو عدلیہ کی انا کا مسئلہ نہیں بنایا۔ آزاد عدلیہ کے بعض حامیوں، میڈیا، حکومت مخالف سیاست دانوں اور سب سے بڑھ کر بعض نامور وکلاء کے باوجود میرٹ پر یقین رکھنے والی عدلیہ کو بعض مواقع پر تنقید کا نشانہ بننا پڑا ہے۔

اس حقیقت میں کوئی دو رائے نہیں کہ عدالتوں خصوصاً انسداد دہشت گردی کی عدالتوں سے دہشت گردی میں ملوث بے شمار افراد کی باعزت رہائی نے دوسرے متعلقہ ریاستی اداروں سمیت عام شہریوں کو بھی سخت تشویش اور خوف میں مبتلا کر رکھا ہے۔ وہ بجا طور پر یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہیں کہ ملزموں کو عدالتوں سے سزائیں کیوں نہیں دی جا رہیں۔ ان کا یہ کہنا بھی بجا ہے کہ اگر پولیس، فوج اور خفیہ اداروں نے درکار ثبوت اور شواہد حاصل نہیں کیے تھے، تو انہیں گرفتار افراد کو عدالتوں کے سامنے پیش کرنے کی جلدی ہی کیا تھی۔ یہ سوال بھی بلاجواز نہیں ہے کہ اگر پولیس اور دوسرے متعلقہ اداروں کے طریقہ کار اور تفتیش میں کمزوریاں اور نقائص ہیں تو ان کو دور کرنا کس کی ذمہ داری ہے۔ بعض حلقے یہ تجویز بھی دے رہے ہیں کہ عدلیہ خود ہی پولیس اور دوسرے متعلقہ اداروں کے نقائص اور کمزوریاں دور کرنے کے احکامات کیونکر جاری نہیں کرتی۔ پریڈ لین، میریٹ ہوٹل اور بعض دوسرے اہم ترین مقامات پر حملوں میں ملوث ملزم بھی ثبوتوں کی عدم فراہمی کی وجہ سے رہا کیے جا چکے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل جب ایک عدالت نے مناواں پولیس ٹریننگ سنٹر (لاہور) پر حملے میں ملوث مبینہ ملزم ہجرت اللہ کو باعزت رہا کر دیا تو امن پسند حلقوں میں ایک بار پھر تشویش کی لہر دوڑ گئی، کیونکہ عوام کا ایسی صورت میں ریاستی اداروں کی کارکردگی پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے اور وہ خود کو بے بس اور حملہ آوروں کے رحم و کرم پر تصور کرنے لگتے ہیں۔ اس فیصلے کی بازگشت پورے ملک میں اس شدت سے سنی گئی کہ لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس جناب خواجہ شریف (اب ریٹائر ہو چکے ہیں) نے اس رہائی کا سوموٹو ایکشن لیتے ہوئے آئی جی پنجاب سمیت دوسرے متعلقہ افراد کو عدالت کے روبرو پیش ہونے کا حکم دے دیا۔ اس سوموٹو ایکشن کو بارش کا پہلا قطرہ سمجھتے ہوئے اس کی زبردست ستائش کی گئی۔ جناب خواجہ شریف نے کہا ''عوام یہ سمجھنے لگے ہیں کہ عدالتیں دہشت گردوں کو سزائیں دینے میں ٹال مٹول کا مظاہرہ کر رہی

ہیں، حالانکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ عدالتیں ثبوت اور شواہد کی بنیاد پر طے شدہ طریقۂ کار کے مطابق فیصلے سناتی ہیں۔'' دیکھا جائے تو معزز چیف جسٹس کے ان ریمارکس کو کسی بھی طور پر اس مسئلے کی شدت اور اہمیت کے حوالے سے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح ایک عدالت نے اسلام آباد موٹروے سے گرفتار ایک ایسے شخص کو رہا کر دیا جو کہ طالبان مخالف ایک شخص کو اپنی گاڑی کی ڈگی میں ڈال کر اغواء کر رہا تھا۔ ملزم اس سے قبل پنجاب کے مختلف شہروں میں متعدد دوسری وارداتوں میں بھی ملوث رہا۔ موٹروے پولیس اور اسلام آباد پولیس نے موصوف کو گرفتار کر لیا اور جب اس کو عدالت کے روبرو پیش کیا گیا تو متعلقہ عدالت نے اس کو رہا کر دیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عدالتوں کو اگر گواہوں پر اعتماد نہیں اور ملزموں کے اعترافِ جرم کو بھی کافی نہیں سمجھا جاتا، تو پھر وہ کونسا طریقۂ کار یا لائحہ عمل ہو سکتا ہے جس پر عمل کر کے گرفتار حملہ آوروں کو سزا دلوائی جا سکتی ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے ساتھ پاکستان کی سلامتی جڑی ہوئی ہے اور اس کے حل کے بغیر ملک میں مستقل امن کے قیام کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

اگر پولیس کا تفتیشی طریقۂ کار درست نہیں ہے تو ضرورت اس اَمر کی ہے کہ اس مسئلے کے حل کے لئے ہنگامی طور پر لائحہ عمل تیار کیا جائے۔ اگر حکومت ایسا کرنے میں ٹال مٹول کا مظاہرہ کر رہی ہے تو آزاد اور باجرآت عدلیہ کو اس کا نوٹس لینا چاہئے۔ قانونی کمزوریوں یا نقائص کی آڑ میں پاکستان کی سلامتی کے لئے خطرہ بننے والے عناصر کی یوں رہائی کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ خواجہ شریف نے جس روز (20 جون، 2010ء) ہجرت اللہ خان کی رہائی کا سوموٹو ایکشن لیا۔ اسی روز صوبہ خیبر پختونخوا حکومت کے ترجمان میاں افتخار حسین بڑی شدت اور تکرار کے ساتھ عدالتوں سے دہشت گردوں کی رہائی کے عمل کو کھلی تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے نظر آئے۔ انہوں نے کہا کہ اس وقت 45 سو مبینہ ملزم حکومتی اداروں کی حراست میں ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ان گرفتاریوں کے مقاصد تب پورے ہوں گے جب ان افراد کو سزائیں دی جائیں گی۔ اگر عدالتیں انہیں رہا کر دیتی ہیں اور وہ دوبارہ عوام اور حکومت پر حملہ آور ہوتے ہیں تو ان کی گرفتاریوں اور ٹرائل کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میاں افتخار نے یہ بھی کہا کہ ان افراد کو کیسے رہا کیا جا سکتا ہے جو کہ حکومت کو انتہائی مطلوب رہے ہیں، انہوں نے سکول اور پل اڑائے ہیں اور انہوں نے لوگوں کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کرنے جیسے جرائم کئے ہیں اور دورانِ تفتیش اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ ان کے بیان سے یہی

نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ صوبہ پختونخوا کے حکمران عدالتوں سے حملہ آوروں کی رہائی کے عمل کو انتہائی تشویش کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔اس صورتحال کا دوسرا سنگین پہلوان گرفتار افراد کے بنیادی انسانی حقوق سے متعلق ہے،جن کو شک کی بنیاد پر گرفتار کر کے کئی مہینوں سے حراست میں رکھا گیا ہے۔یہ اَمر بھی قابل تشویش ہے کہ عدلیہ اور صوبائی ومرکزی حکومتیں شورش زدہ مالاکنڈ ڈویژن میں دارالقضاء اور دوسرے اعلان کردہ عدالتی اداروں کے قیام میں بھی ٹال مٹول اور حیلے بہانوں سے کام لے کر عوام کی مایوسی میں مزید اضافے کا راستہ ہموار کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔

اسی روز یعنی 20 جون (2010ء) کو چیف جسٹس خواجہ شریف کے سوموٹو نوٹس اور میاں افتخار حسین کے بیان کے علاوہ دو دوسرے واقعات یا بیانات سامنے آئے جن سے پریشان کن صورتحال کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اسی روز القاعدہ کے امریکی نژاد ترجمان آدم غزن کی ایک ویڈیو منظر عام پر آئی جس میں انہوں نے امریکہ کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ وہ تمام اسلامی ممالک سے اپنی افواج اور ساز وسامان فوری طور پر نکال لے۔ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ اگر امریکہ نے ایسا نہیں کیا تو پھر وہ سنگین نتائج کیلئے خود کو تیار رکھے۔دوسرا بیان سپاہ صحابہ کے ایک مرکزی رہنما کا سامنے آیا،جس میں انہوں نے الزام لگایا کہ پنجاب حکومت کے کئی اہم لوگوں کے علاوہ پی پی پی کے متعدد وزراء اور ایم این ایز بھی سپاہ صحابہ اور دوسری ہم خیال کالعدم تنظیموں کے ووٹوں اور حمایت سے کامیاب ہوئے۔اس ضمن میں انہوں نے متعدد وفاقی وصوبائی وزرا اور اراکین قومی و صوبائی اسمبلی کے نام بھی لئے۔سوال یہ ہے کہ اگر دہشت گردوں سے نمٹنے کیلئے کوئی واضح اور ٹھوس حکمت عملی وضع کرنے کی بجائے ہمارے حکمرانوں،سیاستدانوں اور ریاستی اداروں کی کارکردگی کا یہ عالم رہا تو پاکستان کا مستقبل کیا ہوگا؟ بعض حلقوں کی جانب سے اٹلی یا سپین کی طرز پر ایک محفوظ اور تیز رفتار عدالتی نظام کے قیام کی جو تجویز سامنے آئی ہے،اس پر بھی غور کی اشد ضرورت ہے۔

فرقہ وارانہ دہشت گردی کے نئے رجحان کا آغاز

25 جنوری 2011ء کے روز پاکستان کے دو بڑے شہروں لاہور اور کراچی کے علاوہ سات دوسرے علاقوں میں دہشت گردی اور انسداد دہشت گردی کی کارروائیوں کے دوران چالیس سے زائد افراد جاں بحق جبکہ 120 سے زائد زخمی ہو گئے۔ جاں بحق ہونے والوں میں پولیس اہلکاروں کے علاوہ مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے مختلف الخیال لوگ بھی شامل تھے۔ لاہور میں حضرت امام حسینؓ کے چہلم کے موقع پر نکالے گئے جلوس کو خودکش حملے کا نشانہ بنایا گیا جس کے نتیجے میں 12 افراد جاں بحق ہو گئے جبکہ 80 سے زائد زخمی ہوئے۔ اگر پولیس اہلکاروں نے حملہ آور کو جلوس میں گھسنے کا موقع فراہم کیا ہوتا تو ہلاکتوں کی تعداد سینکڑوں میں ہو سکتی تھی۔ لاہور کے برعکس کراچی میں ایسے ہی ایک جلوس کو پہلے سے نصب شدہ بم کے ذریعے نشانہ بنایا گیا جس میں چار افراد جاں بحق اور 12 زخمی ہوئے۔ باعثِ حیرت اَمر یہ ہے کہ ملک کے دو بڑے شہروں میں ہائی الرٹ سکیورٹی کے ہوتے ہوئے ایک ہی گھنٹہ کے اندر یہ کارروائیاں کی گئیں، حالانکہ تمام بڑے شہروں میں اس قسم کی کارروائیوں کے بارے میں انٹیلی جنس ایجنسیوں کی جانب سے پہلے ہی سے یقینی اطلاعات موجود تھیں۔

کراچی پولیس کی نااہلی اور انٹیلی جنس نظام کی ناکامی قدم قدم پر محسوس کی جاتی رہی۔ ابتداء میں اس واقعہ کو خودکش حملہ قرار دیا گیا، لیکن ایک گھنٹہ بعد ہی یہ کہا گیا کہ بم پہلے سے نصب کیا گیا تھا۔ اسی دوران یہ بھی بتایا گیا کہ پولیس کو خودکش حملہ آور کا سر مل گیا ہے، تاہم دو تین گھنٹے بعد تردید کرتے ہوئے کہا گیا کہ ملنے والا سر خودکش حملہ آور کا نہیں ہے بلکہ ڈیوٹی پر مامور ایک پولیس اہلکار کا تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ تینوں دعوے عام لوگوں کی جانب سے نہیں کئے گئے بلکہ یہ بیانات اعلیٰ ترین پولیس افسران کی طرف سے کئے گئے۔ اس سے یہ اندازہ لگانا کوئی مشکل کام نہیں رہتا کہ کراچی پولیس اور انٹیلی جنس اداروں کی کارکردگی اور اہلیت میں حکومتی دعوؤں کے برعکس عملاً کوئی بہتری نہیں آئی۔ دونوں بڑے شہروں میں اس قسم کے واقعات کی پیشگی اطلاعات کے ہوتے ہوئے حملہ آوروں کا پولیس اور رینجرز کی ناکہ بندیوں کے باوجود اپنے اہداف تک پہنچنا

متعلقہ اداروں کی کارکردگی کے حوالے سے ایک بار پھر اپنے پیچھے بہت سے سوالات چھوڑ گیا ہے۔ اس کے باوجود وزیر داخلہ رحمان ملک نے فوری طور پر یہ بیان داغنے میں کوئی دیر نہیں لگائی کہ دونوں واقعات کی روک تھام میں متعلقہ اداروں سے کوئی کوتاہی سرزد نہیں ہوئی ہے۔

ایک تحقیقی رپورٹ کے مطابق گزشتہ اٹھارہ ماہ کے عرصہ میں مذہبی اجتماعات' مقامات اور جلوسوں کو چوبیس بار نشانہ بنایا جا چکا ہے۔ اگر ان اعداد و شمار کی روشنی میں واقعات کی شرح کا تناسب نکالا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ ہر مہینے کے دوران دو یا کم از کم ایک ایسا سانحہ ضرور رونما ہوتا رہا ہے۔ ان واقعات کے دوران ملک کے تمام بڑے شہروں کے علاوہ ملک کے 19 دوسرے علاقوں کو بھی نشانہ بنایا گیا۔ یاد رہے کہ دہشت گردی کے ان واقعات میں صرف مذہبی گروہوں یا اجتماعات کو نشانہ بنایا گیا اور ان میں دہشت گردی کی دوسری کارروائیاں شامل نہیں ہیں۔ ان 24 واقعات کے دوران صرف شیعہ مسلک کے جلوسوں اور اجتماعات کو گیارہ بار نشانہ بنایا گیا۔ ان حملوں میں ایک محتاط اندازے کے مطابق 680 افراد جاں بحق جبکہ 1100 سے زائد زخمی ہو چکے ہیں۔ اگر ان ہلاکتوں کا تجزیہ کیا جائے تو ثابت یہ ہوتا ہے کہ سال 2010ء اور 2011ء کے ابتدائی ہفتوں کے دوران فرقہ ورانہ دہشت گردی کے واقعات کی تعداد بڑھی۔ یہ صورتحال ایک اور خطرناک رجحان کی نشاندہی کرتی ہے کہ چاروں صوبوں اور فاٹا کی تمام ایجنسیوں کو دہشت گرد حملوں کا نشانہ بنایا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ملک کے چار انتظامی یونٹوں میں سے کوئی ایک بھی ان حملوں سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ شیعہ مسلک اور بریلویوں کے خلاف حملوں کی شرح زیادہ رہی، جبکہ ان 16 ماہ کے دوران ملک کے مختلف علاقوں خصوصاً سندھ اور پنجاب میں اولیاء کے چھ مزارات پر بھی حملے کئے گئے۔ یہ اَمر باعثِ تشویش ہے کہ دہشت گردی کی ان کارروائیوں میں سے بیشتر خودکش حملے تھے۔ اس ضمن میں یہ تناسب 70 فیصد رہا جو کہ اس جانب ایک واضح اشارہ ہے کہ حملہ آور قوتوں کے پاس تمام تر حکومتی کارروائیوں اور دعوؤں کے باوجود خودکش حملہ آوروں کی اب بھی ایک مؤثر کھیپ موجود ہے اور اس سے بھی زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ حملہ آور ملک کے چاروں صوبوں میں سرگرم عمل ہیں۔ اس ضمن میں کراچی میں غازی عبداللہؒ، پاک پتن میں بابا غلام فریدؒ، لاہور میں احمدیوں کی عبادت گاہ' سرفراز نعیمی کی شہادت، کراچی میں گزشتہ برس جنوری میں فقہ جعفریہ کے جلوس اور وزیر اعلیٰ بلوچستان پر حال ہی میں کئے گئے حملے کی مثالیں دی جا سکتی

ہیں، یہ سب خودکش حملے ہی تھے (اس میں پختونخوا اور فاٹا کے ایسے حملے شامل نہیں ہیں)۔ جس روز کراچی اور لاہور کے واقعات ہوئے اس روز تیمر گرہ میں اے این پی کے مرکزی ترجمان سینیٹر زاہد خان کے حجرے پر بھی حملہ کیا گیا جس میں ان کے ایک ساتھی موقع پر ہی جاں بحق جبکہ ان کے بھائی سمیت پانچ افراد شدید زخمی ہوگئے۔ زاہد خان کے اسی حجرے کو سال 2009ء کے اوائل میں بھی بم حملے کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ تیمر گرہ میں ان کے گھر کو جس وقت منظم حملے کا نشانہ بنایا گیا، اس وقت کور کمانڈر پشاور جائے وقوعہ سے کچھ ہی فاصلے پر سوات کے ایک علاقے میں منعقدہ تقریب سے خطاب کر رہے تھے اور وہ سوات آپریشن کی کامیابی کے اعلان کے علاوہ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ دہشت گردوں پر حال ہی میں قائم کی گئی دارالقضاء میں دہشت گردی کے مقدمات چلائے جائیں گے۔

25 جنوری 2011ء ہی کے روز ادیزئی امن کمیٹی کے سربراہ کو پشاور میں قتل کیا گیا۔ اس سے قبل ان کے والد عبدالمالک کو بھی 2010 میں خودکش حملے کے دوران نشانہ بنایا گیا تھا۔ اسی روز پاکستان ایئر فورس کے جیٹ طیاروں اور پاک آرمی کے ہیلی کاپٹروں نے مہمند ایجنسی میں شدت پسندوں کے مبینہ ٹھکانوں پر حملے کر کے 20 شدت پسندوں کی ہلاکت اور متعدد کی گرفتاریوں کا دعویٰ کیا، تاہم مقامی لوگوں کو یہ کہتے ہوئے بھی سنا گیا کہ اس بمباری کے دوران متعدد بے گناہ لوگ بھی زد میں آئے، جبکہ ایسے ہی ایک اور واقعہ میں مہمند ایجنسی ہی کے ایک اور علاقے میں گھر پر مارٹر گولہ گرنے کے باعث چھ افراد جاں بحق ہوگئے، ان میں خواتین اور بچے بھی شامل تھے۔ اگر ان چند واقعات کے مجموعی اعداد و شمار مرتب کیے جائیں تو ثابت یہ ہوتا ہے کہ صرف ایک ہی روز کے دوران عام شہریوں سمیت 40 افراد ہلاک ہوگئے۔ اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ شدت پسند کسی بھی فریق کو کسی بھی علاقے اور شہر میں نشانہ بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ اَمر بھی ثابت ہوگیا ہے کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے اس صورتحال سے نمٹنے کی صلاحیت سے محروم ہیں جبکہ انٹیلی جنس کا نظام بھی پہلے کی نسبت بہتر ہوتا ہوا دکھائی نہیں دے رہا۔ ان واقعات سے یہ بھی عیاں ہوا کہ حملہ آوروں کی شیعہ مسلک کے حوالے سے پالیسی واضح ہے اور وہ انہیں کوئی رعایت دینے پر تیار نہیں ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو دو برسوں کے دوران شیعہ مسلک کے اجتماعات اور جلوسوں کو گیارہ بار نشانہ نہ بنایا جاتا۔ اب تک کے حملوں سے جو ترتیب سامنے آتی ہے، اس کے

مطابق حملہ آور جن قوتوں کو نشانہ بنانے کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں، ان میں شیعہ اور بریلوی مسلک کے پیروکار، قادیانیوں کی عبادت گاہیں' اولیاء کی درگاہیں اور مزارات' اے این پی کے رہنما' پولیس اور فورسز کے لوگ شامل ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ حملہ آوروں کی نظر میں ان کا کوئی بھی نظریاتی مخالف کسی بھی رعایت کا مستحق نہیں تو غلط نہیں ہوگا۔

سال 09-2008ء کے مقابلے میں 011-2010ء میں شدت پسندوں نے اپنے فرقہ ورانہ مخالفین کو کچھ زیادہ ہی نشانہ بنایا ہے اور پنجاب اور سندھ میں اس نوعیت کی دہشت گردی کی کارروائیاں زیادہ ہوئی ہیں، کیونکہ فاٹا اور خیبر پختونخوا کے مقابلے میں ان صوبوں میں فرقہ ورانہ تقسیم زیادہ ہے۔ تجزیہ کاروں کے مطابق اس رجحان میں اس لئے بھی اضافہ ہوا ہے، کیونکہ حملہ آور گروہوں کی قیادت پر بیت اللہ محسود' قاری حسین اور دوسرے پشتون کمانڈروں کے جاں بحق ہونے کے بعد ان پنجابی گروہوں کا اثر خاصا بڑھ گیا ہے جو کہ اس سے قبل پنجاب اور کشمیر میں اپنے قیام کے دوران ایسی کارروائیوں کے زبردست حامی رہے ہیں۔ مبصرین کے مطابق جنوبی وزیرستان اور مالاکنڈ آپریشن کے باعث اس قسم کے گروہوں نے پناہ کی تلاش میں شہروں کا رخ کیا، یوں یہ لوگ پورے ملک میں پھیل گئے اور اب وہ اپنے مخالفین اور فورسز کو ایک ترتیب کے ساتھ حملوں کا نشانہ بنانے میں مصروف ہیں۔ فاٹا میں ڈرون حملوں اور فورسز کی کارروائیوں کو بھی ان شدت پسندوں کے لئے بڑا مسئلہ قرار دیا جا رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ نسبتاً زیادہ محفوظ علاقوں کی طرف راہِ فرار اختیار کر گئے یا کر رہے ہیں۔ 25 جنوری کے واقعات اور بعض دوسری کارروائیوں کے باوجود سیاسی اور مذہبی جماعتوں کی اعلیٰ قیادت کے درمیان اس بنیادی مسئلے پر کوئی اتفاق رائے دیکھنے کو نہیں ملا۔ سابق جرنیلوں اور طالبان کے حامی اپنے تاثرات کے دوران ان حملوں کو حسب معمول افغانستان میں غیر ملکی افواج کی موجودگی اور پاکستان کی وار آن ٹیرر میں شمولیت کا نتیجہ قرار دیتے رہے، جبکہ متعدد ایسے تھے جنہوں نے ان واقعات کو بلیک واٹر' بھارت' سی آئی اے اور دوسری پاکستان دشمن قوتوں کی کارستانی قرار دیا، حالانکہ حملوں کے کچھ ہی دیر بعد تحریک طالبان پاکستان ان واقعات کی ذمہ داری قبول کر چکی تھی۔ جنرل (ر) حمید گل ' بریگیڈیئر (ر) امتیاز احمد' سید منور حسن' رستم شاہ مہمند اور دیگر رُجعت پسند حلقے اسی مؤقف کو دہراتے ہوئے نظر آئے، جبکہ اکرام سہگل' سلیم صافی' رحیم اللہ یوسفزئی' میاں افتخار حسین' خوش

بخت شجاعت اور صاحبزادہ فضل کریم کے علاوہ بہت سے جید علمائے کرام، سیاسی رہنماؤں اور ماہرین نے تحریکِ طالبان پاکستان اور اس کے اتحادی گروہوں کی طرف سے ذمہ داری قبول کیے جانے کے باعث سیاسی قیادت اور ریاستی اداروں کی کارکردگی کے حوالے سے سوال اٹھائے۔ سب سے دلچسپ تبصرہ اور مؤقف پنجاب کے وزیر قانون رانا ثناء اللہ کا سامنے آیا، ان کا کہنا تھا کہ پنجاب میں اس قسم کی تنظیموں کا کوئی وجود نہیں ہے اور یہ لوگ وزیرستان سے تربیت حاصل کرنے کے بعد لاہور اور دوسرے شہروں پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ ان کا دعویٰ تھا کہ شمالی وزیرستان میں اب بھی ایسی تنظیموں کے ایک درجن کے قریب تربیتی کیمپ موجود ہیں اور ان میں کشمیری کمانڈروں الیاس کشمیری (امریکی ڈرون حملے میں ہلاک ہو چکا ہے) اور عصمت اللہ معاویہ کے گروہ بھی شامل ہیں۔ رانا ثناء اللہ کا کہنا تھا کہ ان کیمپوں میں صرف پنجابی طالبان ہی نہیں ہیں بلکہ یہاں پر سندھی، کشمیری، برمی، بنگلہ دیشی اور دوسری اقوام کے طالبان بھی شامل ہیں۔

ان رہنماؤں اور تجزیہ کاروں کے علاوہ دوسری پارٹیوں کے رہنماؤں نے ان حملوں پر تبصرہ کرنے سے گریز ہی کا راستہ اپنایا بلکہ زیادہ تر نیوز چینلز پر ایم کیو ایم اور مسلم لیگ (ن) کے رہنما حسبِ معمول ایک دوسرے کے خلاف مورچہ زن دکھائی دیئے۔ اس رجحان یا ردعمل سے ایک بار پھر یہ ثابت ہو گیا کہ پاکستان کے سیاسی، مذہبی، ریاستی اور صحافتی حلقوں کے درمیان اس صورتحال کے بارے میں نہ صرف یہ کہ حسب معمول ہم آہنگی کا فقدان موجود ہے بلکہ وہ ایک دوسرے کے دلائل، مؤقف یا جواز کو محض سیاسی وابستگی کی بنیاد پر مسترد کرنے اور ایک دوسرے پر الزام تراشی کرنے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کرتے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس سنگین مسئلے پر پاکستانی معاشرہ متعدد گروہوں میں تقسیم ہو کر ابہام کا شکار ہے۔ وہ قوتیں اس صورتحال کا بہت آسانی کے ساتھ فائدہ اٹھاتی ہیں جو کہ ایک مضبوط فکری اور نظریاتی بنیاد کے باعث اس قسم کی کارروائیاں نہ صرف یہ کہ ضروری اور جائز سمجھ رہی ہیں بلکہ وہ ایسا کرنے کی بوجوہ بھرپور صلاحیت بھی رکھتی ہیں۔

پشتونوں کی تباہی، ان کا مقدمہ اور بڑھتی ناامیدی

اس حقیقت کو کوئی بھی باشعور اور تاریخ پر نظر رکھنے والا شخص جھٹلا نہیں سکتا کہ دنیا اور خطے کی تاریخ میں پشتون قوم اپنی سیاسی، جغرافیائی اور ثقافتی اہمیت کے باعث ہر دور میں نہ صرف زیر بحث رہی ہے بلکہ اس قوم نے عروج وزوال کے وہ ادوار بھی دیکھے ہیں جن کی مثالیں دوسری اقوام کی تاریخ میں بہت کم ملتی ہیں۔ گزشتہ پچاس سال کے ہنگامہ خیز دور میں پشتون قوم کے کردار کا 80ء کی دہائی میں عالمی سطح پر اس وقت نوٹس لیا گیا جب روس کے مقابلے کیلئے امریکہ کی قیادت میں آدھی دنیا کے ممالک نے پاکستان اور افغانستان کا رخ کر کے اس کشیدگی اور جنگ کی بنیاد رکھی، جس کے نتائج تین دہائیاں گزرنے کے باوجود ان دو بدقسمت ممالک کے عوام ابھی تک بھگت رہے ہیں اور مستقبل میں بعض حلقے اسی پس منظر کے تناظر میں تیسری عالمی جنگ کا خدشہ بھی ظاہر کر رہے ہیں۔ نائن الیون کے واقعہ نے تو پشتونوں کو دنیا کے سامنے کچھ ایسے انداز میں متعارف کروایا کہ سب کی نظریں چاہتے اور نہ چاہتے ہوئے اس قوم پر مرکوز ہو گئیں۔ وکی لیکس کے جاری انکشافات میں یہ بھی بتایا گیا کہ پاکستان میں موجود پشتون اس ریاست کے ساتھ اپنے تعلقات کار پر بوجوہ نظر ثانی کر سکتے ہیں۔ اس پس منظر میں بعض وہ اسباب بھی بیان کئے گئے ہیں جن کے باعث پشتون پاکستان سے الگ ہو سکتے ہیں۔ اس بات پر بحث سے قطع نظر کہ زمینی حقائق کیا ہیں اور یہ خدشہ کس حد تک درست ثابت ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈیورنڈ لائن کے اطراف میں آباد چار کروڑ سے زائد پشتون گزشتہ پچاس سال سے دونوں ممالک کے حکمرانوں کے رویوں اور پالیسیوں کے علاوہ عالمی قوتوں کی مداخلت اور سازشوں سے بھی نہ صرف واقعتاً بہت تنگ آ گئے ہیں، بلکہ ان کو اپنا مستقبل بھی تاریک نظر آ رہا ہے۔ اس قوم کے ساتھ زیادتیوں کا سلسلہ محض پاکستان تک محدود نہیں ہے، بلکہ افغانستان میں بھی ان کو سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی امتیازات کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے۔ افغانستان کے زیادہ تر پشتون حکمرانوں کا طرز عمل بھی پاکستان کے پشتون حکمرانوں ایوب خان اور غلام اسحاق خان جیسے لوگوں سے مختلف نہیں رہا۔ اس بدنصیب قوم کی جغرافیائی تقسیم کو ایک مستقل پالیسی کے تحت انگریز دور حکومت میں کچھ ایسا پیچیدہ رکھا گیا کہ وہ دو

ممالک اور پانچ مختلف انتظامی یونٹوں میں تقسیم ہو گئے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے مشترکہ مسائل اور ایشوز کے باوجود ان کا عوامی اور سیاسی سطح پر کوئی بھی مستقل اور موثر رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ افغانستان کے پشتونوں کو اکثریت حاصل ہونے کے باوجود اقتدار اور اختیارات سے الگ رکھا گیا جبکہ 80ء اور 2000ء کی دہائیوں میں لڑی جانے والی جنگیں بھی ایک فارمولے کے تحت پشتونوں ہی کے علاقوں میں لڑی گئیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پشتون علاقے تین دہائیوں کا عرصہ گزرنے کے باوجود عملاً میدان جنگ ہی کا نقشہ پیش کرتے دکھائی دے رہے ہیں جبکہ دوسرے علاقے (نان پشتون) نہ صرف پرامن ہیں بلکہ محفوظ، متحد اور نسبتاً ترقی یافتہ بھی ہیں۔ افغانستان کی ستر فیصد آبادی کی زبان یعنی پشتو کے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا رہا جو پاکستان میں اس زبان یا ایسی دوسری زبانوں کے ساتھ روا رکھا گیا۔

افغانستان میں لگائی گئی آگ جب ڈیورنڈ لائن عبور کر کے پاکستان میں داخل ہونے لگی تو یہاں بھی حسب توقع اس سے سب سے زیادہ جو آبادی متاثر ہوئی، وہ پشتونوں کی تھی۔ فاٹا اور اس کے بعد پختونخوا میں ملکی تاریخ کی بدترین گوریلا جنگ کا آغاز کچھ اس انداز سے ہوا کہ اب یہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ فاٹا اور پختونخوا کے بعد بلوچستان کے جن علاقوں کو ان حالات میں خطرناک قرار دیا گیا، بدقسمتی سے وہ علاقے بھی پشتونوں ہی کے ہیں۔ اس ضمن میں کوئٹہ کی مثال دی جاسکتی ہے جس کی 68 فیصد آبادی پشتونوں پر مشتمل ہے اور کچھ عرصہ سے کوئٹہ شوریٰ کی موجودگی کے بہانے اس شہر کو بھی ڈرون حملوں کا نشانہ بنانے کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ صرف فاٹا، پختونخوا، افغانستان اور بلوچستان کے پشتون علاقوں پر ہی جنگ مسلط نہیں کی گئی بلکہ پشتونوں کا سب سے بڑا شہر کراچی بھی محفوظ نہیں رہ سکا۔ نیویارک ٹائمز کی ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق کراچی میں پشتونوں کی تعداد 42 لاکھ سے تجاوز کر گئی ہے اور یہ تعداد دوسری قومیتوں کی بہ نسبت غیر معمولی رفتار اور شرح سے بڑھ رہی ہے۔ رپورٹ کے مطابق صرف 10-2009ء کے دوران کراچی میں 1000 سے زائد پشتونوں کو قوم پرستی اور طالبانائزیشن کی آڑ میں ہلاک کیا جا چکا ہے۔ اسی طرح بلوچستان جیسے صوبے میں بھی پشتونوں کی آبادی کی شرح 42 فیصد ہے، یعنی آبادی کے تناسب سے اس صوبے میں پشتون ہی سب سے زیادہ تعداد میں آباد ہیں۔ صوبے کے بڑے شہروں یعنی کوئٹہ، زیارت، لورالائی، قلعہ سیف اللہ اور ژوب پشتونوں ہی کے شہر مانے اور کہے

جاتے ہیں۔ اس کے باوجود بلوچستان کی اس اکثریتی آبادی کے ایشوز، مسائل اور حقوق کے بارے میں وہ آواز نہیں اٹھائی جاتی، جس کی ضرورت ہے۔ ایسی ہی صورتحال اہم ترین جغرافیائی علاقے یعنی فاٹا کی بھی ہے۔ اس علاقے کو عالمی اور علاقائی متحارب قوتوں نے اکھاڑے میں تبدیل کر کے چالیس لاکھ سے زائد قبائلیوں کو اپنی ہی سرزمین پر مختلف حیلوں بہانوں سے نہ صرف یرغمال بنایا ہوا ہے بلکہ ان کی نسل کشی سے بھی گریز نہیں کیا جا رہا ہے۔ اس بفرزون کو ایک مستقل وارزون میں تبدیل کر کے اس کے مستقبل پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ اس بدترین صورتحال کے باوجود اس علاقے کے حالات کی بہتری کیلئے ریاستی اور سیاسی سطح پر عملاً کچھ نہیں کیا جا رہا اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا دکھائی دے رہا ہے کہ کشیدگی، سازش یا لڑائیوں سے برسر پیکار چالیس لاکھ سے زائد قبائلی عوام کے صبر کا پیمانہ کسی بھی وقت لبریز ہو کر کوئی اور راستہ اختیار کر سکتا ہے۔ اس صورتحال کا سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اس تمام صورتحال اور بدبختی کے باوجود ڈیورنڈ لائن کے اطراف میں ایسی کوئی قومی یا سیاسی قیادت نظر نہیں آ رہی جو اس قوم کو اس کا باعزت، پرامن اور محفوظ مستقبل دلانے کی قوت، سوچ یا صلاحیت رکھتی ہو۔ حال ہی میں پام کے زیر اہتمام پشتونوں کے ایشوز یعنی دہشت گردی اور ٹارگٹ کلنگ کے موضوع پر پشاور میں منعقدہ ایک سیمینار کے دوران محمد افضل خان لالہ، فرید طوفان، لطیف آفریدی، ڈاکٹر سید عالم محسود اور دیگر مقررین کے علاوہ جب اس طالب علم کو بھی بات کرنے کا موقع دیا گیا تو ہم نے عوام کی ترجمانی اور حالات کی عکاسی کرتے ہوئے تبصرہ کرنے کی بجائے ان اہم لوگوں سے کچھ اس قسم کے سوالات کیئے۔ (1) یہ نوبت کس نے اور کیوں آنے دی کہ پشتون عالمی امن کیلئے خطرہ قرار دے دیئے گئے؟ (2) پشتونوں کو بدنام کرنے اور ان کے قتل عام کی وجہ یہ تو نہیں کہ مخلص اور باعمل قیادت کا فقدان ہے؟ (3) مسجد اور حجرہ کے درمیان فاصلے کس نے پیدا کیئے؟ (4) پشاور اور کوئٹہ کی پشتون قیادت کابل اور کراچی کے معاملات سے لاتعلق کیوں ہیں؟ (5) اس کی کیا وجہ ہے کہ پشتون قیادت اقتدار کے بعد اپنی سیاست سے دور ہو جاتی ہے؟ (6) کیا مستقبل میں حالات میں بہتری کی کوئی امید ہے؟ اکثر شرکاء نے ان سوالات پر اپنے انداز میں اظہار خیال کیا، تاہم دو سو کے لگ بھگ صائب الرائے لوگ حالات پر انتہائی پریشان اور مایوس تھے اور کسی حد تک ناامید بھی۔ ہو بہو یہی کیفیت فاٹا، کوئٹہ، کابل اور کراچی کے پختونوں میں بھی پائی جاتی ہے۔

غلطیوں سے سبق سیکھنے کا موقع

کوئی مانے یا نہ مانے مگر حقیقت یہی ہے کہ سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد دنیا میں وہی کچھ ہوتا رہا جو امریکہ نے چاہا۔ امریکہ کو مظالم یاد دلانے یا اس کی جانب سے انسانی حقوق کی یقین دہانیوں سے امریکہ کے جارحانہ پن میں کمی آنے کا بظاہر کوئی امکان نظر نہیں آتا، کیونکہ امریکہ طاقت کی زبان سمجھنے والا ملک ہے اور اس وقت دنیا میں ایسا کوئی ملک نہیں ہے جو عملی طور پر اس سپر پاور کی جارحیت روک سکے۔ ایبٹ آباد کے افسوس ناک واقعہ (اسامہ بن لادن کی ہلاکت) کے بعد لوگ کمنٹس دینے کیلئے بھی دستیاب نہیں ہیں، جن کا دعویٰ رہا ہے کہ سوویت یونین کو ہم نے توڑا ہے اور ہم دیگر ریاستوں کو بھی توڑنے کا جذبہ اور صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ حضرات بھی نظر نہیں آ رہے جو اسامہ بن لادن اور اس قبیل کے دوسرے لوگوں کو مسلمانوں کا ہیرو سمجھتے رہے۔ ان میں سے بعض نے 2 مئی کے بعد بن لادن کو سی آئی اے کا ایجنٹ اور پاکستان کا دشمن قرار دینا شروع کر دیا۔ اس حوالے سے بھی کوئی تمیز نہیں کی جا رہی کہ ایجنٹ ہونے اور کسی مشترکہ ہدف کے حصول کیلئے اتحادی بننے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ کسی ثبوت اور ٹھوس جواز کے بغیر اسامہ بن لادن کو سی آئی اے کا ایجنٹ قرار دینا قطعاً مناسب رویہ نہیں ہے۔ اگر پاکستان واقعی اسلام کا قلعہ تھا یا ہے تو بن لادن جیسے لوگوں کو اس قلعے میں آنے یا سرگرمیاں شروع کرنے سے روکنا بھی ایک نامناسب رویہ ہے۔ اس فارمولے کے تحت تو ہر مسلمان کو کسی بھی جواز کی آڑ میں یہاں رہنے کی اجازت مل جانی چاہیے اور عملاً یہ اجازت ملتی بھی رہی ہے۔ جس فارمولے کی ہم برسوں تک تشہیر کرتے رہے، اس کے مطابق تو پاکستان نے ایسے عناصر کیلئے جنت بننا ہی تھا۔ ہم نصاب میں بھی یہی پڑھاتے رہے کہ پاکستان پوری دنیا کے مسلمانوں کیلئے جائے پناہ ہے اور ایسا کہتے اور لکھتے وقت ہم نے لفظ مسلمان استعمال کیا تھا، پاکستانی نہیں۔ ایسے میں غیر ملکیوں کی پاکستان میں آمد اور جائے پناہ حاصل کرنا کونسی معیوب اور حیرت کی بات ہے۔ امریکہ بھی تو ہمارا قریبی دوست اور اتحادی رہا ہے۔ اب یہ ہماری بدقسمتی ہی کہلائے گی کہ ہم تین اطراف سے نرغے اور عالمی برادری کے محاصرے میں آ گئے ہیں۔ دوسروں کی فکر میں مرے جانے کی ہماری

قومی پالیسی نے آج ہماری اپنی ساکھ، سلامتی اور مستقبل پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ امریکہ جو کچھ کر رہا ہے، وہ بھی ہمارے اعمال کا نتیجہ ہے۔ اس میں حیرت کی بات ہی کیا ہے، یہ سب کچھ تو دیوار پر لکھی تحریر کی طرح صاف نظر آ رہا تھا۔ آپ کتنے عرصے تک محض خواہشات، مفروضوں، چالاکیوں اور جھوٹ کے سہارے دوسروں کو دھوکہ دے سکتے ہیں۔ ہمارے کئے کا جو نتیجہ نکلنا تھا، وہ ہمارے سامنے ہے۔

ایبٹ آباد میں امریکی آپریشن کے بعد پاکستان کے سیکرٹری خارجہ سلمان بشیر نے کہا کہ اگر آئندہ ایسی کارروائی ہوئی تو بدترین نتائج برآمد ہوں گے۔ جنرل کیانی نے بھی یہی الفاظ ادا کئے، تاہم اس کا کیا کیا جائے کہ سلمان بشیر کے بیان کے فوراً بعد جان کیری نے بہت سی خطرناک باتوں کے علاوہ یہ بھی کہا کہ القاعدہ کے دوسرے اہم رہنما ایمن الظواہری بھی پاکستان میں ہو سکتے ہیں۔ دوسرے حکام نے کہا کہ اگر پاکستان میں ایسے کسی دوسرے شخص کی نشاندہی ہوئی تو دومئی والی کارروائی ایک بار پھر ہوگی۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جس ایٹم بم کو ہم اسلامی بم قرار دیتے رہے، آج بعض حلقوں کو اس کی حفاظت کی فکر لگی ہوئی ہے۔ کل کو ایمن الظواہری پاکستان میں چھپا ہوگا یا ملا عمر یہاں ہوں گے یا داؤد ابراہیم کی نشاندہی ہوگی تو امریکہ پھر سے ایسی ہی کارروائی کرے گا۔ بدترین نتائج یا جوابی کارروائی کے دعوے کس طرح پورے ہوں گے، اس کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے۔ ہم دعوے کرتے رہیں گے اور دوسرے عملی کارروائی کر کے ہمارے لئے شرمندگی اور ناکامی کے داغ چھوڑ کر دومئی کی طرح سرحد پار کر جائیں گے۔ وہ سابق افسران جو آج پاکستان کو عملی مزاحمت نہ کرنے کے طعنے دیتے نظر آ رہے ہیں، ان میں سے ستر فیصد وہ ہیں جنہوں نے ملا عمر کو بھی نائن الیون کے بعد ڈٹے رہنے اور اور مزاحمت کے مشورے دیئے تھے۔ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے آن دی ریکارڈ یہ بھی کہا تھا کہ صدام حسین کی فوج، فضائیہ اور سب سے بڑھ کر نیشنل گارڈز زمین پر اترنے والے امریکی فوجیوں کو زندہ چبا ڈالیں گے، مگر جب امریکی فوج عراق میں داخل ہوئی تو نہ فضائیہ اور نہ نیشنل گارڈز حرکت میں آئے اور نہ ہی صدام حسین اپنی حکومت اور زندگی کو بچانے میں کامیاب ہو سکے۔ اب یہ لوگ ہی پاکستان کو عملی مزاحمت یعنی جنگ پر اکسانے میں مصروف ہیں۔ ان کی مثال نادان دوستوں کی ہے اور ان سے بچنے میں ہی پاکستان

کا فائدہ ہے۔ آج ہمارے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے، یہ لوگ بھی اس کے ذمہ دار ہیں اور ایک وقت میں اس تمام کھیل کے پاکستانی کھلاڑی بھی رہے ہیں۔ جنرل پرویز مشرف بھی میدان میں اتر آئے ہیں۔ ان سے کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ کارگل کی مہم میں آپ نے کونسا تیر مارا تھا جو آپ پھر سے بھارت کو سبق سکھانے کی بات کر رہے ہیں۔ پاکستان کو کارگل میں جو سبکی اور ناکامی ہوئی، اس کے کتنے ذمہ داروں کو حکومت یا ریاست نے سزائیں دیں۔

ہم تو روس کی واپسی کے بعد ثمر خیل کی لڑائی میں نجیب اللہ کے دستوں کو بھی پیچھے دھکیلنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہم ہمیشہ سے سے گفتار کے غازی رہے ہیں، کردار کے نہیں۔ ہماری جنگی تیاری بھارت کو مدِ نظر رکھ کر کی جاتی ہے۔ بھارت اور امریکہ کی ٹیکنالوجی میں کتنا فرق ہے اور ہماری اپنی کتنی کمزوریاں اور مجبوریاں ہیں، ان پر کبھی سوچا بھی نہیں گیا۔ نااہل حکمرانوں، جذباتی ماہرین اور اپنے اپنے ادوار کے ناکام فوجی افسران کے ہوتے ہوئے ہم ملک کے مفاد میں کچھ کرنے کی توقع لگائے بیٹھیں رہیں گے تو ہمیں ایسی ہی مایوسی ہوگی، جیسی کہ دو مئی کو ہوئی۔ تضادات پر مبنی بیانات اور دل بہلانے والے دعوے یہ ثابت کرنے کیلئے کافی ہیں کہ ہمیں اب بھی ان خطرات کے نتائج کا صحیح ادراک نہیں ہو رہا جو ہمیں درپیش ہیں اور ہمارے گرد گھیرا تنگ کیا جا رہا ہے۔ ہمیں سچ کا سہارا لے کر ان تمام قوتوں کے بارے میں ملکی مفادات کے تناظر میں حقائق پر مبنی رویہ اپنانا ہوگا جو کسی نہ کسی شکل میں ہمارے ملک میں مداخلت کر رہی ہیں یا ہمیں استعمال کر رہی ہیں۔ اب ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ چند دوسرے دوست ممالک بھی ہمارے معاملات میں مداخلت کر رہے ہیں اور ہم اس کے نتائج بھگت بھی رہے ہیں۔ تاریخ کے اس نازک موڑ پر خدا نے ہمیں اپنی غلطیوں سے سبق سیکھنے کا ایک موقع فراہم کر دیا ہے اور ہمیں اب نئے سرے سے اپنی پالیسیوں کا تعین کرنا ہوگا۔

کہنے میں کیا حرج ہے؟

پاکستان میں پاک امریکہ تعلقات کے حوالے سے ایک بار پھر ایک نئی مگر لاحاصل بحث چھڑ گئی ہے۔ لاحاصل اس لئے کہ ہم اب تک ان پالیسیوں کے بارے میں بھی سچ کہنے یا سچ سننے کیلئے ذہنی طور پر تیار نہیں، جن کی تشکیل ملک کا طبقہ اشرافیہ اور اس کے مفادات کا دفاع کرنے والے طاقتور ریاستی ادارے کرتے آئے ہیں۔ پاکستان کے عوام امریکہ کیلئے کیا سوچ رکھتے ہیں، اس کی پرواہ امریکہ کو نہ تو پہلے کبھی رہی اور نہ ہی اب ہے۔ پاکستان جیسے ممالک میں عوام کی رائے اور خواہشات کی کتنی اہمیت ہوتی ہے، اس پر بحث کرنے کی بجائے، ہمیں اپنی مختصر سی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ تلخ حقیقت تو یہ ہے کہ ایسے ممالک میں عوام کی رائے، ان کی مخالفت، ان کی خواہشات اور ان کی سوچ کو وہ اہمیت قطعاً نہیں دی جاتی جو ترقی یافتہ یا مہذب ممالک کے عوام کو حاصل ہوتی ہے۔ پاکستانی اشرافیہ جب امریکہ سے تعلقات قائم کر کے اس نوزائیدہ اور کمزور ملک کو امریکی بلاک کا حصہ بنا رہی تھی تو اس فیصلے سے قبل عوام کو کب کسی نے اعتماد میں لیا تھا۔ امریکی آشیرباد سے جب فوجی آمر ملک پر حکمرانی کرتے رہے تو اس میں عوام کی رائے یا مرضی کب شامل تھی۔ روس کیخلاف جو جنگ لڑی جا رہی تھی، اس کے آغاز سے قبل عوام نامی مخلوق سے کس نے پوچھا تھا۔ اب بھی اگر ہم امریکہ کی ایک تابعدار ریاست بنے ہوئے ہیں تو اس میں عوامی رائے کا کتنا کردار ہے۔ یہ بات اب ہمیں سمجھ آ ہی جانی چاہئے کہ ہمارے ملک کی خارجہ پالیسی میں نہ صرف عوام کی رائے اور خواہشات کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا بلکہ اس معاملے میں نام نہاد جمہوری حکومتوں اور سیاسی قوتوں کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہوا کرتی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم برسوں سے خارجہ پالیسی کو نیشنل سکیورٹی کے تناظر میں چلاتے آئے ہیں اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ نیشنل سکیورٹی کے معاملات کن قوتوں یا اداروں کے پاس ہوا کرتے ہیں۔ پاکستان نے خارجہ پالیسی کی جو بنیادیں قائم کی تھیں اور امریکہ پر مکمل انحصار کا جو مستقل فارمولہ طبقہ اشرافیہ نے وضع کیا تھا، اس کے ابتدائی خدوخال کیلئے ہمیں قدرت اللہ شہاب کی کتاب کا پھر سے مطالعہ کرنا پڑے گا۔ آج وہ معزز اور نامور حضرات بھی ٹیلی ویژن چینلوں پر امریکہ کو گالیاں اور دھمکیاں دیتے نظر

آرہے ہیں جو اپنی ملازمتوں کے دوران امریکی حکام کی خوشنودی کیلئے مرے جارہے تھے۔ مخالفت کرنے والوں میں وہ حضرات بھی شامل ہیں جو امریکی تھنک ٹینکس سے ہر ماہ لاکھوں روپے لے کرانہیں مشورے اور تجاویز دے رہے ہوتے ہیں اور ان افراد کی بھی کوئی کمی نہیں ہے جن کے بچے امریکہ میں پڑھ رہے ہیں یا وہاں پر بہتر زندگی گزارنے کیلئے ملازمتیں کر رہے ہیں۔ ہم گفتار کے غازی تو ہیں مگر ہم کردار کے غازی کبھی نہیں بنے، کیونکہ یہ ہمارے قومی مزاج کی وہ عادت یا خصوصیت ہے جس کے ثبوت اور عملی مظاہر ہمیں اپنی سابقہ اور حالیہ تاریخ میں قدم قدم پر دکھائی دے رہے ہیں۔ اگر آج کی حکومت امریکہ کے سامنے ڈٹ کر کھڑی نہیں ہو سکتی تو کوئی ایک ایسی حکومت یا لیڈر شپ بتائی جائے جس نے عملی مزاحمت کی ہو۔ مزاحمت وہ لوگ، وہ رہنما یا وہ ملک کرتے ہیں جو عملاً آزاد، بااختیار اور باجرأت ہوں۔ ہماری تو حالت یہ ہے کہ ہمارے تمام بڑے عہدوں پر شخصیات کی نامزدگیوں اور تعیناتی کے احکامات بھی واشنگٹن سے آرہے ہوتے ہیں جبکہ ہمارے ہاں ان لوگوں کی کوئی کمی نہیں جو امریکی سفارتخانے کے باہر گھنٹوں گھنٹوں تک کھڑا رہنا اپنی سعادت اور شاندار مستقبل کا ذریعہ سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ ہم جتنی بحث امریکہ کے بارے میں کر رہے ہوتے ہیں، اتنی توجہ اپنے مسائل اور ایشوز پر نہیں دیتے کیونکہ امریکہ ہمارے لئے 'ڈریم لینڈ' کا مقام رکھتا ہے اور ہمارے حواسوں پر چھایا رہتا ہے۔

ہم امریکہ سے سب سے زیادہ امداد لینے والے ممالک میں تیسرے نمبر پر ہیں اور ہمارے دفاعی اور حکومتی بجٹ کا ستر فیصد انحصار بھی امریکہ ہی پر ہے۔ امریکہ کو جب بھی ہماری ضرورت ہوتی ہے، ہم ہاتھ باندھے کھڑے نظر آتے ہیں اور اس ضرورت کی تکمیل کیلئے امریکہ ہمیں اپنے وہ ڈالرز دے رہا ہوتا ہے جو اسے بہت عزیز ہیں۔ ایسے میں جب ہم پارٹنر شپ یا یکساں سٹیٹس کی بات کر رہے ہوتے ہیں تو بہت مضحکہ خیز لگتا ہے، کیونکہ امریکی پارٹنر شپ کے تقاضوں پر برطانیہ جیسے ممالک پورا اترا کرتے ہیں، پاکستان جیسی کمزور ریاستیں نہیں۔ بہت سے لوگ امریکی امداد کو اپنی ''خدمات'' کے صلے میں اپنا بنیادی حق سمجھتے ہیں، تاہم وہ یہ وضاحت کرنے سے قاصر ہیں کہ ہم یہ خدمات سرانجام ہی کیوں دیتے آئے ہیں۔ اگر ان خدمات کے بنیادی اسباب اور اس کے پس منظر میں طبقہ اشرافیہ کے مفادات کا سراغ لگایا جائے اور جرأت کر کے اس پر بحث بھی کرائی

جائے تو بہت سے تلخ حقائق خود بخود سامنے آجائیں گے۔ المیہ یہ ہے کہ ہم عملاً دو غلے رویوں کے شکار لوگ ہیں۔ ہم کرتے کچھ، سوچتے کچھ اور کہتے کچھ ہیں۔ اس تلخ حقیقت کا کوئی بھی ذکر نہیں آرہا کہ ہم سیاسی، اقتصادی اور انتظامی طور پر امریکہ کے اس قدر محتاج ہو گئے ہیں کہ ہمارا اپنے ملک کے نظام کو چلانا بھی مشکل ہے اور ایسا تب تک ہوتا رہے گا جب تک ہم اپنے اندر موجود برسوں بلکہ دہائیوں کی ان خرابیوں کو ہنگامی طور پر ختم نہیں کرتے جن کے باعث آج ہم بدترین قسم کے بحرانوں کا شکار ہیں۔ شیشے کے گھروں میں رہنے والے بعض لیڈر اور تجزیہ کار امریکہ کی مزاحمت کرنے والے دوست ممالک ایران اور چین کی مثالیں بھی دے رہے ہیں، تاہم وہ تصویر کا محض ایک رخ دکھاتے ہیں اور یہ بتانے کی زحمت نہیں کرتے کہ ہمارا موازنہ ان دو ممالک کے ریاستی ستونوں، نظریاتی پختگی، قومی یکجہتی اور سب سے بڑھ کر مضبوط معاشی نظام کے ساتھ کرنا ممکن نہیں ہے۔ ہم غلط جگہ پر غلط مثال دینے کے عادی ہیں اور یوں ہم تلخ حقائق اور اپنی کمزوریاں چھپا کر دوسروں کو گمراہ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ہم بجٹ (2010ء) کیلئے امریکہ اور اسکے متعلقہ اداروں کی منتیں کرتے رہے اور ہمارا اقتصادی اور معاشی ڈھانچہ ان کی مدد کے بغیر چل ہی نہیں سکتا۔ ہم میں سے ایسے لوگ کتنے فیصد ہوں گے جو متوقع اقتصادی بحران کی صورت میں اپنی دولت میں سے کچھ رقم قومی خزانے میں جمع کرانے پر تیار ہوں گے۔ وہ لوگ کتنے فیصد ہوں گے جو قومی غیرت اور آزادی پر سٹینڈ لیکر اپنے اخراجات میں پانچ دس فیصد تک کمی لانے پر تیار ہوں گے۔ قربانی اگر مانگی جارہی ہے تو عوام نامی اس مخلوق سے جن کو دہشت گردی، بدانتظامی، کرپشن اور بے انصافی کے باعث اپنے سامنے کوئی امید اور کوئی بہتری نظر نہیں آرہی۔ گزشتہ چند روز سے قبائلی مشران اور ارکان اسمبلی ڈرون حملوں کی مخالفت کرتے نظر آرہے ہیں۔ ان سے کوئی بھی یہ نہیں پوچھ رہا کہ آپ کو کیا امریکہ نے ہی نیند یا مدہوشی کا ایسا انجکشن لگایا تھا، جس کے باعث آپ کو اب تک کئے گئے 260 ڈرون حملے اتنے برسوں میں نظر ہی نہ آئے۔ ان معزز حضرات سے کوئی یہ بھی پوچھنے کی جسارت نہیں کررہا کہ جب آپ سینٹ کے الیکشن کے دوران کروڑوں روپے وصول کر کے مالا مال ہورہے تھے تو اس وقت آپ کو اپنے قبائلی عوام اور ان کی تکالیف کا خیال کیونکر نہیں آیا۔ ان سے یہ بھی کوئی نہیں پوچھ رہا کہ وہ فاٹا سیکرٹریٹ کے ذریعے فاٹا

کو ملنے والی امریکی امداد کیلئے لائنوں میں کیوں کھڑے تھے اور اگر وہ یہ پیسے لے چکے ہیں تو ان کو اتنی رقوم کس خوشی میں مل رہی تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ عوام کا نام لیکر چند مخصوص طبقے اپنے نام اور اپنے کام کیلئے بوقت ضرورت اس قسم کے ایونٹس میں کود جاتے ہیں یا ان کو کودنے کا کہا جاتا ہے۔ قرائن بتا رہے ہیں کہ نہ تو ہمارے اور امریکہ کے دوطرفہ تعلقات میں کوئی تبدیلی رونما ہوگی اور نہ ہی ڈرون حملے رکیں گے۔ اس کے ساتھ ہی یہ کہ عوام سڑکوں پر نہیں نکلیں گے اور نہ ہی ہم اپنے کشکول توڑنے کی کوئی حماقت کریں گے، کیونکہ اس کشکول میں سونے اور چاندی کے جو سکے ڈالے جاتے ہیں، ان کی عوام سے زیادہ طبقہ اشرافیہ کو ضرورت ہے۔ بہت سے لوگوں کو یہ بات بہت بری لگے گی مگر یہ کہنے میں حرج ہی کیا ہے اور ہم اسی طرح پرانی تنخواہ پر کام کرتے رہیں گے۔

جب خاموشی موت کو جنم دیتی ہے

عدم برداشت، عدم تحفظ، فرقہ واریت اور سیاسی و گروہی اختلافات کا لامتناہی سلسلہ ختم ہونے کی بجائے بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ ان میں سے ہر ایک وہ رویہ ہے جو کسی بھی معاشرے یا ملک کی بنیادیں ہلانے کیلئے کافی سمجھا جاتا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ پاکستانی معاشرہ بڑھتے ہوئے تشدد، حملوں اور قتل و غارت گری کے باعث آج خوف کی علامت بن چکا ہے۔ دسمبر 2010ء میں اہم ریاستی اور سیاسی شخصیات کو ایک منظّم طریقے سے نشانہ بنایا جانے لگا تو بہت سے متعلقہ لوگ اور ریاستی حکام ناراض ہو گئے جبکہ ایک ٹی وی ٹاک شو میں ایک معزز وزیر نے ہم پر باقاعدہ چلانے سے گریز بھی نہیں کیا۔ دیکھا جائے تو اس قسم کے رویوں، منصوبہ بندیوں اور حملوں کا راستہ روکنا ریاست کا کام ہے۔ ہم جیسے لوگ تو محض اندازے ہی لگا سکتے ہیں مگر افسوس کہ ریاست کے کرتا دھرتا ملک کو بارود اور نفرت کے ڈھیر پر کھڑا دیکھ کر بھی عملاً چین کی بانسری بجاتے نظر آ رہے ہیں۔ وفاقی وزیر شہباز بھٹی کو اسلام آباد جیسے شہر میں جس طریقے سے قتل کیا گیا اور حملہ آور جس منظّم طریقے سے اتنے اہم علاقے سے آسانی کے ساتھ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے، وہ ایک بڑی ریاستی ناکامی اور محکمانہ لاپرواہی کا منہ بولتا ثبوت نہیں تو اور کیا ہے۔ چند روز تک حسب معمول وہی مذمتی بیانات سامنے آتے رہیں گے اور پھر کسی اور واقعہ یا ایشو کے باعث اس سانحہ کی دھول بھی بیٹھ جائے گی۔ ایسا ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا کیونکہ جس ملک کے اندر معاشرے کا کوئی بھی طبقہ محفوظ نہ ہو اور جو ریاست اپنے گورنر اور وزراء کو تحفظ فراہم کرنے کی اہل نہ ہو، وہاں ایسے واقعات کا ظہور پذیر ہونا کون سی نئی یا عجیب بات ہے۔ جس ملک میں مذہب اور پاکستانیت چند مخصوص لوگوں کی ملکیت ہو اور جس معاشرے میں ایسے واقعات کی کھل کر مخالفت یا مذمت کی جرأت موجود نہ ہو، وہاں ایک سے بڑھ کر ایک ایسا سانحہ رونما ہوتا رہے گا اور ہم مگرمچھ کے آنسو بہا کر کسی نئے سانحے کا انتظار کرتے رہیں گے۔

اسلام آباد کے خوبصورت سیکٹرز، سڑکوں اور گلیوں میں اب تک شہباز بھٹی جیسے بیسیوں لوگوں کا خون بہایا جا چکا ہے۔ اس سے قبل اسی شہر میں گورنر پنجاب سلمان تاثیر کو ہلاک کیا جا چکا

جب خاموشی موت کو جنم دیتی ہے

عدم برداشت، عدم تحفظ، فرقہ واریت اور سیاسی و گروہی اختلافات کا لامتناہی سلسلہ ختم ہونے کی بجائے بڑھتا ہی جارہا ہے۔ ان میں سے ہر ایک وہ رویہ ہے جو کسی بھی معاشرے یا ملک کی بنیادیں ہلانے کیلئے کافی سمجھا جاتا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ پاکستانی معاشرہ بڑھتے ہوئے تشدد، حملوں اور قتل و غارت گری کے باعث آج خوف کی علامت بن چکا ہے۔ دسمبر 2010ء میں اہم ریاستی اور سیاسی شخصیات کو ایک منظم طریقے سے نشانہ بنایا جانے لگا تو بہت سے متعلقہ لوگ اور ریاستی حکام ناراض ہو گئے جبکہ ایک ٹی وی ٹاک شو میں ایک معزز وزیر نے ہم پر باقاعدہ چلانے سے گریز بھی نہیں کیا۔ دیکھا جائے تو اس قسم کے رویوں، منصوبہ بندیوں اور حملوں کا راستہ روکنا ریاست کا کام ہے۔ ہم جیسے لوگ تو محض اندازے ہی لگا سکتے ہیں مگر افسوس کہ ریاست کے کرتا دھرتا ملک کو بارود اور نفرت کے ڈھیر پر کھڑا دیکھ کر بھی عملاً چین کی بانسری بجاتے نظر آرہے ہیں۔ وفاقی وزیر شہباز بھٹی کو اسلام آباد جیسے شہر میں جس طریقے سے قتل کیا گیا اور حملہ آور جس منظم طریقے سے اتنے اہم علاقے سے آسانی کے ساتھ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے، وہ ایک بڑی ریاستی ناکامی اور محکمانہ لاپرواہی کا منہ بولتا ثبوت نہیں تو اور کیا ہے۔ چند روز تک حسب معمول وہی مذمتی بیانات سامنے آتے رہیں گے اور پھر کسی اور واقعہ یا ایشو کے باعث اس سانحہ کی دھول بھی بیٹھ جائے گی۔ ایسا ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا کیونکہ جس ملک کے اندر معاشرے کا کوئی بھی طبقہ محفوظ نہ ہو اور جو ریاست اپنے گورنر اور وزراء کو تحفظ فراہم کرنے کی اہل نہ ہو، وہاں ایسے واقعات کا ظہور پذیر ہونا کون سی نئی یا عجیب بات ہے۔ جس ملک میں مذہب اور پاکستانیت چند مخصوص لوگوں کی ملکیت ہو اور جس معاشرے میں ایسے واقعات کی کھل کر مخالفت یا مذمت کی جرأت موجود نہ ہو، وہاں ایک سے بڑھ کر ایک ایسا سانحہ رونما ہوتا رہے گا اور ہم مگر مچھ کے آنسو بہا کر کسی نئے سانحے کا انتظار کرتے رہیں گے۔

اسلام آباد کے خوبصورت سیکٹرز، سڑکوں اور گلیوں میں اب تک شہباز بھٹی جیسے بیسیوں لوگوں کا خون بہایا جا چکا ہے۔ اس سے قبل اسی شہر میں گورنر پنجاب سلمان تاثیر کو ہلاک کیا جا چکا

ہے جو اس ملک کے سب سے بڑے صوبے کے گورنر اور حکمرانوں کے قریبی دوست تھے۔ اس سے قبل اسی شہر میں مولانا عبداللہ اور مولانا اعظم طارق سمیت متعدد دوسری اہم شخصیات کو ایسی ہی کارروائیوں میں قتل کیا جا چکا ہے، جبکہ جڑواں شہر راولپنڈی نے لیاقت علی خان، بینظیر بھٹو اور قومی اتحاد کے لاتعداد سیاسی کارکنوں کے علاوہ دوسرے پاکستانیوں کو بے رحمی کے ساتھ تشدد، منافرت اور انتہا پسندی کی بھینٹ چڑھانے کا ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ اس سے قبل مذہبی امور کے سابق وفاقی وزیر حامد سعید کاظمی بھی ایسے ہی ایک حملے کے دوران بال بال بچ گئے تھے، تاہم اقلیتی امور کے وزیر زندگی کی بازی ہار گئے اور اپنے پیچھے بہت سے سوال چھوڑ گئے۔ یہ محض ایک اتفاق ہی ہے کہ شہباز بھٹی کے قتل سے محض ایک روز قبل یکم مارچ کو پاکستان کی ایک عدالت نے اعظم طارق مرحوم کے قتل میں نامزد ایک ملزم کو بوجوہ بری کر دیا جبکہ دو مارچ کو پشاور ہائیکورٹ نے بھی انتہا پسندی میں مبینہ طور پر ملوث دو افراد کو ثبوتوں کی عدم موجودگی کے باعث رہا کرنے کے احکامات جاری کیے۔ یہ سب کچھ کافی عرصے سے ہوتا آ رہا ہے اور مستقبل میں نئے اہداف، نئے حملوں اور نئے افراد کی ہلاکتوں کے بڑھتے ہوئے ہندسوں کے ساتھ ہوتا رہے گا کیونکہ بہت سے گروہ، با اختیار لوگ اور طاقتور ادارے ایسا کرنا لازمی سمجھ کر ان واقعات کو ردِعمل کا نام دے کر معمول کے سانحات قرار دینے کی مستقل پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ یہ عجیب ملک ہے، جہاں نہ کوئی محفوظ ہے اور نہ ہی قابل معافی، کوئی بھی طبقہ قابل احترام نہیں رہا۔ انسانی زندگی کچھ اس انداز سے چھینی جا رہی ہے کہ انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے اور انسانیت چیخ اٹھتی ہے۔ یاد رہے کہ 11 ماہ کے عرصہ کے دوران رضا حیدر، مولانا نور محمد، صفوت غیور، سرفراز نعیمی، راشد حسین، مولانا شعیب، خالد خواجہ، کرنل امام، سلمان تاثیر سمیت 31 شخصیات ماری گئی ہیں۔ ان رہنماؤں اور عناصر کا راستہ روکنے کی اشد ضرورت ہے جو سیاسی مقاصد کیلئے عام مسلمانوں کو تشدد پر اکساتے ہیں۔ اس معاشرے میں مخالفت یا اختلاف رائے کا اس کے علاوہ دوسرا کوئی جواب نہیں رہا کہ مخالف فریق کو قتل کر کے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا جائے اور 'مٹی پاؤ' فارمولا اپنا کر معاملات زندگی کو اسی انداز میں آگے بڑھا کر دوسرے سانحات کا انتظار کیا جائے۔ تاہم اس حقیقت کو نظرانداز کرنا اور بھی خطرناک بات ہے کہ کل کو کسی کی بھی باری آ سکتی ہے۔ ایسا ممکن ہی نہیں ہے کہ آنے والی

آندھی یا جاری طوفان سے آنکھ بند کر کے بچا جا سکے۔ المیہ یہ نہیں کہ اموات اور حملوں کی تعداد کم نہیں ہو رہی۔ المیہ تو یہ ہے کہ کسی کو حالات کی سنگینی اور پیچیدہ معاملات کا ادراک نہیں ہے۔ لگ یہ رہا ہے کہ خاموش رہنا اور مصلحت پسندی اب ہمارا شیوہ اور مقدر بن چکا ہے۔ کسی کو بولنے نہیں دیا جا رہا اور جن لوگوں کو بولنا چاہیے، وہ خاموش ہیں۔ اگر روایتی خاموشی کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا اور مکالمے اور برداشت کی نئی بنیاد نہیں رکھی گئی تو وہ لوگ بھی اس لہر اور مائنڈ سیٹ سے بچ نہیں پائیں گے جو آج مصالحت کا شکار ہو کر خاموش بیٹھے ہیں کیونکہ خاموشی بذات خود موت کا دوسرا نام بھی ہے اور اس کی شناخت بھی۔ انسانیت کا تحفظ اور اس کا احترام کرنا یا کروانا ہم سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ ہم اس ذمہ داری کو کتنی اہمیت دے رہے ہیں اس کے مظاہر ہم ہر روز دیکھ رہے ہیں مگر اپنا کردار ادا کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد اس ملک میں اقلیتوں کا شرح تناسب 20 فیصد تھا۔ بانی پاکستان نے جو پہلی کابینہ قائم کی، اس کا وزیر قانون کسی مسلمان کی بجائے جوگندر ناتھ منڈل نامی ہندو کو بنایا۔ آج پاکستان میں صرف دو فیصد اقلیتی طبقہ رہ گیا ہے۔ یہ کیوں ہوا اور ان دو فیصد کو تحفظ اور جائز مقام کیوں حاصل نہیں؟ یہ وہ سوال ہے جس کے جواب کیلئے اہل دانش، حکمرانوں، مذہبی لیڈروں اور ریاستی اداروں کو سر جوڑ کر بیٹھنا ہوگا۔

شہباز بھٹی کی موت پر امریکی صدر بارک اوباما اور برطانوی وزیر اعظم ڈیوڈ کیمرون کے فوری اور سخت ردعمل کے اثرات کا بھی جائزہ لینا ہوگا جبکہ عالمی میڈیا کے تبصروں کو نظر انداز کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔ گلوبلائزیشن کے اس دور میں ہم نہ تو اپنی کوتاہیوں پر حسبِ سابق پردہ ڈال سکتے ہیں اور نہ ہی ہم عالمی برادری اور دوسرے طبقہ ہائے زندگی کی تشویش سے خود کو لاتعلق رکھ سکتے ہیں۔ ریاست کی پالیسی اب بھی مبہم ہے۔ جس شہر میں کچھ عرصہ قبل ایک گورنر اور اب ایک وفاقی وزیر کو کھلے عام گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا، اس شہر کے چوکوں میں ایک خاتون کو واجب القتل قرار دینے کے بینرز آج بھی آویزاں ہیں۔ انتظامیہ یہ بینرز کیوں نہیں ہٹا رہی اور جن لوگوں نے اپنے نام کے ساتھ کفر کے فتوے بینرز پر تحریر کئے ہیں، ان کیخلاف کارروائی کیوں نہیں ہو رہی۔ اگر اس سوال کا جواب ڈھونڈا جائے تو بہت سے پیچیدہ سوالوں کے خود بخود جواب مل جائیں گے اور ایسے عناصر کی کڑیاں ملانا مشکل کام نہیں رہے گا۔

یکم مارچ کو مردان کے علاقے لوند خوڑ میں طالبات کے کالج پر گرنیڈ کے حملوں اور اس کے نتیجے میں دو معصوم طالبات کی شہادت اور اس سے ایک روز قبل ایک قبائلی ایجنسی میں مبینہ جاسوسوں کی پانچ لاشوں کی برآمدگی جیسے واقعات ہمیں کس جانب لے جا رہے ہیں۔اصل سوال اور خطرناک ایشو تو یہی ہے مگر ہم ہیں کہ ٹس سے مس نہیں ہو رہے اور معاشرہ کو بدترین تشدد، لاقانونیت اور خوف کی طرف بڑھتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔محض مذمتی بیانات اور رسمی اظہار ہمدردی سے کام نہیں بنے گا۔معاشرے کے ہر فرد، ہر گروہ، ہر ادارے اور ہر سیاسی قوت کو اب کھل کر کسی ایک جانب کھڑا ہونا ہوگا۔اگر یکطرفہ تشدد کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا اور ذمہ داران کے تعین کا ایشو یونہی ابہام کا شکار بنا رہا تو پہلے ہی سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار پاکستان مزید مشکلات میں گھر جائے گا۔محض حملہ آوروں کو ان واقعات کا ذمہ دار قرار دینے سے بات نہیں بنے گی۔وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں اور ان کا راستہ کیوں نہیں روکا جا رہا؟اصل مسئلہ یہی تھا اور اب بھی ہے۔اس بات کی ضرورت ہے کہ علماء اس صورتحال سے نمٹنے کیلئے واضح اور اہم کردار ادا کریں اور محض مذمت پر اکتفا نہ کریں۔

اگر مگر سے کب تک کام چلتا رہے گا

اس تاثر میں تو اب شک کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہی کہ ہم ایک کنفیوژ قوم ہیں۔ ہم اپنی خوش فہمیوں میں بھی ثانی نہیں رکھتے۔ ہم اپنی خواہشات کو آن دی ریکارڈ لانے کے مرض میں بھی مبتلا ہیں جبکہ یہ ہم ہی ہیں جو اپنے بیانات اور موقف بدلنے میں دیر نہیں لگاتے۔

ایبٹ آباد میں اسامہ بن لادن کی گرفتاری یا ہلاکت کیلئے کئے گئے امریکی آپریشن پر ہمارے تجزیہ کاروں کے بعض پسندیدہ لیڈروں اور سابق بیوروکریٹس نے غیر متعلقہ تبصرے کر کے اصل ایشو اور مستقبل کے خطرناک منظرنامے پر کوئی سنجیدہ بحث ہی نہیں کی۔ ایک نامور اینکر نے تو بڑے یقین کے ساتھ یہاں تک کہا کہ ان کو یہ یقین ہی نہیں ہے کہ آپریشن حقیقتاً ہوا بھی ہے۔ موصوف نے اس تمام کارروائی کو ٹوپی ڈرامہ قرار دے کر اس کی تصدیق کیلئے اپنی شرائط پیش کیں اور کچھ اس طرح کا تاثر دینے کی کوشش کی جیسے پوری دنیا کو انہی کے سرٹیفکیٹ کی اشد ضرورت ہے۔ مضحکہ خیز صورتحال تو یہ بھی رہی کہ ان کا چینل اس واقعے کی پہلی خبر چلانے کی اپنی پبلسٹی بہت فخریہ انداز میں کرتا رہا اور موصوف اپنی بات چیت میں اتنے اہم واقعہ کو ٹوپی ڈرامہ قرار دیتے رہے۔ منفرد نظر آنے کے شوق میں بہت سے افراد نے مفروضوں اور خواہشات پر مبنی اپنے خیالات کا جس بے دردی کے ساتھ اظہار کیا اور امریکی و پاکستانی حکام کی طرف سے بعض تفصیلات کے آنے کے بعد جس جس طریقے سے اپنے موقف تبدیل کئے جاتے رہے، اس سے بہت مضحکہ خیز صورتحال پیدا ہوگئی۔

ایک نامور سیکورٹی ماہر (خاتون) نے پاکستان کی نازک پوزیشن پر اپنی رائے پیش کرنے کی بجائے نیٹو کی ترجمانی کا فریضہ سرانجام دینا شروع کیا، ان کو گلہ تھا کہ امریکہ نے نیٹو کو اسامہ بن لادن کی لاش کیوں نہیں دکھائی۔ حالانکہ ان کی اس غیر متعلقہ ترجمانی سے قبل نیٹو حکام اس کارروائی پر اپنے مکمل اطمینان اور مسرت کا اظہار کر چکے تھے۔ بعض معززین نے اس امر پر بھی اعتراض کیا کہ اسامہ کے جسد کو عام دیدار کیلئے کھلے عام کیوں نہیں رکھا گیا۔ بہت سے ایسے تھے جن کا خیال تھا کہ آپریشن پاکستان کی مدد کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا تھا، اس لئے اس کا کریڈٹ پاکستان کو بھی ملنا

چاہیے۔ ان زریں خیالات کا کچھ گھنٹوں بعد ہی یہ نتیجہ نکلا کہ تحریک طالبان نے پاکستان کو اپنا سب سے بڑا دشمن قرار دے کر حملوں کی دھمکیاں دینی شروع کر دیں۔ اسامہ بن لادن کی صاحبزادی، یمنی القاعدہ کے ایک ترجمان اور بعض طالبان کمانڈروں نے بھی بن لادن کی موت کی تصدیق کر دی مگر ہمارے بعض تبصرہ کار اور سابق بیوروکریٹس پھر بھی اس خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ اسامہ بن لادن ان کی معلومات کے مطابق تاحال زندہ ہیں۔ اتنے نازک اور پیچیدہ ایشو پر بعض وہ لوگ بھی کھل کر تبصرہ کرتے رہے، جن کا اس ایشو کے ساتھ دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں بنتا۔ یعنی یہ ان کے مطالعے، معلومات اور مشاہدے کا موضوع ہی نہیں تھا۔

سابق جرنیلوں میں سے تو بعض ایسے تھے جو لائیو ٹرانسمیشن کے دوران 'آ بیل مجھے مار' کے فارمولے پر عمل پیرا تھے جبکہ بعض بنیادی معلومات کی فراہمی میں بھی غلط بیانی سے کام لیا جاتا رہا۔ ایک سابق جرنیل کی تو حالت یہ تھی کہ وہ پاکستانی حکمرانوں، خفیہ اداروں اور عسکری اداروں کیلئے آن دی سکرین انتہائی نازیبا الفاظ اور القابات بھی استعمال کرتے رہے۔ متعدد لیڈر اور تجزیہ کار ایسے بھی تھے جن کا مطالبہ یہ تھا کہ اب امریکہ کو فوری طور پر افغانستان اور خطے سے نکل جانا چاہیے، حالانکہ ان کے اس مطالبے سے قبل امریکی اور نیٹو حکام کھلے عام کہہ چکے تھے کہ وہ اہداف کے حصول اور افغانستان کی تعمیر نو کے ایک باقاعدہ روڈ میپ تک خطے میں موجود رہیں گے۔ عالمی میڈیا مسلسل کہتا رہا کہ اس واقعے کے بعد پاکستان پر دباؤ بڑھ جائے گا اور عالمی سطح پر یہ سوال اٹھایا جائے گا کہ اسامہ بن لادن ایبٹ آباد میں اتنے عرصے سے اور اس قدر حساس علاقے میں محفوظ زندگی کیسے گزار رہے تھے۔ سنجیدہ تجزیہ کار ٹھوس وجوہات کی بناء پر جاری جنگ کو پاکستان منتقل کرنے اور اس کے اثرات پر بحث کر رہے تھے جبکہ دوسرے امریکہ جیسی طاقت کو مفت میں اپنے زریں مشورے دینے میں مصروف تھے۔ جس اینکر اور صحافی کو اس آپریشن پر یقین نہیں آ رہا تھا، وہ ساتھ ساتھ یہ بھی فرماتے رہے کہ ایکشن سے قبل پاکستان کا ریڈار سسٹم جام کر دیا گیا تھا۔ کسی نے ان سے یا انہوں نے خود سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ خود ان کی باتوں میں کتنا تضاد ہے۔ مقبول عام اور حقائق پر مبنی پس منظر کے برعکس وہ یہ انکشاف بھی کرتے رہے کہ اس کارروائی کے بعد امریکی اسٹیبلشمنٹ کے انتہائی قابل اعتماد جنرل پیٹریاس کی اہمیت میں بے حد کمی واقع ہو گی۔ ان سے کسی

نے یہ نہیں پوچھا کہ اگر ایسا ہی ہونا تھا یا ہونا ہے تو ان کو سی آئی اے کے سربراہ کے اہم ترین عہدے پر فائز کیوں کیا گیا ہے۔ بہر حال خواہشات پر مبنی تبصروں کی بھرمار تھی، جو کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ بعض تو وہ بھی تھے جو پاکستان کی افواج اور حکومت کو امریکہ سے جنگ کرنے کا مشورہ بھی دے رہے تھے اور کھلے تصادم کے حق میں تھے۔ اس صورتحال نے لوگوں کو اور بھی پریشان اور کنفیوژ کر کے رکھ دیا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اسامہ بن لادن دنیا خصوصاً امریکہ کو مطلوب ترین شخص تھا اور وہ اس کارروائی کے دوران ہمارے ملک کے ایک شہر میں طویل عرصے سے قیام پذیر تھا۔ ان کو یہ حق کسی نے نہیں دیا تھا کہ وہ افغانستان کے بعد ہمارے ملک میں قیام پذیر رہ کر ہماری مشکلات اور بدنامی کا راستہ ہموار کرتے۔ اگر امریکہ کا ایکشن غلط اور نامناسب تھا تو اسامہ کے اقدام کو کس بنیاد پر درست قرار دیا جاسکتا تھا۔ یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ یہ بن لادن ہی تھے جن کا پیچھا کرتے ہوتے امریکہ اور اس کے اتحادی افغانستان پر حملہ آور ہوئے اور ہزاروں لوگوں کی جانیں چلی گئیں۔ اگر ہم افغانستان کے طالبان لیڈروں کی طرح مبینہ مزاحمت کا راستہ اختیار کر لیتے تو اس کا انجام کیا ہوتا؟ اس پر کسی نے بھی نہ تو غور کیا اور نہ ہی اس خطرناک ایشو کو زیر بحث لایا گیا۔ بدمست ہاتھی کے سامنے مزاحمت نہ کرنے کو بزدلی کا نام دینے سے حقیقت کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ امریکہ عراق اور افغانستان کے بعد پاکستان پر حملہ آور ہونے کے لیے ٹھوس جواز تلاش کر رہا ہے۔ بہت سے حلقوں کو علم ہے کہ وہ اس علاقے میں چند اور دشمنوں سے نمٹنے کا پلان بھی لے کر آیا ہے۔ ایسے میں جذبات پر مبنی رویوں سے گریز ہی بہتر راستہ تھا تاکہ عوام کو اصل حقائق اور متوقع نتائج سے آگاہ کر دیا جاتا۔ اس بات پر کوئی بحث ہی نہیں ہوئی کہ اس واقعے کے بعد القاعدہ اور امریکہ کا جو دوطرفہ دباؤ آئے گا تو اس سے کیسے نمٹا جائے گا اور ہم نے کونسی ایسی حکمت عملی وضع کرنی ہے، جس کے ذریعے ملک کی سلامتی، خودمختاری اور نیک نامی کو یقینی بنایا جاسکتا ہے۔ ایک خطرناک، نازک اور پیچیدہ ایشو کو اگر مگر کے ذریعے اور بھی پیچیدہ بنایا گیا جبکہ رہی سہی کسر سیاسی حکومت اور ان پارٹیوں نے پوری کر دی جنہوں نے اتنے اہم اور نازک مرحلے پر بھی وزراء کی حلف برداری کی تقریب ملتوی کرنے کی

ضرورت محسوس نہیں کی۔ اگر ہمارا یہی رویہ رہا اور واحد سپر پاور کی پالیسی ایسی رہی تو اس کے جو نتائج نکلیں گے، اس پر ابھی سے سوچنا چاہیے۔

سوال یہ ہے کہ ہم خوش فہمیوں کے حصار سے کب نکلیں گے۔ غلط تبصروں کی عادت کب چھوڑیں گے اور سب سے بڑھ کر ایسے نازک معاملات کے دوران اگر مگر کی بجائے سنجیدہ رویہ کب اپنائیں گے۔

بدنصیبی سے خونِ ناحق کی ارزانی تک

کسی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی کہ پشتونوں کی بدنصیبی، تباہی اور بدنامی کا نہ رکنے والا سلسلہ کب اور کیسے تھمے گا۔ پتہ نہیں اس قوم کو کسی نے بددعا دی ہے یا اس کے اپنے اعمال اور بے اتفاقی کا نتیجہ ہے کہ یہ قوم گزشتہ تیس سال سے مر بھی رہی ہے اور بدنام بھی ہو رہی ہے۔ قندھار سے لیکر کابل، جلال آباد، پشاور، سوات، وزیرستان، چمن، کوئٹہ اور آخر کار کراچی تک شاید ہی کوئی ایسا قصبہ، علاقہ یا شہر ہو جہاں پشتونوں کے جنازے نہ اٹھ رہے ہوں۔ بدنامی کا وہ کونسا خطاب یا لقب ہے جو اس قوم کے حصے میں نہیں آیا۔ یہ دہشت گرد بھی ہے اور طالب بھی، جاہل بھی ہے اور قبضہ مافیا بھی، مہاجر بھی ہے اور سمگلر بھی، قاتل بھی ہے اور مقتول بھی۔ کسی کو کچھ پتہ نہیں چل رہا کہ یہ قوم کس جرم کی سزا بھگت رہی ہے۔ اس تمام کنفیوژن کے باوجود ایک بات بالکل واضح ہے اور وہ یہ ہے کہ اس بدنصیب قوم کی افرادی قوت، جغرافیائی اہمیت اور صلاحیتیں اس کی وہ کمزوریاں ہیں جن کی وجہ سے اس کو چہار اطراف سے گھیرا جا چکا ہے اور یہ قوم ہر کسی کے نشانے پر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ چار مختلف سرحدوں میں تقسیم اس قوم کو تا حال اپنی اہمیت، قوت اور صلاحیتوں کا اندازہ نہیں ہو رہا۔ یہی بدقسمتی یا نااہلی پشتونوں کی مستقل بدنصیبی کی صورت اختیار کر گئی ہے اور محسوس یوں ہو رہا ہے کہ آنے والا وقت موجودہ حالات سے بھی زیادہ بدتر ثابت ہوگا۔ دوسری جنگ عظیم کی ایک متاثرہ قوم کے بعد اس تمام عرصے کے دوران یہ دوسری قوم ہے، جس کے خلاف سب سے زیادہ جنگیں لڑی گئیں، سازشیں کی گئیں اور نتیجے کے طور پر لاکھوں انسان لقمۂ اجل بنے۔ دنیا کا شاید ہی ایسا کوئی حصہ یا علاقہ ہو جہاں اس قوم کے لوگوں کی لاشیں نہیں گرائی گئیں۔ حال ہی میں کراچی کے پشتونوں کے ساتھ جس قسم کا ڈرامہ رچایا گیا، اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں رہا کہ اس بدنصیب قوم کو مارا بھی جا رہا ہے اور اس کو قاتل بھی ٹھہرایا جا رہا ہے۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ بارہ مئی کو 30 سے زائد پشتونوں کی لاشیں گرائی گئیں مگر نہ ایف آئی آر درج ہوئی اور نہ قاتلوں کا پتہ چلا، نہ کوئی سوموٹو ایکشن لیا گیا اور نہ ہی اس بات کی وضاحت کی گئی کہ ان 30 انسانوں کا قصور کیا تھا۔ اگر بارہ مئی کے قاتلوں کا پتہ چلایا جاتا اور بعض کو سزائیں ہو جاتیں تو مزید قتل و غارت گری کی نوبت نہ

آتی۔ پشتونوں کی نمائندگی کی عویدار جماعت یعنی اے این پی نے اگر کوئی ٹھوس سیاسی حکمت عملی اختیار کی ہوتی اور ہم خیال سیاسی قوتوں کے ساتھ کم از کم سندھ کی حد تک محدود اتحاد قائم کیا ہوتا تو آج پشتونوں کے خون ناحق کی یہ ارزانی نہ ہوتی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اے این پی نے دوسری قوم پرست قوتوں کے ساتھ رابطے اور مراسم ہی ختم کر دیئے ہیں اور اسی رویئے کا نتیجہ ہے کہ سندھ میں وہ سندھی اور بلوچ قوم پرست قوتیں بھی پشتونوں کے حق میں آواز نہیں اٹھا رہی ہیں جو کسی زمانے میں ان کی گائیڈ لائن پر چلا کرتی تھیں۔ یہ حقیقت بہت تلخ ہے کہ سندھی قوم پرست آج ایم کیو ایم کا ساتھ تو دے رہے ہیں تاہم وہ اے این پی یا پشتونوں کیلئے کوئی ہمدردی نہیں رکھتے۔

آج شاہی سید سے کوئی پوچھنے والا نہیں کہ جشن پختونخوا کی ایک تقریب کے دوران پشتونوں کو سندھ کی سب سے بڑی قوت قرار دینے کا دعویٰ 30 لاشوں کی صورت میں کیوں سامنے آیا ہے؟ ان سے کوئی یہ بھی نہیں پوچھ رہا کہ ان کا وہ اعلان کہاں گیا جس میں انہوں نے کہا کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے گا۔ ان کے پاس اس سوال کا بھی جواب نہیں ہے کہ وہ ابھی تک سندھ کابینہ کی ایک وزارت سے کیوں چمٹے ہوئے ہیں۔ خدانخواستہ ہم اے این پی یا کسی اور جمہوری قوت یا کمیونٹی کو تشدد پر اکسانے کی کوشش قطعاً نہیں کر رہے۔ بتانا صرف یہ مقصود ہے کہ اگر کسی میں اپنے مخالف کا مقابلہ کرنے کی قوت نہ ہو تو عقل اور سیاست کا تقاضا یہ ہے کہ دھمکیاں دینے اور مکا لہرانے سے گریز ہی کیا جائے۔ ہم دوسری قومیتوں کے بے گناہ لوگوں کے خون کو بھی اتنا ہی مقدس اور قیمتی سمجھتے ہیں، جتنا کہ ان مظلوم پشتونوں کے خون کو جن کی لاشیں کراچی میں گرائی گئیں۔ تادم تحریر صوبائی یا مرکزی حکومت نے ان کیلئے معمول کے معاوضوں کا اعلان بھی نہیں کیا ہے۔ حتیٰ کہ اے این پی کے مرکزی سربراہ اسفند یار ولی خان نے امریکہ کی اپنی مصروفیات کے باعث مذمتی اخباری بیان بھی جاری کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ پارٹی کے صوبائی صدر اور ہمارے ایک ہر دلعزیز وزیر کی قیادت میں اس سانحہ کیخلاف پشاور میں جو مظاہرہ کیا گیا اس میں شریک افراد کی تعداد بھی افسوسناک حد تک کم تھی۔ ہمارے ایک صحافی دوست کے بقول اس تمام واقعے کے دوران ہمارے قابل احترام چیف جسٹس نے بھی کراچی میں اپنی موجودگی کے باوجود حسب روایت کوئی ایک سوموٹو ایکشن لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی حالانکہ بارہ مئی کے روز جن

30 پشتونوں کا خون بہایا گیا تھا، ان کا قصور محض یہ تھا کہ وہ چیف جسٹس کے استقبال کیلئے نکلے تھے۔ایک صحافی نے اس صورتحال پر دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پشتونوں کی اہمیت چینی سے بھی کم ہے جس پر سپریم کورٹ ایکشن لے چکی ہے۔

ایم کیوایم کا مؤقف ہے کہ یہ ہلاکتیں پشتونوں اور ہزارہ والوں کے تنازعہ کی وجہ سے ہوئیں۔کوئی بھی ان سے یہ نہیں پوچھ رہا کہ اگر واقعی انہی کے درمیان جھگڑا تھا تو بڑے فریق یعنی پشتونوں یا اے این پی کے ارکان کی اتنی ہلاکتیں کیسے ہوئیں۔اگر اے این پی ہی حملہ آور قوت تھی تو یہ کس نوعیت کے حملے تھے کہ سب سے زیادہ نقصان حملہ آور قوت ہی کا ہوا۔یہ بھی کوئی نہیں پوچھ رہا کہ ہزارہ تحریک کے اصل مدعی تو دوسرے روز شاہی سید کے ساتھ بیٹھے پریس کانفرنس کررہے تھے جبکہ بابا حیدر زمان نے تو مقتولین کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتے ہوئے دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ پشتون ان کے بھائی ہیں اور ان کے ساتھ ہزارہ کے عوام کی کوئی دشمنی نہیں ہے۔ بابا حیدر زمان نے تو بعض رپورٹس کے مطابق یہاں تک کہا تھا کہ اگر ہزارہ صوبے کے قیام کا راستہ پشتون بھائیوں کی لاشوں پر سے ہوکر گزرتا ہے تو وہ اس تحریک ہی سے دستبردار ہوجاتے ہیں۔ایم کیوایم کا مقصد تو بالکل واضح تھا اور وہ یہ کہ وہ اپنے ایک سابق یوسی ناظم کے ذریعے ہزارہ قومی جرگہ کے پلیٹ فارم سے نہ صرف یہ کہ ہزارہ اور پشتون علاقوں کے لوگوں کو آپس میں لڑوانا چاہتی تھی، بلکہ ایک تیر سے دوشکار کرکے یہ سازش بھی کی کہ اے این پی بھی ہزارہ تحریک کو ان ہلاکتوں کا ذمہ دار ٹھہرا کر بدلہ لینے میدان میں نکل آئے۔اگر ایم کیوایم کی سنازش کامیاب ہو جاتی اور پشتونوں کو اصل حالات کا علم نہ ہوتا تو اس کا تو یہی نتیجہ نکلتا کہ پشتون یا اے این پی نامعلوم یا تیسری قوت کی بجائے اپنے ہی ہزارہ وال بھائیوں پر ان ہلاکتوں کی ذمہ داری عائد کرتی اور اس کے بعد بے شمار دوسرے معصوم لوگوں کی لاشیں بھی گر جاتیں۔تمام تحفظات اور اعتراضات کے باوجود اس حقیقت کو سراہا جانا چاہیے کہ اے این پی اور ہزارہ تحریک نے اس سازش کو ناکام بنا کر عملاً ثابت کردیا کہ وہ کسی اور کی سازش کا نہ تو شکار ہوں گے اور نہ ہی اپنا کندھا کسی اور کی بندوق کے استعمال کیلئے پیش کرنے کی حمایت کریں گے۔ہم ان سطور میں پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ وارزون کے ہمارے اس خطے کے تمام اکابرین اور سیاسی قوتوں کو نازک صورتحال اور علاقائی، عالمی سازشوں کا

ادراک کرتے ہوئے کوئی بھی قدم بہت احتیاط، بالغ نظری اور ذمہ داری سے اٹھانا چاہیے کیونکہ دوسرے علاقوں اور ہمارے خطے کے حالات میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ہم اپنے بے گناہ، معصوم اور غریب لوگوں کی لاشیں اٹھاتے اٹھاتے تھک چکے ہیں۔ہمیں اپنے عمل سے اپنی بدنامی، ناکامی اور تباہی کے دوسروں کے مسلط کردہ سلسلے اور بوجھ کو اب انتہائی فراست اور جرأت کے ساتھ اپنے کندھوں سے اتارنے کے اسباب ڈھونڈنا ہی پڑیں گے۔ہمیں اپنی غلطیوں کے ادراک کے علاوہ اپنے دوستوں کی تعداد بڑھانے کی بھی اشد ضرورت ہے، تاکہ اپنے کیس کو مضبوط بنانے کیلئے دوسروں کی دوستی اور تعاون سے بھی استفادہ حاصل کیا جاسکے۔
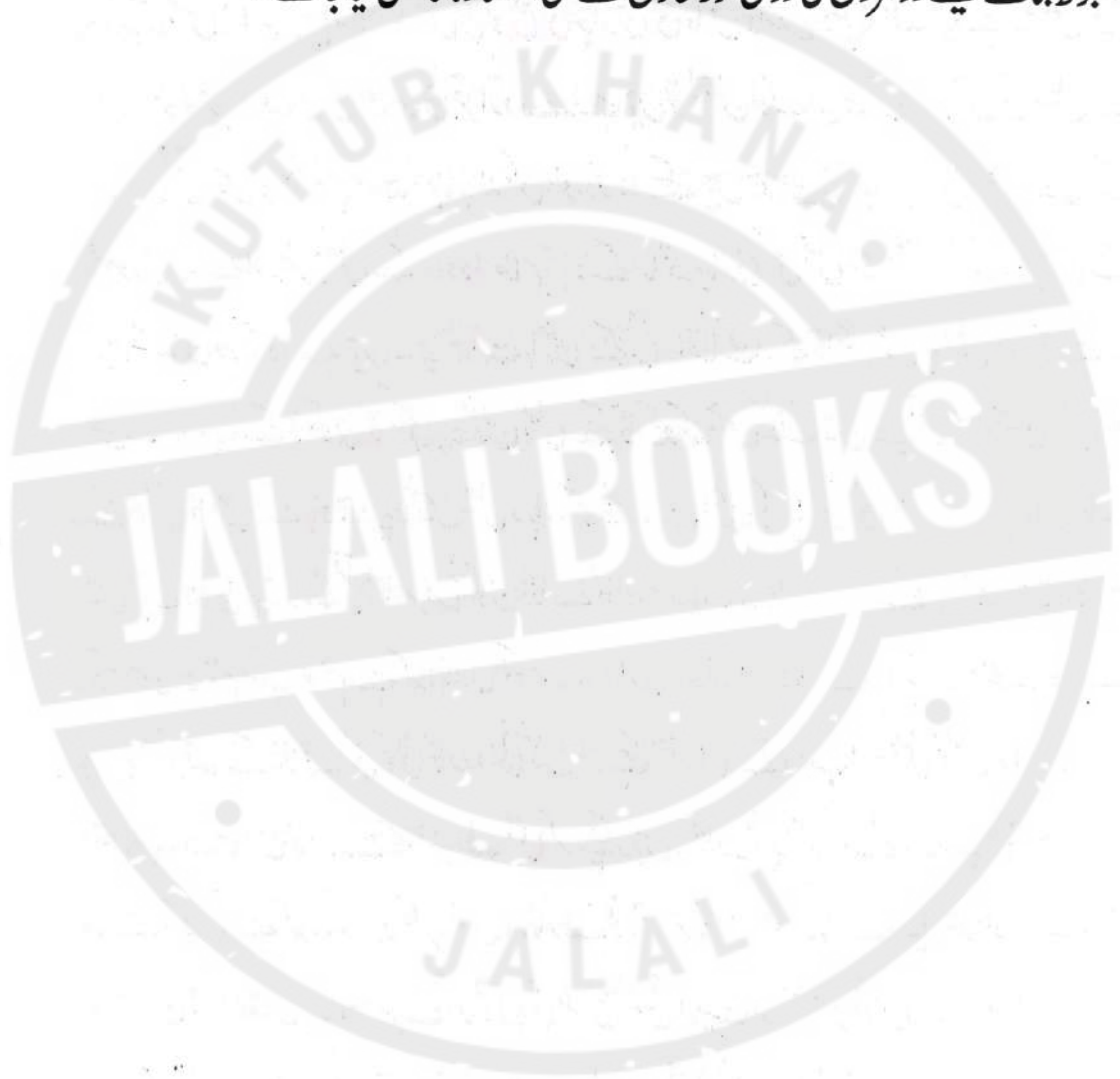
بلوچستان کی بغاوت کے ذمہ دار

گزشتہ چند روز کے دوران ان صفحات پر ہمارے سینئر کالم نگار بی این پی کے سیکرٹری جنرل حبیب جالب بلوچ کی شہادت پر مختلف زاویوں سے اپنی معلومات، تجزیے اور دوسری درکار تفصیلات قارئین کی نذر کر چکے ہیں۔ ان کے قتل پر تقریباً نوے فیصد تجزیہ کاروں کی متفقہ رائے ہے کہ اس واقعے سے اسلام آباد اور کوئٹہ کے درمیان پہلے سے موجود دوریوں میں مزید اضافہ ہوگا اور یہ کہ جس مذاکراتی یا مفاہمتی عمل کی توقع کی جا رہی تھی، اس کو شدید دھچکا لگ گیا ہے۔ بعض حلقے اس واقعہ کو خفیہ اداروں کی کارستانی قرار دے رہے ہیں تو بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن کی دلیل ہے کہ اس قتل میں وہ قوم پرست انتہا پسند بھی ملوث ہو سکتے ہیں جو حبیب جالب جیسے لیڈروں کے جمہوری رویے اور طرزِ عمل کے علاوہ اسلام آباد کے ساتھ جاری کسی بھی مفاہمتی عمل کو بلوچوں کے لیے نقصان دہ سمجھ رہے ہیں۔ یہ حقیقت ماضی کے تلخ واقعات کے تناظر میں بالکل واضح ہے کہ حبیب جالب کے قاتلوں کا کبھی پتہ نہیں چل سکے گا کیونکہ جس ملک میں بے نظیر بھٹو جیسی شخصیت کے قاتل کا اس کے باوجود پتہ نہیں چل رہا ہو کہ ملک میں انہی کی پارٹی کی حکومت ہے، اس ملک میں ایک بلوچ لیڈر کے قتل کا سراغ کون لگائے گا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کیوں لگائے گا۔ بلوچ قوم سمیت ہم سب کو علم ہے کہ ہماری حکومت، ہماری عدلیہ اور ہمارے دوسرے متعلقہ ادارے پرویز مشرف کے خلاف بھی کوئی کارروائی نہیں کر سکے جنہوں نے نواب اکبر بگٹی کو قتل کرایا تھا اور وہ متعدد بار اپنے اس کارنامے کا اعتراف بھی کر چکے ہیں۔ تاریخ پر نظر ڈالنے سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ ہمارے حکمرانوں، ہمارے فوجی جرنیلوں اور ہمارے سیاستدانوں نے کبھی بلوچستان کو پاکستان کے دوسرے علاقوں کی طرح کوئی اہمیت اور سٹیٹس نہیں دیا۔ ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ کبھی ہم نے بلوچستان کو دل سے قبول نہیں کیا تو کبھی بلوچ ہماری توقعات پر پورا نہیں اترے۔

1948ء سے 2010ء تک قدرتی وسائل اور افرادی قوت سے مالا مال یہ خطہ کبھی بھی سیاسی اور معاشی استحکام کی کسی مستقل حالت سے ہمکنار نہ ہو سکا۔ اب تک پاکستان کی متعدد قوتیں

مختلف حیلوں بہانوں سے اس صوبے میں نصف درجن کے لگ بھگ فوجی کارروائیاں کر چکی ہیں۔ 1948ء کو میر احمد یار کی مبینہ مزاحمت کو کچلنے کے لیے جس کارروائی کی ابتداء کی گئی تھی، وہ مختلف اوقات میں محدود اور لامحدود فوجی آپریشنوں کی صورت میں 2010ء تک جاری رہی۔ میر احمد یار کے ساتھ روا رکھے گئے سلوک ہی کا نتیجہ تھا کہ نواب نوروز خان کی قیادت میں 59-1958ء میں بلوچوں نے ریاست کے خلاف بغاوت کی اور ہماری مقتدر قوتوں نے ریاستی سطح پر نوروز خان کو مذاکرات اور صلح کے نام پر دھوکہ دے کر ہتھیار رکھنے پر مجبور کر کے ان کو ساتھیوں سمیت حیدرآباد کی بدنام زمانہ جیل میں ڈال دیا، جہاں پر تشدد کے باعث نوروز خان جیل کے اندر ہی زندگی کی بازی ہار گئے۔ اسی دھوکہ دہی اور مسلسل ریاستی زیادتیوں کے باعث رَدِعمل کے طور پر 64-1963ء میں بلوچ دوبارہ اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے شیر محمد خان کی قیادت میں پھر سے بغاوت اور مزاحمت کا راستہ اپنایا۔ اس مزاحمت کو کچلنے کے لیے ایک بار پھر فوج طلب کی گئی، جب اور جتنی بار فوجی کارروائی ہوتی گئی، اس کے چند مہینوں یا ایک دو برس بعد مزاحمت کی صورت میں ایک نئی بغاوت جنم لیتی رہی۔ عجب تماشا تو یہ رہا کہ ہر فوجی کارروائی کے بعد کہا گیا کہ ریاستی سطح پر بلوچوں کی محرومیوں اور مسائل کا ازالہ کیا جائے گا اور یہ کہ اب پہلے کی طرح بندوق کے زور پر بلوچوں کو کچلنے یا دبانے کی پالیسی نہیں اپنائی جائے گی، تاہم ہر بار اس قسم کے اعلانات اور وعدوں کو بے دردی سے ناقابلِ عمل قرار دے کر توڑا جاتا رہا اور یوں یکطرفہ مگر مستقل بلوچ کش پالیسی کا بے رحمانہ سلسلہ جاری رکھا گیا۔ ستر کی دہائی میں خان عبدالولی خان کی قیادت میں جب بلوچ قوم پرست جے یو آئی کے ساتھ اتحاد کی صورت میں نئے اعلان کردہ صوبے یعنی بلوچستان میں برسرِ اقتدار آ گئے تو یہ توقع پیدا ہو گئی کہ سقوطِ ڈھاکہ سے عبرت حاصل کرنے والی مقتدر قوتیں ایک سبق کے طور پر بلوچستان میں رہائش پذیر بلوچوں اور پشتونوں کی شکایات کا ازالہ کرتے ہوئے ایک بہتر اور حقیقت پسندانہ پالیسی اپنانے کا راستہ اختیار کر لیں گی، تاہم افسوس سے یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ 1973ء کے آئین کی منظوری کے فوراً بعد شاہِ ایران اور امریکہ کی خواہش پر وزیر اعلیٰ عطاءاللہ مینگل کی سربراہی میں قائم نیشنل عوامی پارٹی اور جے یو آئی کی اکثریتی حکومت کو ہٹ دھرمی سے ہٹا دیا گیا اور اس مکروہ کام کے لیے عراقی سفارت خانے سے غیر ملکی اسلحہ کی برآمدگی کا ڈرامہ

رچایا گیا۔ اس برطرفی کے ردِعمل میں اس وقت کی صوبہ سرحد کی صوبائی حکومت نے بھی بطورِ احتجاج استعفیٰ دیا اوراس کے نتیجے میں بھٹو کے خلاف ایک ایسی تحریک نے جنم لیا جس سے بعد میں پورے کا پورا نظام ہی زمین بوس ہوگیا۔ بھٹو نے صوبائی حکومت کی برطرفی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ انہوں نے کسی اور کے کہنے پر بلوچوں کو غدار قرار دے کران کے خلاف ایک بڑے آپریشن کا آغاز کردیا اوراس آپریشن کے نتیجے میں چار ہزار سے زائد بلوچوں کو اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے۔ آج ہم بعض حقائق اور اپنی غلطیوں پر پردہ ڈالنے کا راستہ اپنا کر مری قبائل کی افغانستان میں موجودگی کا یکطرفہ جواز پیش کررہے ہوتے ہیں تو ان کو بھی بھٹو حکومت کی پالیسی کے باعث ہجرت پر مجبور کیا گیا۔

2004ء میں جنرل مشرف نے بغیر کسی بغاوت یا مزاحمت کے جواز کے بلوچستان میں پھر سے آپریشن کا آغاز کردیا، اس آپریشن کے دوران ہی اگست 2008ء میں نواب اکبر خان بگٹی جیسی شخصیت کو شہید کیا گیا جو 1974ء میں پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کے وفادار لیڈر کے طور پر میر بخش بزنجو کی برطرفی کے بعد گورنر بنائے گئے تھے۔ اس الزام کو ایک مسلمہ حقیقت ہی سمجھا جائے کہ پاکستان کی مقتدر قوتیں اور اسلام آباد کی پالیسیاں ہی بلوچستان کو بغاوت کی راہ پر ڈالنے کی وجہ بنتی رہی ہیں، اوراس حقیقت کو بھی جھٹلایا نہیں جاسکتا کہ پاکستان کی سیاسی قوتوں نے بلوچ لیڈرشپ کا اس طریقے سے دفاع نہیں کیا جس کی ضرورت تھی یا جس کی بلوچوں کو توقع تھی۔ دھوکہ دہی پر مبنی ریاستی اور سیاسی فیصلے ہی بلوچستان میں ابھرتی بغاوتوں کے بنیادی اسباب رہے ہیں اور اب بھی ہیں۔ اس ضمن میں اس سے بڑی مثال اور کیا ہوسکتی ہے کہ خان عبدالولی خان نے سرحد حکومت کے استعفیٰ کے اپنے قابلِ ستائش فیصلے اور بلوچستان کا دورہ کرنے کے بعد ایک فیصلہ کن مرحلے پر بلوچ قوم پرستوں کو اپنے اتحاد سے بے دخل کرنے کا اقدام کیا۔ عرصہ دراز کے بعد جب ولی خان ہی کی خواہش پر پشتون، سرائیکی، سندھی اور بلوچ قوم پرست قوتوں پر مشتمل اتحاد پونم کا قیام عمل میں لایا گیا تو اے این پی نے اس کی سربراہی کا عہدہ رکھنے کے باوجود نواز شریف سے یکطرفہ رومانس میں اس اتحاد سے نکلنے کا اقدام اٹھا کر اس کو غیر فعال بنادیا۔ کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اگر آج بلوچ واقعتاً بغاوت یا علیحدگی کی راہ پر گامزن ہیں یا بعض لوگوں کے بقول وہ دوسروں کے ہاتھوں

بک گئے ہیں تو ان کو یہ راستہ نہ صرف یہ کہ ہماری مقتدر قوتوں نے دکھایا ہے، بلکہ اس جرم میں تمام سیاسی قوتیں بھی بوجوہ برابر کی شریک ہیں۔ ضرورت اس اُمر کی ہے کہ ملک گیر سطح کی پارٹیاں بلوچستان پر اپنا اپنا سٹینڈ مزید وقت ضائع کیے بغیر واضح کریں اور جو اہم رہنما بلوچوں کو منانے میں فعال کردار ادا کر سکتے ہیں، ان میں مولانا فضل الرحمان، اسفند یار ولی خان، محمود خان اچکزئی، عاصمہ جہانگیر اور علی احمد کرد شامل ہو سکتے ہیں۔ حکومت ان لوگوں کو اختیار دے کر بلوچوں کے پاس بھیج دے تو کافی مثبت نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ 14 جولائی (2010ء) کو جس روز حبیب جالب بلوچ کو شہید کیا گیا، اسی روز بھارتی وزیر خارجہ کرشنا راؤ کو اسلام آباد پہنچنا تھا۔

جنگ ابھی جاری ہے

انہی سطور کے ذریعے اس سے قبل متعدد بار گزارش کی جاچکی ہے کہ کہ اگر ملک گیر حیثیت کی سیاسی اور مذہبی قوتوں نے طالبان اور جہادیوں کے بارے میں قومی ہم آہنگی کے فارمولے کے تحت ٹھوس اور فوری حکمتِ عملی وضع نہیں کی تو یہ پرتشدد اور منظم تحریک پاکستانی ریاست کو اندرونی اور بیرونی سطح پر بدترین حالات اور نتائج سے دوچار کر دے گی۔ بدقسمتی سے پنجاب اور سندھ بیسڈ سیاسی قوتوں اور کسی حد تک پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں کو تمام تر زمینی حقائق، واقعات، عالمی دباؤ اور بدترین حملوں کے باوجود اس بات کا ادراک نہیں ہو رہا کہ پاکستانی ریاست اور سوسائٹی واقعتاً ایک بڑے خطرے سے دوچار ہیں۔ لاہور میں قادیانیوں کے مراکز پر منظم حملوں سے ہمارا یہ خدشہ بدقسمتی سے ایک بار پھر درست ثابت ہوگیا ہے کہ حملہ آور قوتیں نئی تکنیک، نئی صف بندی اور نئے اہداف کے ذریعے ایک نئے جذبے سے ریاست اور مخالفین پر حملے کرنے کی نہ صرف یہ کہ پلاننگ کر رہی ہیں، بلکہ وہ ایسا کرنے کی بھرپور صلاحیت بھی رکھتی ہیں۔ لاہور کے حملوں نے حملہ آوروں کی کمٹمنٹ اور قوتِ ارادی کے علاوہ ان کی صف بندی کو بھی ایک بار پھر کچھ اس انداز میں ثابت کر دیا ہے کہ اس کا اعتراف نہ کرنا اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے مترادف ہوگا۔ ریاستی فورسز، خصوصاً پولیس کی ناقص کارکردگی، خوف کے مظاہر اور حکمرانوں کی مبہم پالیسیوں نے عوام کی مایوسی کو اب بدترین تشویش اور خوف میں بدل دیا ہے۔ مرکزی، صوبائی حکومتوں اور انٹیلی جنس ایجنسیوں کے درمیان رابطے اور اعتماد سازی کے فقدان کو بھی قدم قدم پر محسوس کیا گیا۔ وزیرِ داخلہ رحمان ملک کے اس بیان کو قطعاً نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ مئی کے وسط میں پنجاب حکومت کو خبردار کیا گیا تھا کہ لاہور میں کسی اہم اقلیتی فرقے کے خلاف اس طرح کی بڑی کارروائی ہونے والی ہے۔ اس سے قبل پنجاب کی پرو جہاد مسلم لیگی حکومت نے سری لنکن ٹیم اور مناواں پولیس سنٹر پر حملوں کی پیشگی اطلاعات کو بھی رَدی کی ٹوکری کی نذر کر کے ان بڑے سانحات کا خود ہی راستہ ہموار کرنے کا رویہ اپنایا تھا۔ لاہور حملہ کے باوجود بھی پنجاب کے وزیرِ قانون رانا ثناء اللہ کا رویہ اور مؤقف پہلے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔ وہ لاہور پر گزشتہ تین سال کے عرصہ کے دوران 28 حملوں کے باوجود یہ

ماننے کو تیار نظر نہیں آ رہے کہ پنجاب حملہ آوروں کی زد پر ہے۔ 2008ء سے لیکر اب تک پنجاب پر 30 کے لگ بھگ حملے کیے جا چکے ہیں، جبکہ ایک محتاط اندازے کے مطابق 2002ء سے 2010ء سے اب تک لاہور سمیت پنجاب کے گیارہ شہروں کو ستر بار حملوں کا نشانہ بنایا جا چکا ہے۔ پنجاب ہی وہ پہلا صوبہ تھا جہاں ابتداء میں حملہ آوروں نے مری، ٹیکسلا اور راولپنڈی میں حملے کر کے پانچ مختلف مواقع پر اقلیتوں کے مذہبی مراکز کو نشانہ بنایا۔ اس وقت پاکستان میں درجنوں جہادی اور فرقہ پرست تنظیمیں موجود ہیں۔ ان میں سے 18 وہ پنجاب بیسڈ تنظیمیں ہیں، جن کے دفاتر، تربیتی مراکز اور کارکن اب بھی ریاست کی چھتری کے نیچے کالعدم ہونے کے باوجود اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ بہاولپور، ڈی جی خان، بہاولنگر، فیصل آباد، ملتان، قصور، خوشاب، ساہیوال، سیالکوٹ، گجرات، رحیم یار خان اور مظفر گڑھ وہ اہم شہر ہیں جہاں پر کالعدم تنظیمیں اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کے علاوہ انتظامیہ، حکومت اور سوسائٹی پر پوری قوت کے ساتھ اثر انداز ہوتی رہی ہیں۔ عالمی جہاد کے فلسفے پر یقین رکھنے والی آٹھ جہادی تنظیمیں بھی انتہائی منظّم طریقے سے پنجاب میں سرگرمِ عمل ہیں، ان میں سے چھ وہ ہیں جن کے القاعدہ کے ساتھ رابطے ہیں اور ان کے بعض کمانڈرز تحریکِ طالبان پاکستان کی سنٹرل کمانڈ کا حصہ بھی ہیں۔ عملاً تو لگ یہ رہا ہے کہ سٹریٹجک ڈیپتھ کی ہماری پالیسی واقعتاً اب ہمارے اپنے گلے میں پڑتی دکھائی دینے لگی ہے۔

صوبہ خیبر پختونخوا کے برعکس پنجاب میں دہشت گرد حملوں کی ابتداء سب سے پہلے ہوئی تھی۔ اس صوبے میں اقلیتوں اور مسلکی مخالفین کے خلاف کارروائیوں کا آغاز 2002ء کے دوران کیا گیا۔ 10 اکتوبر 2009ء کے جی ایچ کیو حملے سے قبل راولپنڈی میں دہشت گردی کی اٹھارہ کارروائیاں کی جا چکی تھیں۔ 25 دسمبر 2003ء کو سابق صدر جنرل (ر) پرویز مشرف پر بھی راولپنڈی میں حملہ کیا گیا تھا، جبکہ حملوں کا یہ سلسلہ 2007ء کے دوران انتہا کو پہنچ گیا۔ اس صوبے میں کی گئی ایک کارروائی کے دوران پی پی پی کی قائد بے نظیر بھٹو کو بیسیوں افراد سمیت شہید کیا گیا (27 دسمبر 2007ء) جبکہ متعدد اعلیٰ فوجی افسروں کو بھی ایسے ہی حملوں کے نتیجے میں جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ ایک معتبر رپورٹ کے مطابق 2003ء سے 2010ء تک پنجاب کے مختلف شہروں میں ایسی ہی کارروائیوں کے دوران چھ سو کے لگ بھگ شہریوں، فوج، ایف سی اور پولیس

کے اہلکاروں کو شہید کیا جا چکا ہے۔ راولپنڈی اور لاہور ہی وہ دو اہم شہر ہیں جن کو بار بار حملوں اور دھماکوں کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔ فیصل آباد، ملتان اور رحیم یار خان وہ تین شہر ہیں جن سے 2002ء کے بعد سب سے زیادہ القاعدہ ارکان گرفتار کیے گئے۔ اس تمام تر صورتحال کے باوجود پنجاب کے رہنماؤں خصوصاً مسلم لیگیوں کو اس خطرے کا احساس نہیں ہو رہا جو کہ پنجاب جیسے اہم صوبے کے سر پر نہ صرف یہ کہ ماضی میں منڈلاتا رہا ہے بلکہ اس کے پھیلاؤ کا سلسلہ اور بھی شدت کے ساتھ بڑھتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ یہ تو ابھی کل ہی کی بات ہے کہ رانا ثناء اللہ ایک ضمنی الیکشن کی مہم کے دوران ایک کالعدم تنظیم کے لیڈروں کی منت سماجت کے علاوہ حکومت کو مطلوب بعض افراد کو اپنے سکواڈ بلکہ اپنی سرکاری گاڑی میں بٹھائے ووٹ مانگ رہے تھے۔ پنجابی طالبان نہ صرف یہ کہ پشتون اور افغان طالبان کے فکری استاد رہے ہیں، بلکہ بیت اللہ محسود کی موت کے بعد ٹی ٹی پی کا تنظیمی ڈھانچہ بھی غیر اعلانیہ طور پر اب ان کے قبضے میں آ چکا ہے، چونکہ پنجاب میں انٹی انڈین فیکٹر بہت اہم اور فعال ہے۔ اس لیے پاکستان کے خفیہ ادارے ان تنظیموں کے ساتھ محض اس پالیسی کے تحت نرمی اور رعایت برتتے آئے ہیں کہ انہیں بوقتِ ضرورت بھارت کے خلاف استعمال کیا جا سکے۔ اس معاملے پر مزید تکرار میں کوئی برائی نہیں کہ فاٹا کے طالبان کو بھی نظریاتی اور تکنیکی سپورٹ پنجاب ہی سے ملتی آ رہی ہے۔ دوسرے علاقوں کے برعکس پنجابی حملہ آوروں کا طریقہ واردات اس حوالے سے کافی منفرد اور خطرناک ہے کہ یہ لوگ اقلیتوں اور ملکی مخالفین کے علاوہ فوج، انٹیلی جنس اداروں، ایف سی اور پولیس کو کچھ اس منظّم طریقے سے حملوں کا نشانہ بناتے ہیں کہ ریاست کی رٹ، اداروں کی اہلیت اور فورسز کی تربیت کے حوالے سے تشویش لاحق ہو جاتی ہیں۔ لاہور کے حالیہ دو واقعات کے دوران پولیس کی کارکردگی، سستی اور سراسیمگی جس انداز سے سامنے آئی ہے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پنجاب انتظامی اور حکومتی سطح پر خیبر پختونخوا اور سندھ کے مقابلے میں حملہ آوروں کے لیے آسان ترین ٹارگٹ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ یہ اَمر قابلِ تشویش ہے کہ گزشتہ تین سال کے دوران پولیس اور دوسرے متعلقہ اداروں نے اس قسم کے حملوں میں ملوث افراد میں سے محض تین ملزموں کو عدالتوں میں پیش کیا ہے۔ میڈیا رپورٹس کے مطابق 51 نامزد ملزمان میں سے اب تک بیس افراد کو گرفتار کیا جا چکا ہے، جبکہ باقی میں سے متعدد ایسے ہیں

جن کو گرفتاری کے بعد وزرا کے کہنے پر رہا کر دیا گیا اور وہ رہائی کے بعد دوبارہ ایسی سرگرمیوں کا حصہ بن کر حملے کرتے رہے۔ لگ یہ رہا ہے کہ لاہور میں اقلیتوں کے خلاف کی گئی کارروائی کا یہ سلسلہ اب دوسرے شہروں اور صوبوں تک بھی پھیل جائے گا کیونکہ پنجابی طالبان مسلکی اور مذہبی مخالفین کو کافروں سے بھی بدتر سمجھ کر ان کے ساتھ کسی بھی قسم کی رعایت پر یقین نہیں رکھتے۔ پے در پے واقعات اس خطرے کی بھی نشاندہی کر رہے ہیں کہ پاکستان کے خلاف عالمی دباؤ کا سلسلہ اب مزید بڑھے گا کیونکہ نورستان میں سواتی طالبان کی موجودگی اور لڑائی میں حصہ لینے کی اطلاعات کے بعد عالمی دباؤ میں ویسے بھی یکدم اضافہ ہو گیا ہے۔ اور شمالی وزیرستان میں آپریشن کی افواہیں اور خبریں بھی گرم ہیں۔ ان سطور کی تحریر کے وقت ایک معتبر امریکی اخبار کی اس رپورٹ نے تشویش میں اور بھی اضافہ کر دیا کہ امریکہ اور نیٹو افواج شمالی وزیرستان پر فضائی اور میزائل حملوں کے علاوہ سپیشل فورسز کے ذریعے بھی حملے کے امکان کا جائزہ لے رہی ہیں۔ لگ یہ رہا ہے کہ پاکستان کو اب بعض غیر مقبول فیصلے کرنا ہی پڑیں گے۔

ٹارگٹ کلنگ سے نسل کشی تک

کراچی میں جاری ٹارگٹ کلنگ کا سلسلہ حکومتی نااہلی، مرکزی وصوبائی حکومتوں کی غیر ذمہ داری اور بعض سیاسی قوتوں کی جانبداری کے باعث کسی وقفے کے بغیر نہ صرف یہ کہ جاری ہے بلکہ اس کی شرح میں دن بدن اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ پے در پے واقعات کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ 20 جولائی کو محض چوبیس گھنٹوں کے دوران مختلف علاقوں میں 13 افراد ہلاک اور سات زخمی کردیئے گئے۔ ہلاک ہونے والوں میں اے این پی کے تین مقامی عہدیدار بھی شامل تھے۔ کراچی میں نوے کی دہائی میں ایم کیو ایم ہی نے بوری بند لاشوں کے کلچر کو پروان چڑھا کر اس سلسلے کی بنیاد رکھی تھی اور اس تشدد پسند گروپ کا مخالفین کو راستے سے ہٹانے کا رجحان وقت کے ساتھ بڑھتا گیا۔ دستیاب معلومات کے مطابق 2007ء سے اب تک پانچ سو کے لگ بھگ افراد کو ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بنایا جاچکا ہے۔

اے این پی سندھ کے جنرل سیکرٹری امین خٹک کا دعویٰ ہے کہ ٹارگٹ کلنگ میں ہلاک ہونے والے ان پانچ سو افراد میں سے 265 پشتون ہیں اور ان میں اے این پی کے کارکنوں کی تعداد سو کے لگ بھگ ہے۔ 20 جولائی (2010ء) کو گلستان جوہر میں اے این پی کے جن تین عہدیداروں کو کیا گیا، ان میں ایک مہاجر اور ایک پنجابی بھی تھا۔ اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اے این پی اس شہر میں ایک مخالف پارٹی کے نشانے پر ہے۔ بعض حلقوں کا کہنا ہے کہ بات محض اے این پی کو دیوار سے لگانے تک محدود نہیں ہے بلکہ قاتلوں کی نظر میں ہر پشتون ان کا دشمن ہے اور یہی وجہ ہے کہ بیسیوں ایسے افراد کو بھی ہلاک کیا گیا جن کی اے این پی یا کسی اور پارٹی سے وابستگی تو کیا ہمدردی بھی نہیں تھی اور ان کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ پشتون تھے۔ امین خٹک کا مؤقف ہے کہ پولیس پہلے تو قاتلوں پر ہاتھ ڈالتی نہیں اور اگر بعض افراد گرفتار کیے جاتے ہیں تو ان کو سیاسی دباؤ کے باعث یا تو رہا کردیا جاتا ہے یا ان کو محکمانہ سپورٹ کے باعث روپوش کرواکر عدالتوں میں پیش نہیں کیا جاتا۔ ان کی نظر میں جو سیاسی قوت اس صورتحال کی ذمہ دار ہے، اس کے بارے میں اے این پی سمیت تمام سیاسی قوتوں کو پورا علم ہے، تاہم ضرورت اس اَمر کی ہے کہ قاتلوں کے

چہرے سے نقاب اٹھا دیئے جائیں اوران کے خلاف قانونی کارروائی کرتے ہوئے ملوث سیاسی قوت کا چہرہ بھی بے نقاب کیا جائے۔ پشتون فکری جرگہ کے سرخیل اور قوم پرست رہنما امیر حمزہ مروت کے مطابق پشتونوں کو ایک مستقل پالیسی کے تحت بار بار نشانہ بنانے کے اسباب میں حملہ آور قوتوں کے علاوہ اے این پی کی پالیسی کا بھی بڑا عمل دخل ہے۔ وہ الزام لگاتے ہیں کہ اس پارٹی نے سیاسی مفادات کے لیے مزدوری کرنے والے عام پشتونوں کو مہاجروں کے سامنے بطور دشمن لاکھڑا کیا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اے این پی کی آڑ میں پشتونوں کو بار بار نشانہ بنایا جارہا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ اے این پی سندھ میں قوت نہ ہونے کے باوجود پشتونوں کو دھمکیوں، مخالفت اور تصادم کی راہ پر ڈال کران کے لیے سندھ کی سرزمین تنگ کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ دوسری طرف ایم کیو ایم سمیت دوسری پارٹیوں کا دعویٰ ہے کہ ٹارگٹ کلنگ کے جاری سلسلے میں ان کے کارکنوں اور ہمدردوں کی بڑی تعداد بھی جان سے ہاتھ دھوبیٹھی ہے۔ کراچی سے شائع ہونے والے انگریزی کے ایک معتبر میگزین نے اپنی ایک حالیہ رپورٹ میں ہلاک ہونے والے سیاسی کارکنوں کی جو تفصیلات شائع کی ہیں، اگر وہ درست ہیں تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ کراچی میں تقریباً ہر سیاسی پارٹی کو ٹارگٹ کلنگ کے سلسلے کا سامنا ہے۔ میگزین نے دعویٰ کیا ہے کہ کہ اس شہر میں 1990ء سے اب تک 25 ہزار سیاسی رہنماؤں، کارکنوں اور عام لوگوں کو ہلاک کیا جاچکا ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق سیاسی کارکنوں کے لیے کراچی اس وقت دنیا کے غیر محفوظ اور خطرناک ترین شہر کی صورت اختیار کرچکا ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ صرف 2009ء میں مختلف واقعات میں 294 سیاسی کارکنوں کو ہلاک کیا گیا۔مختلف پارٹیوں کے ہلاک ہونے والے سیاسی کارکنوں کی جو تعداد بتائی گئی ہے، اس کے مطابق ایم کیو ایم 69 ہلاکتوں کا دعویٰ کرتی ہے، جبکہ ایم کیو ایم حقیقی کے ہلاک ہونے والے کارکنوں کی تعداد 69، پیپلز پارٹی کے 28، اے این پی کے 23، سنی تحریک کے 18 اور عام لوگوں کی ہلاکتوں کی تعداد 40 بتائی گئی ہے۔ دوسری طرف اے این پی کا دعویٰ ہے کہ اس کے سب سے زیادہ کارکن ہلاک ہوئے ہیں اور اب تک 100 کارکنوں کو نشانہ بنایا جاچکا ہے۔ ایک اور رپورٹ کے مطابق اب تک جن علاقوں میں ٹارگٹ کلنگ کے سب سے زیادہ واقعات رونما ہوئے ہیں، ان میں نیو کراچی 31، شاہ فیصل کالونی 29، ملیر 26، نارتھ ناظم آباد 18، لیاقت آباد 14، گلشنِ اقبال 15 اور اورنگی 20 ہلاکتوں

کے ساتھ سرِفہرست ہیں۔کراچی میں موجود صائب الرائے پشتون حلقوں کے مطابق 2009-10ء کے دوران پشتونوں ہی کو بار بار ٹارگٹ بنانا ایک بڑی اور منظّم سازش کا سلسلہ دکھائی دے رہا ہے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کا خیال ہے کہ اے این پی کا پشتونوں کا مقدمہ لڑنے کا سرے سے کوئی سیاسی یا تنظیمی پلان ہے ہی نہیں۔ان کی نظر میں مہاجروں اور عام پشتونوں کی پوزیشن اور سٹیٹس میں فرق کے باعث ان کے درمیان عملاً مفادات کا کوئی ٹکراؤ نہیں ہے، تاہم اے این پی کی یکطرفہ اور ناکام پالیسیوں کے باعث ہر پشتون کو اے این پی کا حصہ سمجھ کر انتقام کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ان حلقوں کا مؤقف ہے کہ اس پارٹی کی سندھ کے حوالے سے پالیسی بلیک میلنگ اور دھونس دھمکیوں پر مبنی ہے اور اس کی سزا عام پشتونوں کو امتیازی سلوک اور ہلاکتوں کی صورت میں بھگتنی پڑ رہی ہے۔ یہ تاثر بھی موجود ہے کہ اے این پی کے اہم لیڈر پشتون کارڈ کو سیاسی اور تنظیمی فائدے کی بجائے ذاتی مفادات کے لیے استعمال کر رہے ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ صوبائی صدر سمیت متعدد دوسرے پارٹی کی وجہ سے چند ہی برسوں میں لکھ پتی سے کروڑ پتی بن گئے ہیں۔

افسوس ناک امر یہ ہے کہ وزارتِ اعلیٰ کا عہدہ رکھنے والی پی پی پی اس تمام صورتحال سے عملاً الگ تھلگ دکھائی دے رہی ہے۔اس کی وجہ یہ بتائی جارہی ہے کہ پی پی سندھی آبادی میں سٹرانگ ہالڈر رکھنے کے باعث کراچی کے حالات میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہی۔ یہ تاثر بھی عام ہے کہ سندھی آبادی اور اس کی قیادت کی نظر میں مہاجروں اور پشتونوں کی باہمی چپقلش اور تصادم سندھیوں کے لیے فائدے کا سبب ہے کیونکہ سندھی اس صوبے کو اپنی ملکیت سمجھ کر مہاجروں اور پشتونوں دونوں کو قابض قوتوں کا نام دے رہے ہیں۔ایک کمزور وزیراعلیٰ اور ان کی ٹیم کو عملاً ایم کیو ایم نے جس طریقے سے یرغمال بنایا ہوا ہے اور اے این پی جس غیر سنجیدگی کا مظاہرہ کرتی دکھائی دے رہی ہے، اس پر محض یہی کہا جاسکتا ہے کہ اگر ایک طرف فاٹا اور پختونخوا میں عسکریت پسندوں کے ہاتھوں پشتونوں کو نسل کشی کی صورتحال کا سامنا ہے تو دوسری طرف اس بدنصیب قوم کو کراچی میں ایم کیو ایم اور بعض دوسری قوتوں کے باعث بدترین انتقامی رویے کی بھینٹ بھی چڑھایا جارہا ہے۔ جہاں تک اسلام آباد اور لاہور کے حکمرانوں کے ردِعمل اور کردار کا تعلق ہے، ان کو تو جعلی ڈگریوں، افغانستان کی جنگ اور علاقائی جوڑ توڑ کی سیاسی سرگرمیوں اور ایشوز سے فرصت نہیں ہے۔

بے بسی سے بے حسی تک

حکمرانوں نے جس پالیسی کی بنیاد ستر کی دہائی میں رکھی تھی، اس کے اثرات اور منفی نتائج ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے، پے در پے واقعات سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ پاکستان کے اندر ایک انتہائی منظّم اور خطرناک گوریلا جنگ لڑی جا رہی ہے اور گزشتہ چند ماہ سے اس میں اور بھی شدت آ گئی ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق سال 2001ء سے 2010 تک، دس برسوں کے دوران پاکستان میں شدت پسندوں کی جانب سے 5910 حملے کیے جا چکے ہیں، ان میں سے 17 سو حملے انتہائی شدت کے حامل تھے۔ اگر ان نتائج پر غور کیا جائے تو یہ نتیجہ اخذ کرنا کوئی مشکل کام نہیں رہتا کہ پاکستانی ریاست بد ترین قسم کے حملوں کا سامنا کرتی رہی ہے اور ایک درجن سے زائد فوجی آپریشنوں کے باوجود حملہ آوروں کی کمر نہیں توڑی جا سکی، ان کی تعداد کم ہوئی اور نہ ان کے پاس خود کش حملہ آور ختم ہوئے، نہ اسلحہ ختم ہوا اور نہ ہی جنگ کے لیے درکار مالی وسائل میں کوئی کمی واقع ہوئی۔ دوسری طرف معاشرے اور متعدد سیاسی حلقوں میں ان حملہ آوروں کے حامی بھی تا حال موجود ہیں۔ اس نکتے کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے کہ متعدد غیر ملکی قوتیں (اسلامی ممالک و تنظیمیں) اس جنگ کو سپورٹ کر رہی ہیں اور ان کی بنیادیں اس قدر مضبوط ہیں کہ تمام تر کوششوں کے باوجود ان کو آٹھ برس کے دوران ہلایا بھی نہیں جا سکا۔

کوئی بھی گوریلا جنگ غیر ملکی امداد اور تعاون کے بغیر نہیں لڑی جا سکتی۔ گوریلا جنگ کے آغاز یا اس کی کامیابی کے لیے ماہرین نے جن اہم نکات یا ضروریات کو لازمی قرار دیا ہے، ان میں آئیڈیالوجی، چھپنے کے مؤثر مقامات، سپلائی لائن کی فعالیت اور مضبوط مالی پوزیشن سر فہرست ہے۔ ثابت یہ ہوتا ہے کہ حملہ آور قوتوں اور تنظیموں کو یہ تمام سہولیات حاصل ہیں، اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ملک کے کسی بھی حصے یا علاقے میں کسی بھی طبقے یا شخص یا مقام کو انتہائی کامیابی کے ساتھ نشانہ بنانے کا ریکارڈ قائم نہ کرتیں۔ اس حقیقت کو ماننا پڑے گا کہ ان حملہ آوروں کو ہمارے معاشرے کے بعض اہم طاقت ور حلقوں یا طبقوں کے علاوہ ان غیر ملکی عناصر کی بھی آشیر باد حاصل ہے جو پاکستانی معاشرے میں بوجوہ طویل عرصے سے بہت اہمیت اور اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔ یہ تاثر

بالکل درست ہے کہ حملہ آوروں نے پہلے تو معاشرے میں اپنے ہمدرد اور حامی پیدا کیے اور اگر کسی نے ان کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کی تو اس کو عبرت کا نشانہ بنا کر دوسروں کو بھی خاموش کر دیا۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کو ان کی آئیڈیالوجی اور مضبوط سپلائی لائن نے نیا خون فراہم کر کے اور بھی مضبوط بنا دیا ہے۔ معاشرے میں ان کی مذمت اور مخالفت کا تصور ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ بعض لوگ ان کے حامی ہیں تو بے شمار ایسے ہیں جن سے خوف کے باعث بولا نہیں جا رہا۔ گڈ اور بیڈ طالبان کی تقسیم نے بھی معاشرے کو ابہام کی صورتحال سے دوچار کر دیا ہے۔ سیاسی اور جمہوری قوتوں نے ان کے خلاف عوامی رائے عامہ ہموار کرنے کی بنیادی ضرورت سے ہمیشہ صرفِ نظر کیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے نظریات کے خلاف عوامی اور علمی سطح پر کوئی مؤثر آواز نہیں اٹھی۔ 5910 حملوں نے پاکستانی ریاست اور معاشرے کو ہلا کر رکھ دیا ہے اور ریاست کی قوت اور صلاحیت پر اٹھتے سوالات بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ دوسری طرف حملہ آوروں کی کارروائیاں حکمتِ عملی کی سطح پر اور نفسیاتی طور پر بڑھتی ہی دکھائی دے رہی ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق پاکستانی معاشرہ بدترین قسم کے خوف، عدم تحفظ اور بے چینی کی کیفیت سے دوچار ہے اور عوام اپنے مستقبل کے علاوہ اپنے ملک کے مستقبل کو بھی انتہائی تشویش اور بے یقینی کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ ریاستی اور سیاسی اداروں پر اکثریتی عوام کا اعتماد کم ہوتا جا رہا ہے جبکہ سیاسی اور جمہوری عمل کی سست روی اور اس میں موجود نقائص میں اضافہ بھی عوامی بداعتمادی کی ایک بڑی وجہ ہے۔

ریاستی اور سیاسی اداروں کی ناکامیوں نے ہر اس نظریے، فورم یا تنظیمی قوت کے کام کو اور بھی آسان بنا دیا ہے جو ریاستی نظام سے بیزاری اور مزاحمت کی راہ پر گامزن ہے، یعنی اگر ریاست اور سیاست کی کامیابی کی شرح بڑھ گئی ہوتی، سماجی اور معاشرتی ڈھانچہ مضبوط ہوتا اور عوام کا اپنی لیڈر شپ پر اعتماد بحال ہوتا تو آج نتائج کافی مختلف ہوتے۔ عوام چونکہ خود کو اس ریاستی اور سیاسی نظام کا حصہ نہیں سمجھتے اور وہ نظریاتی طور پر اپنی وابستگی کو مضبوط اور اطمینان بخش نہیں سمجھ رہے، اس لیے وہ جاری شورش یا گوریلا جنگ کی راہ میں عملاً کوئی بڑی رکاوٹ نہیں ڈال رہے۔ یہی وہ مسئلہ ہے جس نے سیاسی اور ریاستی اداروں کے لیے مقاصد کے حصول بہت مشکل بنا دیا ہے کیونکہ کوئی بھی جنگ عوام کی حمایت کے بغیر نہیں جیتی جا سکتی۔ قانونی نظام میں سقم کے باعث جہاں عام

شہریوں کو تحفظ اور انصاف نہیں مل رہا، وہاں اس نظام کی وجہ سے گرفتار حملہ آوروں کی بہت بڑی تعداد سزاؤں سے بھی بچ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر گزشتہ دو سال کے دوران صرف راولپنڈی کی انسدادِ دہشت گردی کی عدالتوں نے کل پندرہ کیسوں کی سماعت کی، ان میں سے 13 کیسوں میں ملزمان کی رہائی کے احکامات جاری کیے گئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ 95 فیصد سے زائد ملزمان کو عدم ثبوتوں کے باعث رہائی مل رہی ہے۔ چونکہ ملک میں وہی معمول کے فرسودہ قوانین اور تفتیش کا سلسلہ رائج ہے اور ان کی وجہ سے شہادتیں دستیاب نہیں ہوتیں۔ اس لیے ملزمان ٹرائل کے بعد رہا ہو جاتے ہیں۔ ابھی تک اتنے بدترین سانحات اور واقعات کے باوجود ریاست نے اس مسئلے کے حل کے لیے کوئی قانون سازی نہیں کی جس سے ریاست کی سنجیدگی کا اندازہ مشکل کام نہیں رہ جاتا۔ بدترین جنگ کی صورتحال سے دوچار پاکستان کی حالت یہ ہے کہ یہاں پر انسدادِ دہشت گردی یا اندرونی تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے کوئی الگ اور فعال ادارہ بھی قائم کرنے کی نوبت نہیں آسکی، حالانکہ افغانستان جیسے ملک میں بھی امریکہ کے ادارے ہوم لینڈ سکیورٹی کی طرز پر ایک الگ ادارے کا قیام عمل میں لایا جا چکا ہے۔ بعض رپورٹس یہ بات ثابت کرتی ہے کہ افغانستان جیسے ملک میں مقامی اور غیر مقامی فورسز کے ہاتھوں حملہ آوروں کی کارروائیوں کو روکنے کی شرح پاکستان کی فورسز کے مقابلے میں بہت زیادہ بہتر ہے، جبکہ افغان معاشرہ پاکستان کی طرح فکری اعتبار سے بہت زیادہ منقسم نہیں ہے اور وہاں صرف دو ہی نظریات مقبول ہیں، یعنی عوام یا تو موجودہ سیاسی سیٹ اپ کی حمایت کر رہے ہیں یا اس کی کھل کر مخالفت کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس پاکستانی معاشرہ اختلاف در اختلاف اور تقسیم در تقسیم کی ایک مستقل حالت سے دوچار ہے اور اس صورت حال کے بہت منفی نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔ اکثر دانشوروں اور ماہرین کے اعداد و شمار واقعات، دلائل اور نتائج پر توجہ دینے اور بحث کرنے کی بجائے اپنی خواہشات کے اسیر دکھائی دے رہے ہیں، جبکہ بہت سے معززین حال اور مستقبل کی بجائے ماضی کی حسین یادوں میں کھوئے نظر آتے ہیں۔ روس کو شکست دینے کی حسین یاد تا حال ہمارے ذہنوں سے نکلنے کا کوئی نام نہیں لے رہی۔ حالانکہ ایسا کہتے وقت ہم یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ امریکہ کی قیادت میں لڑی جانے والی اس جنگ میں سوویت یونین ایک طرف تھا اور باقی پوری دنیا دوسری طرف تھی۔ اگر ہم حقیقتاً اتنے ہی اچھے منصوبہ ساز اور طاقت ور تھے کہ سوویت یونین کو شکست دے سکتے تھے تو آج

ہم چند ہزار غیر ریاستی عناصر سے ایک بڑی ریاست ہونے کے باوجود اپنے ملک کو بچانے کی صلاحیت کیوں نہیں رکھتے۔ انتہائی دکھ کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ جولائی (2010ء) کا مہینہ مئی اور جون سے بھی بدتر ثابت ہونے والا ہے، اس کے دوران حملوں کی تعداد اور شدت میں اور بھی اضافے کی اطلاعات زیر گردش ہیں جبکہ عالمی دباؤ بھی خطرناک حد تک بڑھنے والا ہے۔ اس صورتحال سے نمٹنے کے لیے اگر ہم نیرو کی طرح چین کی بانسری بجانے کے بجائے اپنے انفرادی اور اجتماعی کردار اور صف بندی پر توجہ دیں تو شاید ہمارا ملک اور ہمارا معاشرہ اس صورتحال سے نکل آئے۔ لاتعلقی اور خاموشی نے اجتماعی بے بسی کی جو کیفیت ہم پر مسلط یا طاری کر دی ہے، وہ قومی اور اجتماعی بے حسی کو جنم دے رہی ہے اور بے حس قوموں، ملکوں یا معاشروں کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا۔ اب ہمیں لکیر کے کسی ایک طرف ہونا ہی پڑے گا۔

عدالتی نظام میں اصلاحات کی ضرورت

پاکستان کے عدالتی نظام اور تفتیش کے مروجہ طریقۂ کار میں موجود نقائص دہشت گردی کیخلاف جاری جنگ پر اثر انداز ہوئے ہیں اور دہشت گردی کے الزام میں زیرِ حراست سینکڑوں افراد کو تا حال سزا نہیں سنائی جا سکی۔ وزیر داخلہ رحمان ملک نے 2 اگست کو اپنے ایک بیان میں کہا کہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کی حراست میں موجود افراد کی تعداد 3141 یا 3441 ہے۔ ان میں سے 2013 (تقریباً 66 فیصد) کا تعلق خیبر پختونخوا سے ہے۔ ان کے بیان کے مطابق صرف ایک سال (2009ء سے 2010ء) کے دوران پاکستان میں 350 افراد دہشت گردی کا نشانہ بنے جبکہ گزشتہ تین برسوں کے دوران صرف پنجاب میں 505 افراد ہلاک جبکہ 1720 زخمی ہوئے۔ غیر جانبدار حلقوں کے مطابق ہلاکتوں کی تعداد وزیر داخلہ کے بیان کیے گئے اعداد و شمار سے کہیں زیادہ ہے کیونکہ گزشتہ تین برسوں کے دوران پاکستان کے تمام بڑے شہروں کو تواتر کے ساتھ نشانہ بنایا جاتا رہا ہے۔ خیبر پختونخوا پولیس کی ایک رپورٹ کے مطابق 2008ء سے اب تک پولیس کے 44 افسروں سمیت ہلاک ہونے والے اہلکاروں کی تعداد 400 سے زائد ہے۔ ایف سی کے شہید ہونے والے اہلکاروں کی تعداد بھی اتنی ہی بتائی جا رہی ہے جبکہ صرف سوات میں پاک فوج کے 2 ہزار سے زائد افسر اور اہلکار شہید ہوئے۔ اگر تمام اعداد و شمار کو اکٹھا کیا جائے اور گزشتہ چند برسوں کے دوران فورسز کے شہید ہونے والے افسروں اور اہلکاروں کی تعداد کا محتاط اندازہ لگایا جائے تو یہ تعداد 5 ہزار سے تجاوز کر جاتی ہے، اس میں پاک فوج، آئی ایس آئی، پولیس، ایف سی، فرنٹیر کانسٹیبلری اور ایجنسی رضا کار (خاصہ دار وغیرہ) شامل ہیں۔ فورسز کے علاوہ شہریوں اور سیاسی کارکنوں کی ایک بڑی تعداد کو بھی نشانہ بنایا جاتا رہا۔ اس ضمن میں عوامی نیشنل پارٹی کی مثال دی جا سکتی ہے، جس کے 2008ء سے اب تک 500 سے زائد کارکنوں اور رہنماؤں کو نشانہ بنایا جا چکا ہے۔ اس فہرست میں اراکینِ صوبائی اسمبلی، اہم رہنما اور ان کے قریبی رشتہ دار بھی شامل ہیں۔

گزشتہ چند برسوں کے دوران فاٹا میں دہشت گردی کی کارروائیوں میں ہونے والی

ہلاکتوں کے درست اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں، تاہم صورتحال کی سنگینی کا اندازہ اس اَمر سے لگایا جاسکتا ہے کہ 2005ء سے 2010ء کے دوران دہشت گردی کی کارروائیوں کا نشانہ بننے والے قبائلی سرداروں، سرکاری ملازمین اور حکومت کے حامیوں کی تعداد 500 سے 700 کے درمیان ہے۔ اَمن تحریک اور آریانا ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی دو رپورٹوں کے مطابق فاٹا اور پختونخوا میں 2004-05ء کے بعد تقریباً 50 ہزار لوگ دہشت گردی کی کارروائیوں کا نشانہ بنے ہیں، ان میں زخمی بھی شامل ہیں جو دہشت گردی کی کارروائیوں کے باعث عمر بھر کیلئے معذور ہو چکے ہیں اور ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ ان تمام اعداد و شمار کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہزاروں پاکستانیوں کی ہلاکتوں میں ملوث اب تک کتنے افراد کو گرفتار کیا جاسکا ہے اور اس سے بھی اہم یہ ہے کہ گرفتار ملزموں میں سے کتنوں کو سزائیں سنائی گئی ہیں۔

یہ اَمر باعث تشویش ہے کہ 98 فیصد ملزموں کو عدالتوں نے بے گناہ قرار دیتے ہوئے باعزت بری کر دیا۔ اس خطرناک رجحان کی بنیادی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ جن چند ایک ملزموں کو عدالتوں میں پیش کیا جاتا ہے، ملکی قوانین اور عدالتی نظام کے تحت ان کیخلاف یا تو گواہ نہیں ہوتے یا لوگ گواہی دینے نہیں آتے یا متعلقہ تفتیشی ادارے بوجوہ ملزموں کے خلاف ثبوت فراہم نہیں کر پاتے۔ ملک کا عدالتی نظام ہنوز زمانہ امن کے مروجہ فرسودہ عدالتی اور تفتیشی طریقۂ کار کے مطابق چل رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ متعدد ان ملزموں کو بھی رہائی ملتی رہی جنہوں نے دوران تفتیش دہشت گردی کی سرگرمیوں میں ملوث ہونے کا اعتراف کیا۔ موجودہ عدالتی نظام کے تحت کسی بھی ملزم کو اس وقت تک سزا نہیں سنائی جاسکتی جب تک اس کے خلاف گواہ نہ ہوں۔ اس ضمن میں ہم سوات کی مثال دے سکتے ہیں، فروری 2008ء سے مئی 2009ء کے دوران سوات کی تین تحصیلوں کے حالات اس قدر خراب ہو گئے تھے کہ پولیس ان علاقوں سے پسپا ہو گئی تھی۔ اس تمام عرصہ کے دوران نصف درجن سے زائد پولیس اسٹیشنوں کو تالے لگے رہے۔ ان علاقوں میں سینکڑوں افراد کو نہ صرف یہ کہ شہید بلکہ بیسیوں کو ذبح بھی کیا گیا۔ بے شمار گھروں کو نذرِ آتش کر دیا گیا جبکہ املاک پر قبضے بھی کیے گئے۔ مروج طریقۂ کار کے مطابق عدالت کیس کی پیروی اس وقت تک نہیں کر سکتی جب تک پولیس کے پاس مقدمہ درج نہیں کرایا جاتا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے

کہ جن مہینوں کے دوران پورے علاقے میں ریاست کی رٹ ہی مفقود تھی، اس عرصہ کے دوران ہلاک ہونے والے افراد کو کس طرح انصاف دلایا جا سکتا ہے۔ دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ جن حالات میں یہ قتل عام ہوا، ایف آئی آر کیسے درج کروائی جاتی (پولیس تو تھی ہی نہیں) اور حالتِ جنگ میں ہونے کے باعث کس کے خلاف درج کروائی جاتی۔ ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ملزموں کے خلاف گواہی ہی ان کو سزا دینے کی بنیادی شرط ہے تو کیا طالبان حملے سے قبل لوگوں کو ایسی کارروائیوں کی اطلاع دیا کرتے تھے یا پھر کوئی ایسا طریقہ ہے، جس کے ذریعے نقاب پوش حملہ آوروں کی شناخت ممکن بنائی جا سکتی تھی۔ باعثِ حیرت اَمر یہ ہے کہ ہمارے تفتیشی ادارے اور عدالتی نظام ایسی خوفناک گوریلا جنگ کے مخصوص حالات کے مقدمات کے فیصلے بھی زمانہ اَمن کے اس فرسودہ نظام کے تحت دے رہا ہے جو کہ عام جرائم کے تدارک میں بھی کبھی کامیاب نہیں ہوسکا۔ ملزموں کی رہائی کی ایک دوسری بڑی وجہ ججوں کو دی جانے والی وہ دھمکیاں بھی ہیں جو ان کو مقدمات کی سماعت سے قبل اور ان کی سماعت کے دوران ملتی رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ گواہوں کو تحفظ فراہم نہ کرنے کے ریاستی رویے کے باعث بھی وہ عدالتوں میں پیش ہونے سے گھبراتے ہیں۔

عدالتی اور تفتیشی نظام میں موجود خامیوں کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ حکومت نے گزشتہ ایک عشرے کے دوران عدالتی نظام میں موجود نقائص دور کرنے کے لیے کوئی ایک بھی قابل ذکر قدم نہیں اٹھایا، جبکہ شہداء کے لواحقین کو انصاف کی فراہمی ریاست کے فرائض میں شامل ہے۔ اکثر زیرِ حراست عسکریت پسند ملاقاتیوں سے اپنی بات چیت کے دوران کھلے عام یہ کہتے ہیں کہ ریاستی ادارے ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور یہ کہ وہ بہت جلد رہا ہو کر واپس آ جائیں گے۔ پاکستان کے آئین کے مطابق، کسی بھی ایسے شخص کے خلاف بغاوت کا مقدمہ چلایا جا سکتا ہے جو کہ یا تو ریاست کے منافی سرگرمیوں میں ملوث ہو یا دوسروں کو ایسا کرنے پر اکسا رہا ہو۔ اگر آئین میں بیان کیے گئے اس طریقۂ کار پر عمل کیا جائے تو اس کے تحت بے شمار لوگوں کو سزائیں سنائی جا سکتی ہیں۔

تحریکِ نفاذ شریعت محمدی کے سربراہ صوفی محمد کے خلاف 16 جولائی کے روز پشاور جیل میں ہونے والی سماعت میں چار نامزد گواہوں نے عدالت میں پیش ہونا تھا، تاہم ان میں سے صرف ایک کو گواہی کیلئے عدالت میں لایا گیا۔ اس سے قبل اس مقدمے کی گزشتہ سماعت اس لئے

بے نتیجہ رہی تھی کہ متعلقہ تفتیشی افسر عدالت میں حاضر نہیں ہوئے۔ صوفی محمد پر تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ 302 اور 324 کے تحت کارروائی کی جانی ہے۔ ان پر دیر میں 16 پولیس اور ایف سی اہلکاروں کو قتل کرنے یا انہیں قتل کروانے کا مقدمہ بھی درج ہے، تاہم یہ اَمر باعثِ افسوس ہے کہ یہ دونوں متاثرہ ادارے اپنے شہید ساتھیوں کے مقدمات میں اس دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کر رہے، جس کی ضرورت ہے۔ بعض حلقوں کے مطابق دوسروں کی طرح موصوف بھی گواہوں کی عدم پیشی کے باعث اس قدر سنگین الزامات اور مقدمات سے بری ہو جائیں گے۔ موصوف کے 'اعتماد' کی یہ حالت ہے کہ انہوں نے اپنے اوپر عائد اس قدر سنگین الزامات کے باوجود دفاع کے لیے وکیل کی خدمات حاصل کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا موٗقف ہے کہ اسلام میں وکیل کرنا جائز نہیں ہے۔ یہ وہی صوفی محمد ہیں جنہوں نے سوات آپریشن سے قبل گراسی گراؤنڈ مینگورہ میں ہزاروں افراد اور میڈیا کے لاتعداد کیمروں کے سامنے پاکستان کے آئین، قوانین، پارلیمنٹ اور سپریم کورٹ کو 'کفر کی نمائندہ' کہہ کر اس کے خلاف کھلی بغاوت کا اعلان کر دیا تھا اور ان کی یہ تقریر پاکستان کے تمام بڑے ٹی وی چینلوں نے براہِ راست دکھائی تھی۔ موجودہ عدالتی نظام کے تحت تقریر، بیان اور کسی واقعہ کے ویڈیو جیسے شواہد کی بنیاد پر بھی کسی کو سزا نہیں دی جاسکتی۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو سوات کے طالبان کمانڈرز کو سزا ہو چکی ہوتی جو کہ سکیورٹی اداروں کی حراست میں ہیں اور شہیدوں کے ورثاء کو انصاف مل گیا ہوتا۔ ان سرکاری ملازمین کے مقدمات میں بھی کوئی پیش رفت نہیں ہو رہی جن کو ٹھوس شواہد کی بنیاد پر طالبان کے ساتھ تعاون کرنے کی پاداش میں معطل یا برخاست کیا جا چکا ہے۔

1997ء سے اب تک انسدادِ دہشت گردی کے قوانین اور طریقۂ کار میں چار پانچ بار ترامیم کی گئی ہیں، تاہم ان ترامیم کے باوجود پاکستان میں دہشت گردی میں ملوث افراد کو سزائیں دینے کی شرح نہ ہونے کے برابر ہے۔ قانونی طور پر وہ تمام سرگرمیاں دہشت گردی کے زمرے میں آتی ہیں جن کے باعث ریاست کی رٹ کو چیلنج کیا جاسکتا ہو۔ 2009ء میں ہی وزیرِ داخلہ رحمٰن ملک نے سینٹ میں انسدادِ دہشت گردی کے قوانین کا جو ترمیمی بل پیش کیا تھا، اس کے مطابق اسلحہ کے زور پر سرکاری اور نجی املاک کو نقصان پہنچانا، قانون نافذ کرنے والے اداروں کے مقابل

مزاحمت کرنا اور غیر قانونی ایف ایم ریڈیو چینل نشر کرنا دہشت گردی ہے۔اس بل کے علاوہ جن ترامیم کی سفارش کی گئی ہے، ان کے مطابق ایسے ملزموں کو عدالت میں پیش کیۓ بغیر 90 دن تک زیرِ حراست رکھا جا سکتا ہے۔اس کے علاوہ ان کا ٹرائل بند کمرے میں ہوگا اور یہ بھی کہ ملزمان کو دس سال کی سزا ہو سکے گی۔

اس وقت ضرورت اس اَمر کی ہے کہ حکومت دہشت گردی کے قوانین کو بہتر بنانے کے لیے فوری طور پر اقدامات کرے تاکہ خونِ شہیداں رائیگاں نہ جائے۔اس کے ساتھ ہی ججوں کی سکیورٹی فول پروف بنائی جائے اور خاص طور پر نچلی عدالتوں کے ججوں کو کسی طور پر عدم تحفظ کا احساس نہیں ہونا چاہیے، جبکہ زیرِ التوا مقدمات کو بھی فوری طور پر نپٹایا جائے۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے تمام ریاستی اداروں کو اپنی ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے نبھانے کی ضرورت ہے۔

تاریخ سے رجوع کرنے کی ضرورت

کچھ عرصہ قبل روزنامہ مشرق سمیت پاکستان کے تقریباً تمام اخبارات میں شائع ہونے والی اس خبر کا شاید ہی کسی نے زیادہ نوٹس لیا ہو، جس میں سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض میں ایک پریس کانفرنس کے دوران دوست اسلامی ملک سعودی عرب کے وزیر خارجہ شہزادہ سعود الفیصل نے بھارتی وزیر خارجہ کی موجودگی میں دہشت گردی کے معاملے پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ان کے ملک کو پاکستان کے بگڑتے حالات اور بڑھتی ہوئی انتہا پسندی پر بہت تشویش ہے۔ موصوف کے بھائی اور سعودی عرب کے سابق وزیر خارجہ ترکی الفیصل کے ماضی میں طالبان کے ساتھ انتہائی قریبی تعلقات استوار رہے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ ترکی الفیصل کا نوے کی دہائی کے دوران طالبان کے حوالے سے وہی کردار تھا جو کہ پاکستان کے سابق وزیر داخلہ نصیر اللہ بابر کا رہا ہے۔ ترکی الفیصل اس زمانے میں عملاً سعودی عرب کے کم اور افغانستان کے زیادہ وزیر خارجہ سمجھے جاتے تھے۔ ان کا ایک قدم ریاض میں، دوسرا قندھار میں اور تیسرا واشنگٹن میں رنجہ فرما ہوا کرتا تھا۔ وہ طالبان کے بہت بڑے حامی، ہمدرد اور عملی مددگار تھے اور بہت سے باخبر لوگ موصوف کے اس وقت کے فعال کردار کو انتہائی اہمیت دیتے آئے ہیں۔

پاکستانیوں کی نظر میں سعودی عرب کے احترام اور اہمیت سے قطع نظر حقیقت یہ ہے کہ اس اسلامی ریاست نے افغانستان اور پاکستان کے جہادیوں کی ہر ممکن سفارتی، مالی اور اخلاقی معاونت کی اور یہ ملک ان دونوں ممالک کے جہادیوں کی نظر میں ہر دور میں انتہائی اہم رہا ہے۔ اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ 1980ء میں جب پاکستان کی ایک آمر حکومت نے دوسرے مقاصد کے علاوہ اپنے غیر آئینی اقتدار کو طول دینے کا منصوبہ بنایا تو سعودی عرب اور امریکہ نے روس کا راستہ روکنے کی مشترکہ حکمت عملی کے نام پر اس آمر کا کھل کر ساتھ دیا۔ سعودی عرب ہی وہ پہلا ملک تھا جس نے ایک ریاست کے طور پر ساٹھ سے زائد امدادی اداروں کو پشاور اور کوئٹہ بھیج کر

افغان مزاحمتی گروہوں کی ہر ممکن امداد کی۔ سعودی عرب، امریکہ اور پاکستان پر مشتمل سہ ملکی اتحاد ہی نے دوسرے ممالک کے تعاون سے افغان مجاہدین کو افغانستان میں روس اور اس کے حامیوں کے مقابل لا کھڑا کیا اور وقت گزرنے کے ساتھ یہ سلسلہ نہ صرف یہ کہ دراز ہوتا گیا بلکہ القاعدہ کے لئے راستہ ہموار کرنے کے اقدامات بھی ان تین ممالک کے کریڈٹ پر ہیں۔ 1986ء کو جب اسامہ بن لادن نے خوست کے جہادی تربیتی مراکز کا دورہ مکمل کیا تو اس کے فوراً بعد وہ عرب ممالک سے افرادی اور مالی تعاون حاصل کرنے کی غرض سے پہلے مرحلے پر سوڈان اور اس کے بعد سعودی عرب چلے گئے۔ ان دو ممالک کے دورے کا مقصد جہاد کے حامی عربوں کو افغانستان میں ''سرمایہ کاری'' کے لئے آمادہ کرنا تھا۔ سعودی عرب کے دوسرے دورے سے چند ماہ قبل وہ پاکستان میں ''مکتبِ خدمت'' اور دوسرے مرحلے میں القاعدہ کے قیام کی بنیاد رکھ چکے تھے۔ بوجوہ اسامہ بن لادن نے سعودی عرب کے دوسرے دورے کے دوران سعودی عرب، امریکہ اور ان کے دیگر اتحادی ممالک کو تنقید کا نشانہ بنانا شروع کیا تو ان کو 1989ء میں گرفتار کر لیا گیا۔ ان کی رہائی کو متعدد تجزیہ نگار اور مصنفین اس وقت کے سعودی وزیر داخلہ اور وزیر خارجہ کے ساتھ اُن کی ایک ڈیل کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ اس معاہدے کے تحت فریقین کے درمیان طے پایا کہ اسامہ بن لادن اور ان کے ساتھی سعودی عرب میں حکومت کے خلاف کسی تحریک یا جدوجہد کا حصہ بننے سے گریز کریں گے۔ سعودی حکمران اس مرحلے پر بھی یہی خواہش رکھتے تھے کہ افغانستان میں سعودی مفادات کے حصول کا آپشن موجود رہے کیونکہ یہ حکمران کسی طور بھی اس بات کے لئے تیار نہیں تھے کہ افغانستان میں پروفیسر برہان الدین اور احمد شاہ مسعود کی زیر قیادت وہ شمالی اتحاد قوت پکڑے، جسے سعودی عرب کے مخالف ملک ایران کی حمایت حاصل تھی۔ سعودی عرب نے یہی پالیسی افغان طالبان کے ساتھ اپنے تعلقات قائم کرنے کے لیے اختیار کی کیونکہ طالبان بھی ایران کے کٹر مخالف تھے۔

1994ء میں جب امریکہ اور سعودی مخالف سرگرمیوں کی وجہ سے اسامہ بن لادن کی سعودی عرب کی شہریت ختم کر دی گئی تو وہ اس کے فوراً بعد سوڈان اور اس کے اگلے مرحلے کے دوران جنوری 1996ء کو افغانستان کے شہر جلال آباد چلے گئے۔ بعدازاں جب طالبان کے برسراقتدار آنے کا مرحلہ آیا تو سعودی عرب اور پاکستان کے حمایت یافتہ بلکہ متعارف کردہ طالبان

اور اسامہ بن لادن کو اسلام آباد اور ریاض ہی کی خواہش پر ایک دوسرے کے قریب لایا گیا۔ ہوا کچھ یوں کہ جب مئی 1996ء میں طالبان نے جلال آباد کو فتح کر لیا تو ان دو ممالک کی کوششوں سے طالبان اور القاعدہ کے درمیان موجود دوریاں ختم کی گئیں اور اتحادیوں کے درمیان نئی انڈرسٹیڈنگ قائم ہوئی۔

نائن الیون کے سانحہ تک سعودی عرب، طالبان اور القاعدہ کے اتحاد کے ساتھ اندرون خانہ اس کے باوجود تعاون کر رہا تھا کہ امریکہ اور القاعدہ کے درمیان کینیا اور تنزانیہ میں امریکی سفارتخانوں پر حملوں کے باعث پیدا ہونے والی کشیدگی اب دشمنی کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ القاعدہ کے امریکی سفارت خانوں اور مفادات پر مبینہ حملوں کے الزامات کے بعد امریکہ نے سعودی عرب اور پاکستان پر دباؤ بڑھانا شروع کر دیا کہ یہ دونوں ممالک اسامہ بن لادن کی گرفتاری کو ممکن بنانے کے لئے طالبان پر زور دیں۔ یہ اُمر قابلِ ذکر ہے کہ امریکہ کی طرف سے اس نوعیت کا مطالبہ اگست 1998ء میں سامنے آیا، جبکہ اس سے صرف ایک ماہ قبل یعنی جولائی میں شہزادہ ترکی الفیصل نے قندھار کے دورہ کے دوران نہ صرف یہ کہ اسامہ بن لادن اور ملا عمر کے ساتھ بہت خوشگوار ملاقاتیں کی تھیں بلکہ انہوں نے ریاض واپس پہنچنے پر طالبان اور اسامہ بن لادن کے لئے جذبۂ خیر سگالی کے تحت دبئی کے راستے 400 قیمتی گاڑیوں کے قافلے پر مشتمل ایک بڑا ''تحفہ'' بھی روانہ کر دیا تھا۔ امریکہ نے اسامہ بن لادن کی گرفتاری میں مدد دینے کے لئے طالبان کو آمادہ کرنے کی غرض سے اسی ترکی الفیصل کو اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنے کے لیے 25 اگست 1998ء کو قندھار بھیجا جبکہ اس کے بعد دس دسمبر 1998ء کو وزیرِاعظم پاکستان محمد نواز شریف کے دورہ واشنگٹن کے دوران ان سے بھی مطالبہ کیا گیا کہ وہ بھی اس سلسلے میں امریکہ کی ''مدد'' کریں۔ یوں امریکی دباؤ پر سابقہ اتحادیوں کے درمیان نہ صرف یہ کہ فاصلے بڑھ گئے بلکہ وہ عملاً ایک دوسرے کے خلاف بامرِ مجبوری صف آراء بھی ہو گئے۔

اس مختصر پس منظر سے یہ نتیجہ اخذ کرنا زیادہ مشکل نہیں رہتا کہ افغان مجاہدین، طالبان اور کسی حد تک القاعدہ کو ہر ممکن تعاون فراہم کرنے کے تمام عمل میں ''دوست'' اسلامی ملک سعودی عرب کا ہمیشہ بہت اہم کردار رہا ہے اور اس کا یہ کردار ہنوز قائم ہے۔

موجودہ سعودی وزیر خارجہ شہزادہ سعود الفیصل کے اس مؤقف سے بھی اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ طالبان اور القاعدہ کے ساتھ ان کی حکومت کے کوئی رابطے یا تعلقات نہیں ہیں۔ اگر حقائق کے تناظر میں سعودی عرب کے کردار کو پیشِ نظر رکھا جائے تو یہ بات مستند معلومات کی بنیاد پر ریکارڈ پر ہے کہ گزشتہ دو سال کے عرصہ کے دوران طالبان، حزب اسلامی اور کرزئی انتظامیہ کے درمیان اندرون خانہ چلنے والا مفاہمتی عمل نہ صرف یہ کہ سعودی عرب کی کوششوں کا نتیجہ ہے بلکہ سعودی عرب اس تمام عمل یا اجلاسوں کی میزبانی بھی کرتا رہا ہے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو بھارتی وزیر خارجہ کی موجودگی میں سعود الفیصل کا بیان اپنے پیچھے بہت سے سوالات چھوڑنے کا سبب بنتا دکھائی دے رہا ہے کیونکہ تاریخ سے پیچھا چھڑانا اگر ناممکن نہیں تو ایک مشکل کام ضرور ہوتا ہے۔
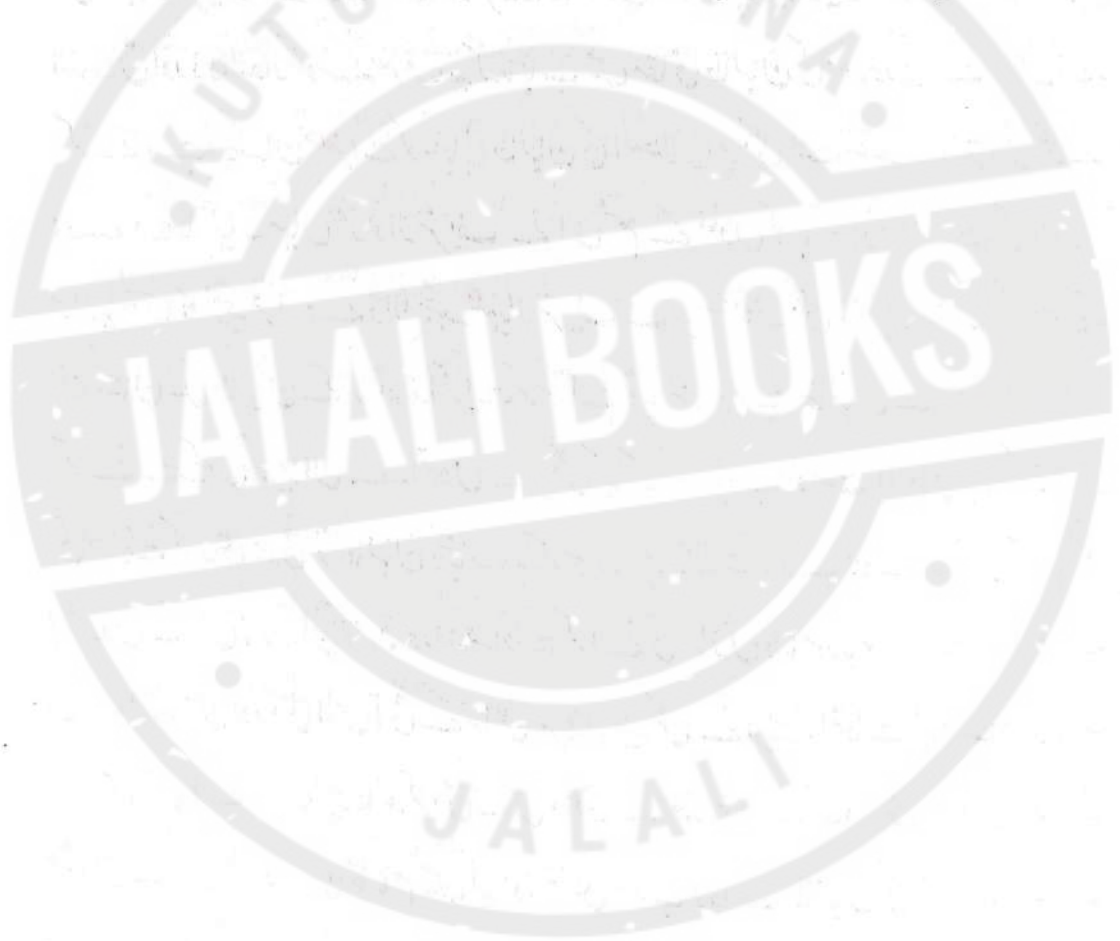
پنجابی طالبان کا پسِ منظر

یکم جولائی 2010ء کی شب پنجاب کے صوبائی دارالحکومت لاہور میں داتا دربار پر دو یا تین خودکش حملے ہوئے اور ان میں تقریباً 50 انسانی جانوں کا ضیاع ہوا تو ملک بھر کے اور خصوصاً پنجاب کے سیاسی، عوامی اور صحافتی حلقوں میں پنجابی طالبان، ان کی تعداد اور ان کے اہداف کے بارے میں ایک نئی بحث کا آغاز ہوا۔ پنجاب کی حکمران جماعت مسلم لیگ (ن) اور اس کی صوبائی حکومت کے مؤقف میں اس سانحہ کے بعد بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ یہاں تک کہ پارٹی کے وزیر اعلیٰ شہباز شریف کے علاوہ متعدد دوسرے رہنماؤں خصوصاً پرویز رشید، رانا ثناء اللہ، صدیق الفاروق اور ذوالفقار کھوسہ نہ صرف یہ کہ پنجاب میں مقامی طالبان کی موجودگی سے مسلسل انکار کرتے رہے، بلکہ ان حضرات کو پنجابی طالبان کی اصطلاح پر بھی سخت تنقید اور اعتراض کرتے ہوئے دیکھا گیا۔ میاں محمد نواز شریف نے اس قسم کے حملوں کو پاکستانی حکومت کی امریکہ نواز پالیسی کا نتیجہ قرار دے ڈالا جبکہ شہباز شریف نے یہ مؤقف بھی اختیار کیا کہ اگر امریکہ افغانستان میں طالبان کے ساتھ مذاکرات کرسکتا ہے تو پاکستان اپنے طالبان کے ساتھ مذاکرات کرنے سے کیوں گریزاں ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر پنجاب حکومت یا ان کی پارٹی طالبان کی حمایت کررہی ہوتی تو طالبان پنجاب کے شہروں پر حملے نہ کررہے ہوتے۔ بعض مسلم لیگی لیڈروں نے اس کارروائی کو فرقہ ورانہ فسادات کرانے کی سازش کا نام دیا تو جماعت اسلامی کے امیر سید منور حسن اور آئی ایس آئی کے سابق سربراہ حمید گل نے ایسے واقعات کی ذمہ داری بلیک واٹر، سی آئی اے اور 'را' پر عائد کردی۔ اس واقعہ کے بعد پنجاب کے دانشور، سیاسی اور عوامی حلقوں نے کھل کر طالبان کا نام نہیں لیا اور نہ ہی حسب روایت طالبان کی مذمت کرنے کی ضرورت محسوس کی۔

داتا دربار سانحہ کے دوسرے روز کراچی میں میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے مسلم لیگ عوامی کے لیڈر شیخ رشید احمد نے کہا کہ تمام بڑی کارروئیوں کی ذمہ داری پنجابی طالبان پر عائد ہوتی ہیں، جبکہ پشتونوں کو فضول میں بدنام کیا جارہا ہے۔ بی بی سی نے اس واقعے کے بعد اپنی ایک رپورٹ

کے دوران مرید کے اور لاہور کے علاوہ پنجاب کے چھ سے زائد ان اضلاع کا خصوصی طور پر ذکر کیا جہاں پر انٹیلی جنس اداروں کے مطابق پنجابی طالبان کے مضبوط نیٹ ورک موجود ہیں۔ اس رپورٹ میں یہ بھی دعویٰ کیا گیا کہ وفاقی حکومت اور خصوصاً پنجاب حکومت کے متعدد اعلیٰ حکام کئی ایک واقعات میں پنجابی طالبان کے ملوث ہونے کے شواہد ملنے کے باوجود ان کے وجود سے نہ صرف یہ کہ انکاری ہیں بلکہ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر تیار ہی نہیں ہیں کہ پنجاب میں مقامی طالبان موجود ہیں۔ سی این این' اے بی سی اور سی بی ایس جیسے نیوز چینلوں نے بھی پنجاب کی سیاسی قیادت اور صوبائی حکومت کی جانب سے مقامی یا پنجابی طالبان کی موجودگی سے انکار کے رویے پر حیرت اور تشویش کا اظہار کرتے ہوئے جہاں مخالفانہ تبصرے کئے، وہاں یہ سوال بھی اٹھایا کہ نواز شریف اور ان کے رفقاء لاہور سمیت پنجاب کو مسلسل نشانہ بنائے جانے کے واقعات کے باوجود یہ حقیقت ماننے سے کیوں گریزاں ہیں کہ پنجاب میں شدت پسند جہادی تنظیموں یا طالبان کے مضبوط نیٹ ورک موجود ہیں۔ دوسرے عالمی نشریاتی ادارے بھی حیرت کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان تمام مخالفانہ تبصروں' رپورٹوں اور دلائل کے باوجود صوبائی حکومت اور لیگی قیادت نہ صرف یہ کہ طالبان یا حملہ آوروں کی موجودگی سے انکار کرتی رہی بلکہ وہ بین السطور میں طالبان کی وکالت بھی کرتی رہی۔

2 جولائی کو جامعہ نعیمیہ میں بہت سے علماء نے میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے پنجاب میں فوجی آپریشن کا مطالبہ کیا، جبکہ پنجاب کے اس وقت کے گورنر سلمان تاثیر اور صوبہ خیبر پختونخوا کے وزیر اطلاعات میاں افتخار حسین نے بھی اسی نوعیت کے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے صورتحال کی سنگینی اور لیگی قیادت کے مؤقف کے حوالے سے اپنے خدشات کا کھل کر اظہار کیا۔ اس واقعہ کا عالمی سطح پر اس قدر سخت نوٹس لیا گیا کہ اقوامِ متحدہ' دولت مشترکہ اور بعض دوسرے اہم ترین عالمی اداروں نے بھی اس کی کھل کر مذمت کی۔ متعدد سابق جرنیلوں اور تجزیہ نگاروں کا محض اس نکتے پر زور رہا کہ پاکستان کو امریکہ کے ساتھ اپنے تعلقات پر نظر ثانی کرنی چاہئے اور یہ بھی کہا گیا کہ پاکستانی طالبان کے ساتھ مذاکرات پاکستان کے لئے سودمند ثابت ہو سکتے ہیں۔ تاہم ان میں سے کسی کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا کہ پاکستانی طالبان کے مطالبات کیا ہیں اور یہ کہ

کیا وہ بھی حکومت کے ساتھ مذاکرات یا مفاہمت کے لئے تیار ہیں کہ نہیں؟ چار جولائی کے روز پنجاب کے وزیر اعلیٰ، گورنر اور ان کے ترجمان اس معاملے پر پوائنٹ سکورنگ کرنے کے لیے میدان میں نکل آئے، جبکہ مفتی منیب الرحمٰن اور دیگر علماء نے وفاقی اور صوبائی حکومت پر بعض کالعدم تنظیموں کی درپردہ حمایت کے الزامات عائد کیے۔ پیپلز پارٹی کے ایک رہنما اور مفتی منیب الرحمٰن نے الزام لگایا کہ صوبائی وزیر قانون رانا ثناءاللہ ضمنی انتخابات کے دوران کالعدم تنظیموں کے رہنماؤں کو سرکاری گاڑیوں میں اپنے ہمراہ گھماتے رہے جبکہ مفتی منیب الرحمٰن نے یہ انکشاف بھی کیا کہ ایسی ہی ایک کالعدم تنظیم کے سربراہ کو اس وقت کے گورنر پنجاب سلمان تاثیر اپنے ساتھ ہیلی کاپٹر میں لے کر گھومتے رہے ہیں۔ اس الزام کا گورنر ہاؤس کے ترجمان نے انتہائی برا منایا اور اس کی پرزور تردید کی۔ اس تمام صورتحال کا جو سب سے افسوس ناک اور تشویش ناک نتیجہ سامنے آیا، وہ یہ تھا کہ پنجاب کی اعلیٰ قیادت کے علاوہ ملک گیر سطح کی پارٹیوں اور تنظیموں کے درمیان بھی دہشت گردی اور پاکستان کی خارجہ پالیسی جیسے انتہائی حساس اور بنیادی ایشوز پر اتفاق رائے ہوتا ہوا نظر نہیں آیا، بلکہ فریقین کوئی مشترکہ لائحہ عمل اختیار کرنے کی بجائے ایک دوسرے پر مسلسل الزام تراشیاں کرتے رہے۔

دوسری طرف پولیس نے داتا دربار حملے میں مبینہ طور پر ملوث جس ایک ملزم کو گرفتار کیا تھا، وہ پنجاب سے ہی تعلق رکھتا تھا، جبکہ اس کے دو روز بعد یعنی چار جولائی کی شام کو قانون نافذ کرنے والے اداروں نے لاہور ہی سے چند مبینہ دہشت گرد گرفتار کیے جو پنجاب ہی کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھتے تھے اور شہر کے بعض حساس مقامات پر حملوں کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ ان کے قبضے سے جدید ترین ہتھیاروں کے علاوہ راکٹ لانچر، مارٹر گولے اور بعض وہ ہتھیار بھی برآمد کیے گئے جن کے استعمال سے پورے علاقے کو مٹی کے ڈھیر میں تبدیل کرنا ممکن تھا۔ حساس اداروں کے مطابق؛ وہ شہر کے بعض اہم مقامات کو نشانہ بنانے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ اس صورتحال سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پنجابی سیاستدان اور ان کی حامی اسٹیبلشمنٹ نہ صرف یہ کہ پاکستان کی موجودہ وفاقی حکومت کی خارجہ پالیسی سے متفق نہیں ہے بلکہ وہ پشتونوں ہی کو طالبان اور پشتون علاقوں کو ہی ان کے ٹھکانے ثابت کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ کسی نے بھی حقائق کا اعتراف

کرتے ہوئے یہ جرأت نہیں کی کہ پنجاب کے عسکریت پسند ہی پشتون طالبان کے فکری سرپرست رہے ہیں۔ کسی نے یہ سوال بھی نہیں اٹھایا کہ پنجاب سے تعلق رکھنے والی جہادی اور فرقہ پرست تنظیموں کی تعداد کتنی ہے اور یہ سب تنظیمیں کتنے عرصے سے جہاد کی ترغیب' جہادیوں کی تربیت اور ان کی فنڈنگ میں بنیادی کردار ادا کرتی آئی ہیں۔ یہاں ہم اپنے قارئین کی معلومات کے لئے اس پس منظر کو سامنے رکھ کر چند حقائق کو اعداد و شمار کی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ صورتحال ممکنہ حد تک واضح ہو سکے۔ ممتاز تجزیہ کار اور محقق محمد عامر رانا کی ایک مستند کتاب ''اے ٹو زی آف جہادی آرگنائزیشنز آف پاکستان'' کے مطالعہ سے منکشف ہوتا ہے کہ پنجاب ہی وہ فکری مرکز تھا، جہاں اسّی کی دہائی کے دوران پاکستان کی مقتدر قوتوں کی آشیر باد سے بے شمار جہادی اور فرقہ وارانہ تنظیموں نے جنم لیا اور کچھ ہی عرصہ میں فعال نیٹ ورک قائم کئے۔ مذکورہ تحقیق کے مطابق ابتداء میں قائم ہونے والی ایسی تنظیموں کی تعداد 55 سے زائد تھی، تاہم بعد میں ان تنظیموں سے دوسرے گروہ بھی جنم لینے لگے اور یہ تعداد بڑھتی گئی۔ ان تنظیموں کی ریاستی سرپرستی اس پالیسی کے تحت کی گئی کہ ان قوتوں کو بھارت اور افغانستان میں پاکستانی مفادات کے تحفظ کے لئے استعمال کیا جائے، تاہم یہ تنظیمیں مسلکی اختلافات کی بنیاد پر وقتاً فوقتاً ایک دوسرے پر بھی حملہ آور ہوتی رہیں اور یوں سینکڑوں کی تعداد میں لوگ لقمۂ اجل بن گئے۔ ایک اور نامور صحافی اور تبصرہ نگار عامر میر نے اپنی کتاب ''طالبانائزیشن ان پاکستان'' میں بھی اعداد و شمار اور واقعات کو بنیاد بنا کر ثابت کیا ہے کہ جس دور میں فاٹا اور خیبر پختونخوا حتیٰ کہ افغانستان میں بھی جہادی تنظیمیں ابھی طاقت ور نہیں ہوئی تھیں، اس وقت بھی پنجاب ایسی قوتوں کا مرکز تھا اور یہ لوگ مسلکی اور فرقہ ورانہ بنیاد پر شدت پسند کارروائیاں کر رہے تھے۔ پنجاب ہی سے تعلق رکھنے والے ایک اور تجزیہ نگار مجاہد حسین نے اپنی کتاب ''پنجابی طالبان'' میں ثابت کیا ہے کہ پنجاب میں دو لاکھ سے زائد ایسے افراد موجود ہیں جو کہ ریاست مخالف فلسفے پر عمل پیرا ہو کر مختلف تنظیموں کا باقاعدہ حصہ بنے ہیں۔ انہوں نے تحقیق اور واقعات سے ثابت کیا ہے کہ پنجاب کے سولہ اضلاع میں کالعدم تنظیموں کے نہ صرف یہ کہ فعال نیٹ ورک موجود ہیں بلکہ یہ لوگ دفاتر بھی چلاتے ہیں' چندہ بھی اکٹھا کرتے ہیں اور ایک مربوط نظام کے تحت مدارس اور معاشرے سے نوجوانوں کی بھرتی

بھی کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ پشتون طالبان کے مقابلے میں پنجابی طالبان کی نظریاتی پختگی اور تنظیمی صلاحیتیں بہت بہتر ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ مجاہد حسین کا کہنا ہے کہ کمزور سیاسی و جاگیردارانہ نظام اور خفیہ اداروں کی آشیر باد جیسے بنیادی عوامل نے پنجابی طالبان کو اس قدر طاقتور بنا دیا ہے کہ وہ کسی بھی وقت ریاست کو چیلنج کر کے اس کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ پنجاب کی نمائندہ سیاسی قوت یعنی مسلم لیگ (ن) نہ صرف یہ کہ ان کالعدم تنظیموں کے سامنے بے بس ہے، بلکہ اس کے رہنما اور قومی و صوبائی اسمبلیوں کے اراکین قدم قدم پر ان تنظیموں کی حمایت کے محتاج بھی رہتے ہیں۔ اس ضمن میں فاضل مصنف نے بے شمار واقعات بھی قلم بند کئے ہیں۔

ایک ممتاز مغربی ماہر اور تجزیہ نگار نے اپنی ایک مستند تحقیقی کتاب ''In The Search of Al Qaeda' میں ایسے ہی ٹھوس شواہد' واقعات اور اعداد و شمار کے ذریعے پنجاب کو فاٹا کی طرح انتہا پسندوں کا سب سے بڑا مگر محفوظ ترین مرکز قرار دیا ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں ان القاعدہ لیڈروں اور کمانڈروں کے نام اور تفصیلات بھی قلم بند کی ہیں، جنہیں 2001ء کے بعد پنجاب کے مختلف شہروں سے گرفتار کیا گیا ہے۔ ان دہشت گردوں کی پنجاب کے جن شہروں سے گرفتاریاں عمل میں آئیں، ان میں ملتان' جھنگ' فیصل آباد' ڈی جی خان' میانوالی' بہاولپور' چکوال' بھکر' ٹوبہ ٹیک سنگھ اور گجرات شامل ہیں۔ ایک اور تحقیقی رپورٹ کے مطابق صرف لاہور میں رجسٹرڈ مدارس کی تعداد 1100 ہے، ان میں سے نصف وہ ہیں جن کے بارے میں شواہد کی روشنی میں یہ کہا گیا ہے کہ ان کے نصاب میں جہاد کی عملی تربیت کو بھی شامل رکھا گیا ہے۔ اسی رپورٹ کے مطابق؛ ایک محتاط اندازے کے مطابق پاکستان میں رجسٹرڈ مدارس کی تعداد 23 سے 25 ہزار تک ہے، جن میں سے 13 ہزار صرف پنجاب میں ہیں۔ ایک اور رپورٹ کے مطابق؛ تیرہ مذہبی تنظیمیں ایسی ہیں جن کے ساتھ نظریاتی وابستگی رکھنے والے 42 مدارس میں جہاد کی باقاعدہ تربیت بھی دی جاتی ہے، جبکہ مختلف بینکوں اور دوسرے متعلقہ مالیاتی اداروں میں ان تنظیموں کے 50 ارب روپے کے فنڈز زیرِ گردش ہیں۔ پاکستانی صحافی اور تجزیہ نگار امتیاز گل کے مطابق؛ افغانستان کے جہادیوں اور ان کے بعد طالبان کے لیے عرب ممالک کے بعد سب سے

زیادہ فنڈنگ پنجاب ہی سے ہوا کرتی تھی، جبکہ فاٹا کے طالبان کا زیادہ انحصار بھی پنجاب پر ہی تھا۔ ان کی ایک کتاب میں یہ دعویٰ بھی کیا گیا ہے کہ افغانستان اور فاٹا کے طالبان کو مالی وسائل کے علاوہ سب سے زیادہ افرادی قوت بھی پنجاب ہی سے مہیا کی جاتی تھی اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ان تمام معتبر ذرائع اور دعوؤں کے علاوہ اگر ہم پاکستان کے اندر 2004ء کے بعد کئے جانے والے حملوں کی تفصیلات کا بغور جائزہ لیں تو ثابت ہوتا ہے کہ جب فاٹا اور خیبر پختونخوا میں ریاست کے خلاف کارروائیوں کی باقاعدہ ابتداء نہیں ہوئی تھی، تب بھی پنجاب کے شہروں راولپنڈی، چکوال اور مری میں پنجابی عسکریت پسند تنظیمیں متعدد کارروائیاں کر چکی تھیں۔ یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ ان عسکریت پسند گروہوں نے 2002ء کے دوران مذکورہ بالا شہروں میں نہ صرف یہ کہ اقلیتوں کی عبادت گاہوں کو منظم حملوں کا نشانہ بنایا بلکہ انہوں نے اعلیٰ حکومتی شخصیات، فوجی حکام، خفیہ اداروں کے افسروں اور ایف سی و پولیس کے اہلکاروں کو انتہائی منظم دہشت گرد کارروائیوں کا نشانہ بنایا۔

یہ حقیقت بھی بیان کرنے کی ضرورت ہے کہ پاکستان میں سب سے پہلے جس شخصیت نے ایک منظم تحریک اور نیٹ ورک کے ذریعے جہادی تعلیم اور جہاد کی باقاعدہ تربیت کا آغاز کیا، وہ مولانا مسعود علوی تھے۔ وہ ملتان میں موجود اپنے ایک مدرسے میں طلباء کو جنگ کی باقاعدہ تربیت دیا کرتے تھے اور جب روس افغانستان میں داخل ہو گیا تو انہوں نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے اپنے بے شمار شاگردوں کو میدان جنگ میں بھیج دیا۔ اسی گروپ نے بعد میں خوست میں حرکت الجہاد اسلامی کے نام سے تنظیم قائم کی اور مولانا مسعود علوی اس کے سربراہ بن گئے، اسی تنظیم نے بعد میں حرکت المجاہدین اور جمعیت المجاہدین العالمی کو جنم دیا۔ ان لوگوں نے صوبہ خوست کے ایک مقام رشخور میں مجاہدین کی تربیت کے لئے دو کیمپ قائم کیے، ان کیمپوں کو بعد ازاں القاعدہ نے اپنی تحویل میں لے لیا۔

القاعدہ اور طالبان کو الگ کرنے کی کوششیں

پاکستان، افغانستان اور ایران کے علاوہ دنیا کے پچاس سے زائد ممالک میں القاعدہ اور طالبان کے روابط کے حوالے سے ایک نئی بحث چھڑ گئی ہے۔ ان ممالک نے نائن الیون کے بعد اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم سے القاعدہ اور طالبان کے تدارک کیلئے اتفاق رائے کا اظہار کرتے ہوئے اس تنظیم کو عالمی امن کیلئے خطرہ قرار دیا تھا۔ ان ممالک میں امریکہ کے دو بڑے مخالفین یعنی روس اور چین بھی شامل ہیں، کیونکہ ان ممالک کو بھی القاعدہ کے نظریات اور مقاصد کے حوالے سے نہ صرف یہ کہ شدید تحفظات لاحق ہیں بلکہ یہ ممالک القاعدہ کو اپنے لئے بھی خطرہ تصور کرتے ہیں۔ پاکستان طویل عرصے تک القاعدہ کے لئے نرم گوشہ رکھنے والا ملک سمجھا جاتا رہا ہے، تاہم اب پاکستان بھی القاعدہ کے بارے میں اپنی پالیسی پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہو گیا ہے اور اس کی ایک بڑی وجہ شاید یہ ہے کہ حال ہی میں ایمن الظواہری نے کتاب ''سپیدہ سحر اور ٹمٹماتا چراغ'' لکھ کر نہ صرف یہ کہ پاکستان کو غیر اسلامی ریاست قرار دے دیا ہے، بلکہ اس کے خلاف جہاد اور خروج کا جواز بھی پیش کر دیا ہے۔ اس نقطۂ نظر یا فلسفے کے مطابق جو بھی ریاست امریکہ کی اتحادی ہو گی اور القاعدہ کے تصورِ جہاد کی مخالفت کرے گی، اس کے خلاف جنگ لڑنا ناگزیر ہے۔

اسی کی دہائی میں پشاور میں قائم ہونے والی القاعدہ کی پاکستان میں موجودگی اور سرگرمیوں سے اگر اس وقت دنیا کے چند ممالک کو شدید خطرات لاحق ہیں تو ان میں پاکستان سرفہرست ہے، کیونکہ اس ملک میں اس خطرناک مگر منظّم عسکریت پسند تنظیم کی جڑیں بہت مضبوط ہیں۔ نائن الیون سے قبل القاعدہ کی مرکزی قیادت افغانستان میں موجود تھی۔ ان عسکریت پسندوں نے خوست، قندھار، ننگرہار، پکتیا اور بعض دوسرے افغان صوبوں میں اپنے الگ تربیتی کیمپ بھی قائم کر رکھے تھے۔ ان کیمپوں میں عربوں کو تربیت دی جاتی تھی اور ان کیمپوں کے تمام انتظامات اور اختیارات القاعدہ کے کمانڈروں کے ہاتھ میں تھے۔ ایک رپورٹ کے مطابق القاعدہ نے مجاہدین کے دور میں ہی خوست اور پکتیا میں متعدد تربیتی کیمپ قائم کر لیے تھے۔ القاعدہ کے کنٹرول سے قبل یہ کیمپ عبدالرب سیاف اور مولوی یونس خالص کے علاوہ پاکستانی پنجاب سے تعلق رکھنے والی بعض جہادی

تنظیموں کے زیر استعمال تھے۔ القاعدہ نے ان کیمپوں کو نہ صرف یہ کہ جدید خطوط پر استوار کیا بلکہ اتنی قوت حاصل کر لی کہ افغان مجاہدین عملاً اس تنظیم کے زیر اثر آ گئے۔ یہ بات بھی ریکارڈ کا حصہ ہے کہ ملا عمر سمیت افغان طالبان کے بعض اہم رہنماؤں کو متعدد بار القاعدہ کے کردار اور قوت کے بارے میں خدشات کا اظہار کرتے ہوئے دیکھا گیا، تاہم دونوں فریقین کے درمیان مشترکہ مقاصد کی موجودگی نے انہیں ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہونے نہیں دیا، بعد ازاں نائن الیون کا واقعہ رونما ہو گیا تو افغان طالبان نے القاعدہ کی جانب سے حملوں کی حمایت یا ذمہ داری قبول کرنے کی پالیسی کو ناپسندیدہ عمل قرار دیکر اس پر اعلانیہ تشویش کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ یہ بات بھی ریکارڈ پر موجود ہے کہ ملا محمد عمر نے نہ صرف یہ کہ امریکہ پر ہونے والے حملوں کی مذمت کی بلکہ انہوں نے ایک سعودی شہزادے (جو کہ وزیر بھی تھا) کے ذریعے کئے گئے رابطوں میں اسامہ بن لادن کے خلاف عدالتی کارروائی کرنے کے امریکی مطالبے پر بھی رضامندی کا اظہار کیا تھا، تاہم یہ رضامندی مشروط تھی اور یہی وجہ تھی کہ فریقین کے درمیان کوئی معاہدہ نہیں ہو سکا۔

نومبر 2001ء کے بعد جب امریکہ اور اس کے 44 اتحادی ممالک کی فوجیں القاعدہ کے تدارک کے لیے افغانستان پر حملہ آور ہوئیں تو القاعدہ، افغان طالبان اور پاکستانی عسکریت پسند تنظیمیں ایک بار پھر ایک مشترکہ دشمن سے نمٹنے کے یک نکاتی ایجنڈے پر متحد ہو گئیں اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی قوت اور تعداد کم ہونے کی بجائے امریکی حملے کے باعث بڑھنا شروع ہو گئی۔ القاعدہ نے تورا بورا پر کی گئی بدترین بمباری کے بعد پاکستان اور افغانستان کے درمیان موجود سرحدی علاقوں کو اپنا مسکن بنا لیا، اور اس کے لیے القاعدہ کو زیادہ مشکل کا سامنا اس لیے نہیں کرنا پڑا کہ ان علاقوں میں پاکستانی فورسز موجود نہیں تھیں جبکہ عام لوگ امریکی مداخلت کے باعث القاعدہ اور ان کے دوسرے اتحادیوں کو پناہ دینے پر تیار تھے۔ القاعدہ کے سابق سربراہ اسامہ بن لادن سمیت متعدد دوسرے اہم رہنما مختلف مواقع پر نائن الیون کے واقعے میں القاعدہ کے ملوث ہونے کا اعتراف کر چکے ہیں اور بے شمار لوگ اس نظریئے کے قائل ہیں کہ اگر القاعدہ ان واقعات کی ذمہ دار نہیں تھی تو اس صورت میں بھی اس کی جانب سے ذمہ داری قبول کرنے کو القاعدہ کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے ایک بڑا جواز تصور کیا جانا چاہیے۔ القاعدہ اور افغان طالبان کو

پاکستان کے مذہبی حلقوں کے علاوہ بعض سابق فوجی جرنیلوں اور عوام کے ایک مخصوص طبقے کے علاوہ پاکستانی میڈیا اور متعدد حاضر سروس فوجی حکام کی ہمدردیاں بھی حاصل تھیں۔ یہ وہ لوگ تھے جن کا مؤقف تھا کہ امریکہ کے مقابلے میں القاعدہ اور ایسی دوسری تنظیموں کی حمایت کرنا مسلمانوں کیلئے اسلامی نقطہ نظر سے نہ صرف یہ کہ لازمی ہے بلکہ ایسا کرنا ہر مسلمان پر فرض بھی ہے۔ اس بنیادی دلیل نے القاعدہ اور اس کے اتحادیوں کیلئے خطے میں محفوظ ٹھکانے فراہم کرنے اور محدود عوامی حمایت کے حصول کے امکانات بڑھا دیئے اور یہی وجہ تھی کہ اس کے نتیجے میں جہاں تحریک طالبان پاکستان جیسی پرتشدد اور منظم تنظیم قائم ہوئی، وہاں پاکستان میں موجود 50 سے زائد فرقہ پرست اور عسکریت پسند تنظیمیں بھی امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی مخالفت میں القاعدہ کی اتحادی بن گئیں۔ ممتاز محقق محمد عامر رانا نے القاعدہ کے نظریات سے متاثر پاکستانی تنظیموں کی تعداد 50 سے بھی زیادہ بتائی۔ ان تنظیموں میں انہوں نے فرقہ پرست، کشمیری، پنجابی اور پشتون عسکریت پسند گروہ شامل کیے ہیں۔

پاکستان چونکہ ابتداء ہی سے جہادی تنظیموں کے مضبوط گڑھ کی شہرت پا چکا تھا اور ریاست کی مجموعی پالیسی جہاد کے حق میں تھی، اس لئے پاکستان کے قبائلی علاقے خصوصاً وزیرستان کی دونوں ایجنسیاں ابتداء میں ہی ان عسکریت پسندوں کے لئے محفوظ ٹھکانوں کی صورت اختیار کر گئیں۔ اس دوران پاکستان کے مختلف شہروں سے تقریباً 12 القاعدہ کمانڈروں کی گرفتاریاں عمل میں لائی گئیں تو دوسری طرف ڈرون حملوں کے دوران بے شمار اہم رہنما بھی مارے گئے۔ اسی عرصہ کے دوران جب تحریکِ طالبان پاکستان نے القاعدہ کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے قبائلی علاقوں کے بعد خیبر پختونخوا اور اس کے بعد پنجاب کو نشانہ بنانے کی پالیسی کے تحت بدترین حملوں کا سلسلہ شروع کیا تو پاکستان کی سیاسی اور عسکری قیادت کو حالات کی سنگینی کا پہلی بار شدت کے ساتھ احساس ہوا۔ مختلف محققین کے مطابق پاکستان اور افغانستان کی سرحدی پٹی پر ایک وقت میں تقریباً 40 ہزار جنگجو جمع ہو گئے تھے۔ خیبر پختونخوا کے اس وقت کے گورنر اویس غنی نے ان جنگجوؤں کی تعداد 15 ہزار بتائی جبکہ اے این پی کے رہنما افراسیاب خٹک نے دعویٰ کیا کہ القاعدہ جنگجوؤں کی تعداد پانچ سے آٹھ ہزار تک ہو سکتی ہے۔ ایک اور معتبر ادارے نے اپنے ایک سروے میں

عرب جنگجوؤں کی تعداد 9 ہزار بتائی۔ القاعدہ نے پاکستان کو محض محفوظ ٹھکانوں کے طور پر استعمال کرنے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس کے جنگجو تحریکِ طالبان پاکستان کے ساتھ حملوں میں بھی شامل ہونے لگے۔

دوسری طرف القاعدہ نے اپنے تنظیمی ڈھانچے میں پاکستان کی مختلف جہادی تنظیموں کے کمانڈروں کو بھی شامل کرنا شروع کر دیا، اس ضمن میں الیاس کشمیری، قاری سیف اللہ اختر، بیت اللہ محسود اور متعدد دوسرے پاکستانی کمانڈروں کی مثال دی جاسکتی ہے۔ یہ صورتحال پاکستان کی عسکری قیادت اور پرو جہاد قوتوں کے لئے اس لئے ناقابل برداشت بن گئی کہ اب القاعدہ اور اس کے اتحادیوں کی سرگرمیاں اور کارروائیاں امریکہ اور اس کے اتحادیوں تک محدود نہیں رہی تھیں بلکہ وہ پاکستان کے عام شہریوں اور فورسز کے علاوہ عسکری تنصیبات کو بھی ہدف بنانے لگے تھے۔ کشمیر اور افغانستان کیلئے تیار کئے گئے جہادی ان دو مراکز کو چھوڑ کر پاکستان پر حملہ آور ہونے لگے تو پاکستان کی مقتدر قوتوں کیلئے القاعدہ اور اس کے دوسرے اتحادیوں کے ساتھ تعاون کی اپنی پالیسی کو جاری رکھنا مشکل ہو گیا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ پاکستانی ریاست نے ان کے خلاف بعض سخت کارروائیاں شروع کرنے کی پالیسی ترتیب دی۔

2010ء کے دوران القاعدہ کی جانب سے بعض حملوں میں براہ راست ملوث ہونے کے واقعات اور ثبوتوں نے یہ بات بڑی حد تک واضح کر دی کہ یہ منظّم اور خطرناک تنظیم پاکستان کو کسی قسم کی رعایت دینے پر تیار نہیں ہے جبکہ دوسری طرف امریکہ اور اس کے اتحادیوں کا دباؤ بھی پاکستان کیلئے اس کی اقتصادی مشکلات کے باعث ناقابل برداشت صورت اختیار کرتا گیا۔ پاکستان کیلئے اس حقیقت کو بھی نظر انداز کرنا ممکن نہ رہا کہ القاعدہ اور تحریکِ طالبان پاکستان کی سرگرمیاں اور کارروائیاں محض فاٹا تک محدود نہیں رہیں، بلکہ یہ سلسلہ پورے ملک تک پھیل گیا اور مزید پھیلتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ اس صورتحال کے باعث یہ سوال پھر سے اٹھایا جانے لگا ہے کہ پاکستانی ریاست کو القاعدہ سے نمٹنے کیلئے کیا طریقۂ کار اپنانا چاہئے کیونکہ اس تنظیم کی سرگرمیاں نہ صرف عالمی برادری کے لئے بلکہ خود پاکستان کیلئے بھی خطرناک شکل اختیار کر گئی ہے اور ایمن الظواہری کی جانب سے جاری بیان کو فتوے کی حیثیت دی جا رہی ہے۔ باخبر حلقوں کے مطابق

پاکستان اپنے مفادات کے تناظر میں افغان طالبان (گڈ طالبان) کے ساتھ رعایت کرنے پر تو تیار ہے تاہم اس کے لئے اب القاعدہ جیسی خطرناک اور عالمی برادری کو مطلوب تنظیم کے ساتھ یکطرفہ مبینہ 'رومانس' کو آگے بڑھانا ممکن نہیں رہا۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ پاکستان اسی پالیسی کو جاری رکھے گا جس پر افغانستان اور کسی حد تک امریکہ عمل کر رہا ہے اور وہ حکمتِ عملی یہ ہے کہ طالبان اور القاعدہ کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا جائے، اب سوال یہ ہے کہ کیا ایسا کرنا ممکن ہے یا نہیں، فی الحال اس کا جواب کسی کے پاس نہیں۔

کیا پاکستانی طالبان سے مفاہمت ممکن ہے؟

پاکستان میں یہ بحث ایک بار پھر چل نکلی ہے کہ آیا افغانستان کی طرح پاکستان میں بھی طالبان اور حکومت کے درمیان مذاکرات یا مصالحت کا کوئی امکان موجود ہے یا نہیں۔ اس ضمن میں یہ دلیل دی جارہی ہے کہ دونوں اطراف کے طالبان کے بنیادی نظریات اور اہداف میں کوئی فرق نہیں ہے اور یہ کہ وہ ایک دوسرے کا ساتھ بھی دیتے آئے ہیں۔ پاکستانی عسکریت پسند ملا عمر اور القاعدہ کی قیادت کو نہ صرف یہ کہ بہت احترام کی نظر سے دیکھ رہے ہیں، بلکہ فریقین کے درمیان قریبی مراسم اور رابطے بھی ہیں اور وہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی کھلی مخالفت کے علاوہ خطے میں ایک مکمل اسلامی نظام کے نفاذ جیسے بنیادی نکات پر بھی متفق ہیں۔ دونوں میں فرق صرف اتنا سا ہے کہ افغان طالبان ماضی میں کئی برسوں تک اپنے ملک میں برسراقتدار رہے ہیں اور ان کو عوام کی خاصی حمایت بھی حاصل رہی ہے۔ ان کی اس کامیابی کے باعث ہی پاکستانی طالبان کا ظہور ہوا اور جب نائن الیون کے بعد امریکہ اور اس کے اتحادی افغانستان پر اور ہماری فورسز پاکستان کے طالبان پر حملہ آور ہوئیں تو خطے میں نہ ختم ہونے والی ایسی جنگ کا آغاز ہوا جس نے انسانی زندگی کے تحفظ، اہمیت اور بقاء کو خطرات سے دوچار کر دیا۔ دونوں اطراف کے طالبان کو القاعدہ اور اس طرح کی دوسری عالمی تنظیموں کی مکمل حمایت بھی حاصل رہی اور اسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس جنگ کا دائرۂ کار وسیع ہو گیا۔ اب یہ جنگ ایک عالمی مسئلہ بن چکی ہے اور پوری دنیا اس کی لپیٹ میں ہے۔ پاکستانی اور افغان طالبان میں گو کہ نظریاتی طور پر کوئی فرق نہیں تاہم ان کے طریقۂ کار اور حکمتِ عملی میں خاصا فرق پایا جاتا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ افغان طالبان ایک بحرانی دور یا کیفیت کی پیداوار ہیں۔ ڈاکٹر نجیب اللہ کی حکومت کے خاتمے کے بعد جب افغان جہادی تنظیمیں آپس کے اختلافات کے باعث ایک مؤثر اور نمائندہ حکومت کے قیام میں ناکام ہو گئیں اور امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے نئے نظام کے قیام میں کوئی دلچسپی نہیں لی تو ملک بدترین خانہ جنگی کا شکار ہو گیا اور جنگ سے تنگ آئے ہوئے لوگوں کے لئے امن محض ایک خواب بن کر رہ گیا۔ اس بحرانی کیفیت میں طالبان کو اپنے قدم جمانے کا موقع مل گیا اور پشتون آبادی

نے متعدد خدشات کے باوجود ان کا خیر مقدم اس لئے بھی کیا کہ ان کے سامنے کوئی دوسرا انتخاب نہیں تھا اور یہ کہ وہ امن کے قیام کے لئے کسی کے ساتھ بھی تعاون کرنے کو تیار تھے۔

افغان طالبان نے تمام تر پرتشدد رویوں کے باوجود سیاسی عمل میں حصہ لینے کی راہ بھی اختیار کی، جبکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کا پرتشدد رویہ بھی نرم ہوتا گیا۔ انہوں نے جب اقتدار سنبھالا تو ممکنہ طور پر دوسروں کو برداشت کرنے کا راستہ بھی اختیار کر لیا۔ انہوں نے اصلاحات بھی کیں اور خود احتسابی پر بھی توجہ دی۔ نائن الیون کے بعد بھی ان کی کوشش رہی کہ خود کو ممکنہ حد تک القاعدہ اور امریکہ دونوں سے فاصلے پر رکھیں۔ وہ نائن الیون سے قبل خود کو دنیا کے لئے قابل قبول بنانے کے لیے مختلف امکانات پر بھی غور کرتے رہے، کیونکہ انہیں احساس ہو گیا تھا کہ دنیا سے الگ رہ کر ریاستی معاملات کو چلانا ممکن نہیں ہے۔ طالبان کی تحریک میں پشتون آبادی کے بعض وہ سیاسی حلقے بھی شامل ہو گئے تھے جو کہ افغان جنگ اور خانہ جنگی کے اثرات کے باعث سیاسی عمل سے الگ کر دیئے گئے تھے اور ان کو اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا تھا، اس ضمن میں ہم خلق پارٹی، پرچم پارٹی اور متعدد دوسری تنظیموں کی مثال دے سکتے ہیں۔ یوں یہ تحریک بوجوہ پشتونوں کی محدود اور غیر اعلانیہ قوم پرستی کی شکل میں بھی سامنے آنے لگی، کیونکہ پشتون آبادی کو شمالی اتحاد اور ایران کے حوالے سے متعدد تاریخی خدشات کا سامنا تھا اور وہ شمالی اتحاد کے اثر و رسوخ کا راستہ بھی روکنا چاہتی تھی۔ افغان طالبان نے پاکستانی طالبان کی طرح مخالفین کو بے دردی سے راستے سے ہٹانے سے بھی ممکنہ حد تک گریز کئے رکھا اور وہ اب بھی افغان فورسز یا پولیس کے مقابلے میں اتحادی فورسز کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ بعض اطلاعات کے مطابق افغان طالبان خود کو القاعدہ سے دور کرنے کے فارمولے پر بھی عمل پیرا ہے، تاکہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو یہ باور کرایا جائے کہ افغان طالبان صرف اپنی آزادی اور وطن کے تحفظ کی جنگ لڑ رہے ہیں اور وہ کسی اور کو افغانستان کی سرزمین استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ اس کے برعکس پاکستانی طالبان کا پس منظر خاصا مختلف ہے۔ پاکستانی طالبان سیاسی اور جمہوری نظام کے سخت مخالف ہیں۔ پاکستان، افغانستان کی طرح بڑی جنگ یا غیر ملکی مداخلت سے بھی نہیں گزرا ہے جبکہ یہاں کا سیاسی اور ریاستی ڈھانچہ بھی افغانستان کے مقابلے میں خاصا فعال

اور متحرک رہا ہے۔ پاکستان کی فوج ماضی میں عسکریت پسند تنظیموں کی حامی رہی ہے جبکہ دینی جماعتیں بھی ان کی حمایت کرتی آئی ہیں۔ پاکستان کے طالبان افغان طالبان کے مقابلے میں زیادہ پرتشدد واقع ہوئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ افغان طالبان کے مقابلے میں پاکستانی طالبان کے انفرادی اور اجتماعی حملوں کی تعداد بہت زیادہ رہی ہے، اس تناسب سے جانی اور مالی نقصانات کی شرح بھی زیادہ رہی ہے۔ افغانستان کے طالبان 8-2007ء سے امریکی اور افغان حکومت کے ساتھ غیر اعلانیہ مذاکراتی عمل کا حصہ بنے ہوئے ہیں جبکہ متعدد سابق طالبان وزراء، کمانڈر اور سفیر اس تمام مذاکراتی عمل میں مرکزی کردار بھی ادا کرتے آئے ہیں۔ افغان طالبان کے بے شمار حامی اور رہنما اب بھی افغان پارلیمان کا حصہ ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ پاکستانی طالبان کی طرح جمہوری اور سیاسی عمل کی مخالفت نہیں کر رہے۔ افغان طالبان صدر حامد کرزئی کے ساتھ بھی خاصی رعایت برت رہے ہیں جبکہ کرزئی کا کردار بھی طالبان کے تناظر میں اسفندیار ولی اور صدر زرداری یا جنرل کیانی سے بالکل مختلف ہے۔ افغانستان میں چونکہ وطن پرستی کا جذبہ بہت زیادہ ہے، اس لئے افغانستان کو پاکستان کی طرح کے قومی مسائل کا سامنا نہیں ہے۔ افغان طالبان کے اس لچکدار رویے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی بتائی جا رہی ہے کہ وہ ماضی کے تجربات کے باعث عالمی تعلقات کے بہت سے نکات اور ضروریات کو سمجھتے بھی ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اگر امریکہ جنگ نہیں جیت رہا تو امریکہ کی افغانستان میں موجودگی اور اس کے عزائم کے باعث سیاسی عمل کا حصہ بنے بغیر ان کا بھی کوئی واضح یا شاندار مستقبل نہیں ہے اور ان وجوہات کے باعث افغان طالبان نے حقیقت پسندی کی راہ اپنائی ہے۔ ان کے برعکس پاکستانی طالبان کا رویہ بہت غیر لچکدار ہے۔ وہ ریاستی اور سیاسی نظام کے لئے حقیقتاً بڑا خطرہ بنے ہوئے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ انہوں نے حکومت کے ساتھ مذاکرات یا مفاہمت کا کوئی عندیہ یا اشارہ نہیں دیا ہے۔ ریاست کو بھی علم ہے کہ پاکستانی طالبان کے فلسفہ میں جمہوریت یا دوسرے ریاستی اداروں کا تصور بھی ناجائز اور مبہم ہے اور ایسی صورت میں ان کے ساتھ بامقصد مذاکرات کا آغاز ممکن دکھائی نہیں دے رہا۔ پاکستانی ریاست 2004ء سے 10-2009ء کے سوات آپریشن تک اس طرح کے مذاکرات متعدد بار کر چکی ہے۔ صرف فاٹا میں تیرہ امن معاہدے کئے جا چکے ہیں تاہم ان تمام

معاہدوں کا کوئی بھی مثبت نتیجہ نہیں نکلا۔سوات امن معاہدے کے تحت حکومت نے تقریباً سرنڈر کردیا تھا اور عسکریت پسندوں کے 90 فیصد مطالبات تسلیم کر لیے گئے تھے۔اس کے باوجود جب بیت اللہ محسود نے فضل اللہ اور صوفی محمد کو معاہدہ توڑنے کا حکم دیا تو انہوں نے ایسا کرنے میں کوئی دیر نہیں لگائی۔

جماعت اسلامی، تحریک انصاف اور بعض سابق فوجی جرنیل مسلسل یہ تجویز دیتے رہے ہیں کہ طالبان کے ساتھ مذاکرات کئے جائیں، تاہم جب ان سے مذاکرات کے حوالے سے ان کے اپنے کردار کا تقاضا کیا جاتا ہے تو وہ بوجوہ خاموش ہو جاتے ہیں۔دوسری طرف طالبان الزام لگا رہے ہیں کہ پاکستانی ریاست چونکہ امریکہ کے سامنے بے اختیار ہے، اس لئے وہ اس حکومت سے مذاکرات کو ایک لاحاصل عمل کے علاوہ کوئی دوسرا نام نہیں دے سکتے۔ان کا نقطہ نظر ہے کہ پاکستانی ریاست سے مذاکرات کا آغاز اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک پاکستان امریکہ کے اتحاد سے الگ نہیں ہو جاتا اور طالبان کے خلاف کارروائیاں روک نہیں دیتا۔وہ اس اَمر کے بھی خواہاں ہیں کہ ان کے خلاف کارروائیاں کرنے یا ان کے ٹھکانے ختم کرنے سے گریز کیا جائے اور ان کے کردار کو ریاستی سطح پر تسلیم کیا جائے۔اس صورتحال نے پاکستانی ریاست کے لئے مذاکرات یا مفاہمت کے ممکنہ راستے محدود کر دیئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ماضی کے ناکام تجربات کے باعث فریقین کے درمیان مذاکرات کی ابتداء کا فی الحال کوئی امکان نظر نہیں آ رہا۔مولوی عمر، حافظ گل بہادر اور ملا نذیر جیسے عسکریت پسند کمانڈر پاکستانی ریاست کے حامی سمجھے جاتے ہیں اور اپنے اپنے علاقوں میں ان کا تسلط بھی قائم ہے، تاہم یہاں یہ مسئلہ درپیش ہے کہ حقانی اور ان گروہوں کو امریکہ کسی قسم کی رعایت دینے پر تیار نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کو مسلسل ڈرون حملوں کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ اگر امریکہ افغانستان سے نکل گیا تو اس کے بعد پاکستانی طالبان کا مستقبل اور لائحہ عمل کیا ہوگا، کیونکہ ان کی سرگرمیوں کا ایک بڑا جواز افغانستان میں امریکہ کی مداخلت اور پاکستان میں اس کا اثر و رسوخ ہے۔اگر وہ واقعتاً ایک اسلامی حکومت کے قیام کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں تو ایسی صورت میں ان کی سرگرمیاں کم نہیں ہوں گی، بلکہ امریکی انخلاء کے بعد ان میں اور بھی اضافہ ہوگا۔اس تمام پیچیدہ صورتحال نے تمام فریقین کو عجیب

قسم کی کشمکش سے دوچار کر دیا ہے۔ دوسری جانب پاکستان کے ریاستی اداروں اور سیاسی قوتوں کی طالبان کے حوالے سے کوئی واضح اور ٹھوس پالیسی نہیں ہے۔ سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ اگر حکومت اور طالبان کے درمیان کسی مرحلے پر واقعتاً مذاکراتی عمل کا آغاز ہوتا ہے تو اس کی ابتداء کون کرے گا، یعنی ان کے درمیان ثالث کون ہوگا؟ فی الوقت ایسی کوئی شخصیت یا قوت میدان میں موجود نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ فریقین کے درمیان اعتماد سازی کا عمل کیسے شروع ہوگا اور اس کی شرائط کیا ہوں گی۔ ایک اور سوال یہ ہے کہ خطے سے وابستہ اپنے مفادات کے باعث امریکہ ایسے مذاکرات یا ان کی کامیابی کی اجازت کیسے دے گا۔ یہاں یہ اَمر بھی قابل ذکر ہے کہ امریکہ افغان طالبان اور حامد کرزئی پر جو اعتماد کر رہا ہے، وہ پاکستان پر نہیں کر رہا۔

دوسری طرف طالبان بھی پاکستان پر اعتماد کرنے کا خطرہ مول لینے سے گھبرا رہے ہیں۔ اس تمام کھیل میں القاعدہ کے کردار کو بھی انتہائی اہمیت حاصل ہے۔ القاعدہ کے نئے سربراہ ایمن الظواہری اور آپریشنل کمانڈر سیف العادل پاکستان کے بارے میں بہت منفی اور جارحانہ جذبات رکھتے ہیں۔ ایمن الظواہری نے تو تحریری طور پر پاکستان کو غیر اسلامی ملک بھی قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ پاکستان کے موجودہ آئین میں اسلامی شقوں کے ہوتے ہوئے بھی اسے اسلامی ملک قرار نہیں دیا جا سکتا۔ دوسری طرف القاعدہ پاکستان میں جتنی مضبوط اور متحرک ہے، اس قدر اب افغانستان میں نہیں ہے۔ ایسے میں اس سوال کا جواب ڈھونڈے بغیر کہ پاکستان اور طالبان کے درمیان مفاہمت کی صورت میں امریکہ اور اس کے اتحادی کہاں کھڑے ہوں گے، کسی قسم کی پیش رفت کا تجزیہ کرنا ممکن نہیں رہتا۔ اگرچہ ہر جنگ اور مسئلے کا حل مذاکرات ہی ہوتے ہیں، تاہم پاکستانی طالبان کے ساتھ مذاکرات یا مفاہمت کا فی الحال کوئی امکان نظر نہیں آ رہا۔ یہ اس لئے بھی شاید ممکن نہیں ہے کہ پاکستانی ریاست طالبان کی قوت ختم کرنے میں ہنوز ناکام رہی ہے اور ریاست کو اپنی سلامتی اور مستقبل کے بارے میں بھی متعدد مشکلات اور خدشات کا سامنا ہے، قطع نظر اس کے کہ بعض حلقے مذاکرات یا مفاہمت کے حق میں ہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ فریقین نے تا حال اس آپشن کے ابتدائی ڈھانچے پر بھی غور کرنا شروع نہیں کیا۔

طالبان کے نام پر نئی ڈالر گیم کا آغاز

امریکہ اور پاکستان کے بعض ریاستی اور غیر ریاستی ادارے آج کل طالبان کو نظریاتی طور پر ان کے پر تشدد رویوں اور کارروائیوں سے باز رکھنے کی کوششوں میں مصروف عمل ہیں۔ ان حلقوں کا کہنا ہے کہ وہ افراد جو مجبوری یا لاعلمی کے باعث عسکریت پسند گروہوں کا حصہ بنے ہیں، ان کی اصلاح ہونی چاہئے تاکہ ان کو پر تشدد رویوں سے باز رکھتے ہوئے پر امن شہری بنایا جاسکے۔ یہ اَمر باعثِ حیرت ہے کہ ان اداروں یا افراد کو ایسا کرنے کا خیال بہت دیر سے آیا ہے، بلکہ ان کو یہ ''نیک کام'' سرانجام دینے کا خیال ایک ایسے مرحلے پر آیا جبکہ پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہے اور طالبان کے لئے واپسی کا راستہ ناممکن ہو گیا ہے۔ غیر جانبدار مبصرین عرصہ دراز سے چیخ رہے تھے کہ طالبان یا عسکریت پسندوں کے تدارک کے لئے فورسز اور حکومتوں کے روایتی طریقوں پر انحصار کرنے کے علاوہ ان کے نظریات کا رَد انتہائی ضروری ہے، تاہم بدقسمتی سے اس تجویز پر اس لیے توجہ نہیں دی گئی کہ اس معاملے سے دلچسپی رکھنے والے تمام فریق عملاً نہ صرف یہ کہ طالبان کو زندہ اور متحرک رکھنا چاہتے تھے بلکہ ان کا ایک المیہ یہ بھی تھا کہ وہ کوئی بھی کام ڈالر لئے اور ڈالر دیئے بغیر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ چونکہ طالبان کی اصلاح کا فارمولا ڈالرز گیم کا حصہ نہیں بنا تھا، اس لئے طالبان پر کام کرنے والے حلقوں، این جی اوز اور اداروں نے محض جذبہ حب الوطنی یا جذبہ انسانیت کے تحت اس نیک کام میں ہاتھ ڈالنے سے مکمل لاتعلقی کا ہی راستہ اختیار کئے رکھا۔ اب جبکہ یہ ایشو ڈالرز گیم کا باقاعدہ حصہ بن چکا ہے، اس لئے لاتعداد ادارے، غیر سرکاری تنظیمیں اور تھنک ٹینک اس ''نیک کام'' کو سرانجام دینے کے لیے میدان میں نکل آئے ہیں۔ ان میں اکثریت ان اداروں یا افراد کی ہے جو کہ نہ تو اس قسم کے کسی مشکل کام کا تجربہ رکھتے ہیں، اور نہ ہی ان کا طالبان سے کبھی کوئی واسطہ رہا ہے اور عوام میں بھی ان کو کوئی پذیرائی حاصل نہیں ہے۔ یہ بات بہت عجیب اور مضحکہ خیز ہے کہ ایسے تمام منصوبوں سے وہ لوگ اور ادارے وابستہ ہوئے ہیں جو کہ قبل ازیں طالبان کو ظالم، سفاک اور پتہ نہیں کیا کیا ثابت کر کے خود کو طالبان کی نظروں میں نہ صرف یہ کہ انتہائی ناپسندیدہ ٹھہرا چکے ہیں بلکہ ان میں سے بعض تو ایسے ہیں جو کہ طالبان کی ہٹ

لسٹ پر بھی ہیں۔ اب یہ منطق سمجھ میں نہیں آ رہی کہ جو لوگ طالبان کو اپنا دشمن سمجھتے آئے ہیں اور ردِعمل کے طور پر طالبان بھی ان کو کوئی رعایت دینے پر تیار نہیں ہیں۔ ان کے ذریعے طالبان کی اصلاح کا کام کیسے اور کیونکر کیا جا سکے گا؟ اس وقت اسلام آباد اور پشاور میں ایسے اداروں کے بے شمار لوگ سرگرم عمل ہیں۔ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اپنی کوششوں اور حکمت عملی کے ذریعے نہ صرف یہ کہ طالبان کے پرامن لوگوں کو ان سے الگ کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے بلکہ طالبان کے نظریات کا رد بھی کریں گے۔

یہ المیہ ہی ہے کہ یہ ادارے اور لوگ یہ مشکل بلکہ ناممکن کام اپنے شاندار دفاتر، قیمتی گاڑیوں اور فائیو سٹار ہوٹلز میں محدود رہتے ہوئے ہی سرانجام دینے کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ ان کا عوام سے کبھی رابطہ نہیں رہا ہے اور نہ ہی یہ لوگ طالبان کے قریب جانے کا خطرہ مول لے سکتے ہیں۔ یہ مشکل ٹاسک ایک ایسے مرحلے پر غیر متعلقہ لوگوں کے ہاتھ میں دیا گیا ہے، جب پاکستانی فورسز کے علاوہ امریکہ بھی طالبان اور ان کے اتحادیوں پر زبردست دباؤ بڑھا کر ایک باقاعدہ جنگ لڑنے میں مصروف ہے اور دوسری طرف طالبان القاعدہ کی مدد سے ایک فیصلہ کن جنگ لڑنے کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ عالمی اور بعض پاکستانی اداروں کے بے پناہ فنڈز اس مقصد کے لئے مختص کئے گئے ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ نت نئے تحقیقی اور اصلاحی اداروں اور غیر سرکاری تنظیموں کے قائم ہونے کا سلسلہ بہت تیز ہوتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ کیا طالبان بھی اس قسم کی کسی اصلاح یا یوٹرن لینے کی کوئی ضرورت محسوس کر رہے ہیں کہ نہیں؟ اس سے وابستہ دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ ان طالبان کی تعداد کتنی ہو سکتی ہے جو کہ مجبوری، لاعلمی یا اقتصادی بدحالی کے باعث طالبان کے ساتھ شامل ہوئے یا پرتشدد تحریک کا حصہ بنے؟ المیہ یہ ہے کہ ان دو سوالوں کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے۔ انہیں محض اتنا ہی معلوم ہے کہ اگر طالبان کو مراعات، ملازمتیں یا بہتر مستقبل کی امید دلائی جائے تو ان کی یہ تحریک نہ صرف دم توڑ جائے گی بلکہ ان کی تعداد بڑھنے کی بجائے کم ہوتی جائے گی اور سخت گیر یا نظریاتی طالبان تنہائی کا شکار ہو جائیں گے۔ حالانکہ اس حقیقت کا سب کو علم ہے کہ طالبانائزیشن ایک نظریاتی ایجنڈے اور وابستگی کا نام ہے اور ان لوگوں کی اکثریت کی جہاد کے عالمگیر فلسفے یا ایجنڈے کے بارے میں معلومات بھی نہ

ہونے کے برابر ہیں۔ طالبانائزیشن کو محض اقتصادی مشکلات کا نتیجہ قرار دینے والے عالمی اور مقامی ادارے یا ان سے وابستہ ایسے افراد یہ حقیقت بھول رہے ہیں کہ ہزاروں افراد اس نظریے سے اپنی کمٹمنٹ کے باعث اپنی زندگیاں داؤ پر لگا چکے ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ یہ تحریک یا یہ فکر پاکستان کے علاوہ امریکہ، روس اور چین جیسی طاقتوں اور پوری دنیا کے لئے ایک بڑے خطرے کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ اگر محض اقتصادی بدحالی یا لاعلمی کے اسباب کے تناظر میں ان تحاریک کا جائزہ لیا جائے گا تو سب سے بڑا سوال یہ پیدا ہوگا کہ دنیا میں ان اسباب کے باعث اتنی قربانیاں دینے، اتنی کارروائیاں کرنے اور اتنی قوت رکھنے والی کسی دوسری تحریک نے کیوں جنم نہیں لیا۔ پاکستان اور افغانستان کے علاوہ دنیا میں بے شمار علاقے یا ممالک ایسے ہیں، جہاں کے باسیوں کو زندگی کی بنیادی ضروریات تو درکنار ایک وقت کی روٹی بھی نہیں ملتی۔ وہاں کے باشندے خودکش حملے کیونکر نہیں کرتے اور وہاں ایسی تنظیمیں کیوں قائم نہیں ہوتیں جو کہ پاکستان، امریکہ اور روس جیسے جدید اور طاقتور ممالک کے لئے واقعتاً خطرہ بنی ہوئی ہیں۔ اس سوال پر بھی کسی نے غور کرنے کی زحمت نہیں کی کہ جہادیوں کے لیے ہمدردی کے جذبات رکھنے والی پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کی موجودگی میں اس قسم کی تحاریک کا چند این جی اوز یا تھنک ٹینکس کے ذریعے راستہ کیسے روکا جائے گا اور یہ بھی کہ پاکستانی ریاست کی مقتدر قوتوں کی پالیسیوں، عزائم اور عمل دخل کو کیسے کاؤنٹر کیا جائے گا۔ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ اس ڈالرز گیم سے بعض ایسے لوگ بھی وابستہ ہو گئے ہیں جو اعلیٰ عہدوں پر فائز رہنے اور تمام تر اختیارات حاصل ہونے کے باوجود محدود علاقے میں بھی طالبان کو پسپا کرنے میں ناکام رہے اور اب ماہرین بن کر یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ وہ نہ صرف یہ کہ طالبان کا عمل دخل کم کر دیں گے بلکہ ان کے جہادی نظریات کا رَد بھی کریں گے۔

مشاہدے میں آیا ہے کہ ان عناصر کی سرگرمیاں کروڑوں روپے کے فنڈز اور بے پناہ دوسرے وسائل حاصل کرنے کے باوجود محض پرپوزل بنانے، سیمیناروں، ورکشاپوں اور انتہائی محدود میڈیائی کمپین تک ہی محدود دکھائی دے رہی ہیں۔ اب کوئی ان سے یہ بھی نہیں پوچھ رہا کہ محض طالبان کے مخالفین یا اس موضوع کے ماہرین کو ایک شاندار دفتر یا فائیو سٹار ہوٹل میں اکٹھا کرنے کے عمل سے طالبان کی اصلاح کا ٹاسک کیونکر پورا ہو سکے گا؟ وہ ادارے جوان کو فنڈز

فراہم کر رہے ہیں، ان میں بھی اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ ان سے یہ پوچھیں کہ جب یہ لوگ طالبان کے قریب نہیں جاسکتے، ان سے بات نہیں کر سکتے اور یہاں تک کہ ان کے علاقوں میں جانے کی جرأت بھی نہیں کرتے تو وہ ان کو اپنا پیغام پہنچانے کا بنیادی کام کیسے کریں گے؟ ایسا دکھائی دے رہا ہے کہ بعض عالمی اداروں نے پاکستان کے حالات اور طالبان کی قوت کا درست اندازہ لگائے بغیر سیاسی قوتوں کی طرح بعض دوسرے طبقوں کو نوازنے اور اپنا ہمنوا بنانے کا ایک ناکام سلسلہ شروع کر دیا ہے، حالانکہ جو لوگ اس گیم سے وابستہ ہیں، ان میں سے اکثریت پہلے ہی سے امریکہ کے حامیوں اور طالبان کے مخالفین پر مشتمل ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت غلط طریقۂ کار اور غیر متعلقہ افراد کے ذریعے بعض معتدل مزاج طالبان کی اصلاح کے کسی ممکنہ یا متوقع امکان کو پہلے ہی سے ناکام بنانے کی کوشش کی جاری ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ تعمیرِ نو کے سلسلے کی طرح اصلاحِ نو کا یہ سلسلہ بھی ناکامی سے دوچار ہو جائے گا۔
ماہرین کا کہنا ہے کہ اس طریقۂ کار کو قبل ازیں مصر، سوڈان، انڈونیشیا، ترکی اور یمن میں استعمال کیا جا چکا ہے، جس کے خاصے مثبت نتائج برآمد ہوئے ہیں، تاہم یہ دعویٰ کرتے ہوئے وہ یہ حقیقت فراموش کر دیتے ہیں کہ پاکستان اور ان ممالک کے عسکریت پسندوں میں نہ صرف یہ کہ بہت زیادہ فرق ہے بلکہ یہ خطہ نظریاتی، جغرافیائی اور افرادی قوت کے اعتبار سے القاعدہ کی زیرِ قیادت دنیا بھر کے تشدد پسند، تربیت یافتہ اور انتہائی کمٹڈ عسکریت پسندوں کا سب سے بڑا مرکز بنا ہوا ہے۔ وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر ہیں کہ پاکستان اور افغانستان میں 09-2008ء کے دوران دنیا کی بدترین اور خطرناک ترین گوریلا جنگ لڑی گئی اور اب اس جنگ کے ایک نئے مرحلے کی تیاری کی جا رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان ممالک میں عسکری رجحانات کے حامل لوگوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی جبکہ ان کی حکومتیں بھی پاکستان کی طرح دو رُخی پالیسی پر عمل پیرا نہیں ہیں۔ ان حالات میں ان ممالک میں رائج رہنے والی کسی حکمتِ عملی کا پاکستان یا افغانستان میں کامیاب ہونا قرین قیاس نہیں لگ رہا۔ اس کے ساتھ ہی ان ممالک اور پاکستان کے درمیان ایک اور بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ وہاں پر نہ صرف یہ کہ ریاستیں ایسا کرنے کے حوالے سے مخلص تھیں بلکہ اس ٹاسک کے لئے ہمارے طریقۂ کار کے برعکس نفسیاتی ماہرین، مصلحین، جید علماء اور معاشرے کے دوسرے نیک

نام لوگوں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔

ایک بڑا سوال؛

بنیادی طور پر عسکریت پسند نظریات کو رَد کرنے کے عمل کی ابتداء چند برس قبل جدید جہاد کے مرکز یعنی مصر سے کی گئی تھی۔ مصر میں جہاد کے ایک انتہائی نامور مبلغ سید امام الشریف مصری المعروف ڈاکٹر فادل ہی وہ شخص تھے جنہوں نے نہ صرف یہ کہ الجہاد نامی خطرناک جہادی تنظیم کی بنیاد رکھی بلکہ بعض ماہرین ان کو اسامہ بن لادن، ڈاکٹر ایمن الظواہری اور الزرقاوی کے فکری استاد بھی سمجھتے ہیں۔ان کی دو مشہور کتابوں نے جہاد کے عالمگیر فلسفے کی ترویج میں انتہائی بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ وہ کافی عرصہ تک القاعدہ کے اہم ترین رہنما بھی رہے تاہم کچھ عرصہ قبل القاعدہ کی موجودہ قیادت اور ڈاکٹر ایمن الظواہری کے مخالف ہو گئے اور انہوں نے اپنے سابقہ طرز عمل کے برعکس جہاد سے متعلق القاعدہ کے طریقۂ کار سے اختلاف کرنا شروع کر دیا۔ سید امام نے جہاد کے نہ صرف یہ کہ نئے تقاضے وضع کئے بلکہ بعض شرائط پر نظر ثانی کی مہم بھی شروع کر دی۔ ان کے اس طرز فکر کو عرب ممالک میں ریاستی اداروں کے علاوہ ان کے ساتھیوں کے ذریعے پھیلانے کے عمل کا آغاز ہوا اور اس کے نتیجے میں القاعدہ سمیت دوسری تنظیموں کے بعض لوگ متاثر ہونا بھی شروع ہو گئے۔ اب یہ حکمتِ عملی پاکستان میں کیسے کامیاب ہوگی، یہ ایک بڑا سوال ہے۔

طالبان اور ہماری یکطرفہ خواہش

سابق وزیراعظم اور مسلم لیگ ن کے سربراہ محمد نواز شریف نے چند روز قبل اپنی پریس کانفرنس میں موقف اپنایا کہ وہ طالبان یا جہادی جو حکومت کے ساتھ مذاکرات کرنا چاہتے ہیں، ان کے ساتھ سنجیدگی سے مذاکرات ہونے چاہئیں۔ایسی ہی ایک تجویز تحریک انصاف کے سربراہ عمران خان کی جانب سے کچھ عرصہ قبل سننے کو ملی تھی، جبکہ مرزا اسلم بیگ، جنرل حمید گل، اسد درانی، علی جان اورکزئی اور متعدد دوسرے افراد کی جانب سے بھی اس قسم کی تجویز وقتاً فوقتاً سامنے آتی رہی ہے۔رستم شاہ مہمند تو ابتداء ہی سے پاکستانی طالبان کے ساتھ مذاکرات کے حق میں ہیں۔یہ لوگ اس ضمن میں جو اہم ترین دلیل دیتے ہیں، وہ یہ ہے کہ اگر امریکہ اور اس کے اتحادی افغان طالبان کے ساتھ مذاکرات کر سکتے ہیں یا کر رہے ہیں تو پاکستان ایسا کیوں نہیں کر سکتا۔اس ضمن میں یقیناً ان صاحب الرائے لوگوں کی تجویز یا دلیل کو یکسر مسترد نہیں کیا جاسکتا تاہم سب سے اہم سوال جو ہم اس سے قبل بھی متعدد بار دہرا چکے ہیں، اب بھی یہ ہے کہ کیا طالبان بھی ایسے کسی مذاکراتی عمل کا حصہ بننے کو تیار ہے یا نہیں؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا پاکستانی طالبان اپنے فیصلوں میں آزاد بھی ہیں یا نہیں؟ اس سوال کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ کیا پاکستانی طالبان، افغان طالبان کی طرح کوئی منظم تنظیمی ڈھانچہ بھی رکھتے ہیں یا نہیں کیونکہ جب تک ایک مرکزی قیادت موجود نہ ہو، مذاکرات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔فی الوقت ان تمام سوالات کا جواب ''نفی'' میں ہی ہے۔یہ معزز حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ افغان طالبان ایک جواز اور سبب کی بنیاد پر امریکہ یا اس کے اتحادیوں کے خلاف مزاحمت کر رہے ہیں اور وہ جواز یہ ہے کہ امریکہ نے نہ صرف یہ کہ افغانستان پر حملہ کیا ہے اور وہاں مسلسل جنگ لڑ رہا ہے بلکہ اس نے 2002ء میں طالبان سے افغانستان کی حکومت بھی چھین لی تھی۔یہی وجہ ہے کہ افغان طالبان کو مقامی آبادی کی محدود حمایت بھی حاصل ہے۔تاہم پاکستان کے طالبان کا معاملہ ان سے یکسر مختلف بلکہ کسی حد تک پیچیدہ بھی ہے۔یہ لوگ بظاہر اس بنیاد پر ریاست اور یہاں کے عوام کیخلاف برسر پیکار ہیں کہ پاکستانی ریاست افغانستان میں امریکی آپریشن کی حمایت کر رہی ہے اور پاکستانی سیاستدان یا عوام اس

پالیسی کی مخالفت نہیں کر رہے۔ سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ کیا پاکستان نائن الیون سے قبل امریکہ کا حمایتی نہیں تھا اور یہ بھی کہ کیا پاکستانی طالبان افغانستان پر امریکی حملے سے قبل فاٹا، پنجاب اور پختونخوا میں فعال نہیں تھے۔ سوات میں صوفی محمد نے 90ء کی دہائی میں جو خونریز اور پرتشدد تحریک شروع کی تھی، کیا اس کا جواز یہ تھا کہ امریکہ افغانستان پر حملہ آور ہوا تھا۔ اس وقت تو حالات بالکل نارمل تھے۔ اس دوران ایک ایم پی اے اور متعدد سرکاری افسران سمیت جن بیسیوں افراد کو ہلاک کیا گیا، کیا وہ امریکہ کے حامی یا طالبان کے مخالف تھے؟ اس زمانے میں تو افغان طالبان کے عروج کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا۔ سوال یہ ہے کہ جو کالعدم تنظیمیں آج پنجابی طالبان کے نام سے پنجاب کو بار بار نشانہ بنا رہی ہیں، وہ افغانی طالبان یا امریکی حملے کی پیداوار ہیں یا طالبان کے وجود میں آنے سے قبل بھی پاکستان میں اپنے منظم نیٹ ورک چلا رہی تھیں؟ جو لوگ طالبان کے ساتھ مذاکرات کی بات کر رہے ہیں، ان سے بجاطور پر یہ بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ القاعدہ کے جو اہم لیڈر پاکستان آئے اور پاکستانی اداروں نے ان کو مختلف شہروں سے گرفتار کیا، ان کی پاکستان میں روپوشی کا عالمی قوانین کے مطابق کون سا جواز تھا۔

ہمیں اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ نواز شریف اور مذکورہ تمام معزز حضرات ہر بڑے سانحے یا حملے کے بعد تو بڑی تواتر سے اس کی ذمہ داری بلیک واٹر، سی آئی اے اور دوسرے ان اداروں پر بغیر کسی تحقیق، تفتیش اور ثبوت کے چند ہی منٹوں میں ڈال دیتے ہیں جن کو یہ لوگ پاکستان اور اسلام کے دشمن قرار دیتے آئے ہیں۔ ایسے میں یہ سوال بھی اٹھنا فطری سی بات ہے کہ اگر یہ حملے واقعتاً غیر ملکی یا اسلام دشمن اور پاکستان دشمن ادارے ہی کرتے آئے ہیں اور ان کے بقول بعض طالبان قوتیں ان اداروں کا آلۂ کار بن گئی ہیں تو یہ فیصلہ کون کرے گا کہ کون نظریاتی طالب ہے اور کون بکنے والا طالب ہے۔ محمد نواز شریف اور ان کی صوبائی حکومت سے یہ بھی پوچھنا چاہیے کہ اگر طالبان خصوصاً مقامی طالبان ان پے در پے واقعات میں ملوث نہیں ہیں تو جو غیر ملکی مقامی آبادی میں رہتے ہوئے ریاست کو چیلنج کر رہے ہیں اور معصوم لوگوں کی جانیں لے رہے ہیں مسلم لیگ ن کی صوبائی حکومت ان کو گرفتار کیوں نہیں کر سکی اور گرفتاریوں کے بعد ان کو عدالتوں میں پیش کر کے ان غیر ملکی قوتوں کو بے نقاب کیوں نہیں کرتی جو ان کے بقول اس قسم کے حملوں میں

ملوث رہی ہیں یا ملوث ہیں۔

کیا شہباز شریف انتظامیہ کو رحمان ملک نے ایسی گرفتاریوں سے روک رکھا ہے؟ اس نازک موقع یا موڑ پر ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ پاکستانی ریاست 2000 سے لیکر 2008 کے اواخر تک مختلف طالبان تنظیموں کے ساتھ مختلف اوقات میں آٹھ امن معاہدے کر چکی ہے، تاہم یہ تمام کے تمام ناکام ہو گئے۔ اے این پی جیسی سیکولر پارٹی نے تو سواتی طالبان کے ساتھ مسلسل مذاکرات کر کے ان کی شرائط کے مطابق دو امن معاہدے کر کے رسوائی اور ناکامی ہی پائی۔ اس وقت بھی بہت سے سیاسی رہنما اور تجزیہ کار سوات میں نافذ ہونے والی مجوزہ شریعت کو پورے پاکستان کیلئے رول ماڈل قرار دے کر بہت خوش ہو رہے تھے، تاہم جب بیت اللہ محسود نے صوبائی حکومت کو ایک ہفتہ کے اندر اقتدار چھوڑنے کی دھمکی دے دی اور صوفی محمد نے گراسی گراؤنڈ میں سیاست، جمہوریت، پارلیمان اور عدلیہ کو خلاف اسلام قرار دیا تو اس وقت کوئی بھی ایسا ثالث میدان میں موجود نہیں تھا جو بیت اللہ یا فضل اللہ سے رابطہ کر کے ان کو لچک دکھانے کا مشورہ دیتا۔

حال ہی میں مرزا اسلم بیگ نے خود انکشاف کیا ہے کہ ان سمیت بعض دوسرے لوگ پاکستانی طالبان کے ساتھ اس لیے رابطوں میں ہیں کہ وہ پاکستان پر حملے کرنا بند کر دیں اور افغانستان میں جا کر امریکہ اور اس کے اتحادیوں کیخلاف جنگ لڑیں۔ یہاں یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ جب اس قسم کی باتیں یا تجاویز آن دی ریکارڈ سامنے آتی ہیں تو امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو افغانستان میں پاکستانی مداخلت کو ثابت کرنے کیلئے تگ و دو کرنے کی ضرورت ہی کیا رہتی ہے۔ اسلم بیگ اور حمید گل جیسے ذمہ دار لوگ یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ پاکستان اور افغان طالبان جس نظریاتی اور منظم قوت سے استفادہ حاصل کر رہے ہیں اور جس کی قیادت میں اس خطے میں لڑ رہے ہیں، اس کا نام القاعدہ ہے اور القاعدہ کے مقاصد اور اہداف کو مقامی یا علاقائی کہنا حماقت ہی کہلائی جا سکتی ہے۔ ہماری اسی اپروچ اور مائنڈ سیٹ کا نتیجہ ہے کہ دنیا کی واحد سپر پاور امریکہ کے صدر کو چند روز قبل ٹورنٹو میں یہ خطرناک بیان دینا پڑا کہ اسامہ بن لادن (انہیں رواں برس 2 مئی کو امریکہ نے ایک خفیہ آپریشن کر کے ایبٹ آباد میں ہلاک کر دیا) پاکستان میں ہیں جبکہ

ہم ان کا افغانستان کے پہاڑوں میں پیچھا کر رہے ہیں۔ وہ لوگ جو طالبان کے ساتھ مذاکرات اور مفاہمت کی بات کر رہے ہیں، ان کو مہربانی کر کے طالبان کو بھی یہ مشورہ دینا چاہیے کہ وہ پاکستانی ریاست کے ساتھ اپنے بعض مطالبات یا شرائط کی بنیاد پر مفاہمت کرنا چاہتے ہیں تو گرین سگنل کے طور پر کوئی مثبت بیان ہی جاری کر دیں تاکہ پاکستان کی حکومت اور عوام کو یہ تو معلوم ہو سکے کہ پاکستانی طالبان آخر چاہتے کیا ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ حضرات مزید پیچیدگیاں پیدا کرنے کی بجائے طالبان کے ہمدردوں کے طور پر ان سوالات کا جواب دے ہی دیں جو عوام کے ذہنوں میں ہیں۔
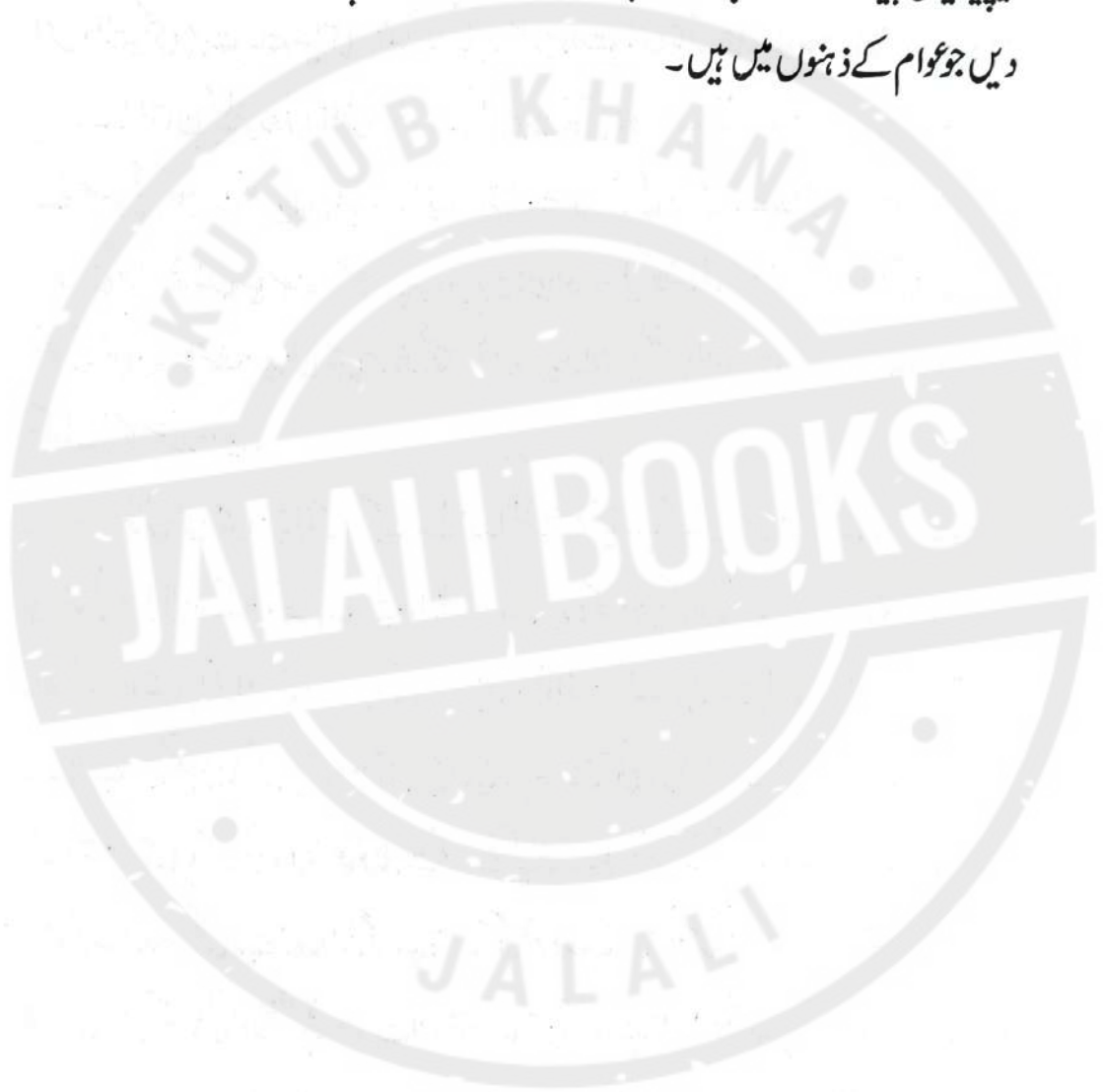
فاٹا کی تاریخ اور مستقبل

وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقوں (فاٹا) پر دنیا بھر میں طویل بحث ومباحثہ جاری ہے اور اب تو فاٹا کو دنیا کا خطرناک ترین خطہ قرار دیا جا رہا ہے اور بعض حلقے اسے تیسری عالمی جنگ کا مرکز بھی قرار دے رہے ہیں۔ 80ء کی دہائی کے دوران یہ علاقہ عسکریت پسند گروہوں کا محفوظ ٹھکانہ قرار پایا اور اسے افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف لڑنے کے لئے بیس کیمپ اور بھرتی کے مرکز کی حیثیت حاصل رہی۔ قبل ازیں برطانوی سامراج نے اس علاقے کو برصغیر اور وسطی ایشیاء خصوصاً افغانستان کے لئے اپنے استعماری قوانین اور ضوابط کے تحت بفرزون کا درجہ دیا ہوا تھا۔ وزیرستان میں فقیر آف ایپی اور بعض دوسرے حریت پسندوں نے ابتدائی ادوار کے دوران برطانوی افواج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور مزاحمت یہاں تک پہنچ گئی کہ فضائیہ کو بھی حریت پسندوں کے خلاف استعمال کیا گیا۔ 27220 مربع کلومیٹر پر مشتمل اس خطے کی کل آبادی 1998ء کی مردم شماری کے مطابق 3176331 ہے۔ برطانوی راج نے 1901ء میں قبائلی علاقوں میں متعدد ایجنسیاں قائم کیں، جبکہ دوسرے علاقوں کے مقابلے میں فاٹا کے لئے ایف سی آر اور بعض دوسرے امتیازی اور ظالمانہ قوانین بنائے گئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد بھی قبائلی ایجنسیوں کی تعداد میں اضافہ کیا جاتا رہا اور یہ سلسلہ 1973ء تک جاری رہا۔ اس وقت قبائلی ایجنسیوں کی تعداد سات ہے جبکہ نیم قبائلی علاقوں ایف آر کی تعداد 9 ہے۔ فاٹا میں جو ایجنسیاں قائم ہیں، ان کے نام کچھ اس طرح ہیں؛

1۔ خیبر ایجنسی 2۔ باجوڑ ایجنسی 3۔ مہمند ایجنسی 4۔ اورکزئی ایجنسی 5۔ کرم ایجنسی 6۔ جنوبی وزیرستان 7۔ شمالی وزیرستان۔ یہ تمام ایجنسیاں ایک دوسرے کے ساتھ متصل ہیں جبکہ دوسری طرف ان کی سرحدیں افغانستان اور پاکستان کے صوبہ خیبر پختونخوا کے ساتھ ملتی ہیں۔ یہی وہ

جغرافیائی اہمیت ہے جس نے فاٹا کو کبھی پرامن نہیں ہونے دیا۔ امتیازی ریاستی حیثیت اور فرسودہ نظام نے فاٹا کے عوام کو انسانی حقوق اور دوسری بنیادی ضروریات سے محروم رکھا۔ برصغیر کی آزادی کے بعد قائداعظم محمد علی جناح نے فاٹا کی نیم خودمختار حیثیت کو قائم رہنے دیا اور اعلان کیا کہ یہاں کے عوام پر مروجہ ریاستی قوانین لاگو نہیں ہوں گے تاکہ وہ اپنے روایتی نظام اور ثقافت کے مطابق آزادانہ طور پر زندگی گزار سکیں۔ دوسری طرف گندھک اور ایسے دوسرے معاہدوں کے تحت ان علاقوں کے عوام کے لئے افغانستان کے مخصوص عمل دخل کا جو آپشن رکھا گیا تھا، وہ پاکستان کی آزادی کے باوجود فاٹا میں موجود اور فعال رہا اور شاید یہی وجہ ہے کہ فاٹا کے معاملات پر افغان ریاست اور سیاست بھی مسلسل اثر انداز ہوتی رہی۔ اگر یہ کہا جائے کہ فاٹا ان معاہدوں یا بعض دعوؤں کے مطابق ایک متنازعہ علاقہ ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ 1997ء تک فاٹا کے لاکھوں عوام بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ووٹ کے حق سے محروم تھے، چند مخصوص ملکوں کو ووٹ کا حق حاصل تھا ،تاہم 1996ء کے بعد قبائلی عوام کو یہ حق دیا گیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 1997ء کے الیکشن میں فاٹا کے عام لوگوں نے بڑی تعداد میں ووٹ ڈال کر اپنے نمائندوں کے انتخاب کو ممکن بنایا۔ تاہم یہ عمل ان کی زندگیوں میں کوئی تبدیلی نہ لا سکا اور حالات جوں کے توں رہے۔ اس وقت قومی اسمبلی میں فاٹا کے ارکان اسمبلی کی تعداد 12 جبکہ سینیٹرز کی تعداد 8 ہے۔ صوبائی اسمبلی میں اس خطے کی کوئی نمائندگی نہیں ہے، حالانکہ فاٹا سے متعلق بیش تر معاملات پشاور سے منتظم کیے جاتے ہیں۔ خیبر ایجنسی کا ہیڈ کوارٹر فاٹا سیکرٹریٹ اور متعدد دوسرے دفاتر پشاور میں ہی قائم ہیں جبکہ اس خطے کے انتظامی سربراہ یعنی گورنر بھی پشاور میں ہی بیٹھتے ہیں۔ یہ پاکستان کا واحد علاقہ ہے جس کی اپنی کوئی اسمبلی ہے، نہ ہی کسی صوبائی اسمبلی میں اس کی کوئی نمائندگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے عوام کے مسائل میں اضافہ ہوتا رہا اور عوام کا احساسِ محرومی مختلف ادوار میں بغاوت کی صورت اختیار کر گیا۔ اراکینِ قومی اسمبلی اور سینٹ ہر دور میں بکاؤ مال ثابت ہوئے کیونکہ وہ غیر جماعتی نظام کے تحت اسمبلی میں پہنچتے ہیں اور وہ ہر حکومت کا ساتھ دینے کے باوجود عوام کی نمائندگی کا اپنا فریضہ کبھی احسن طریقے سے ادا نہیں کر پائے۔ قبائلی علاقوں کے اراکینِ اسمبلی پاکستان کے کرپٹ ترین عوامی نمائندوں میں شمار ہوتے رہے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عوام پارلیمان یا حکومت کے فیصلوں کو خاطر میں نہیں لاتے، کیونکہ ان کو اپنے عوامی نمائندوں پر اعتماد نہیں ہے۔

1۔ سیاسی، جمہوری نظام اور فاٹا:

فاٹا پاکستان کا وہ واحد علاقہ ہے جہاں کے عوام کو سیاسی پارٹی بنانے یا سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی اجازت نہیں ہے۔ ان کو حقِ رائے دہی دیا گیا ہے تاہم ان پر سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر پابندی عائد ہے۔ کسی بھی سیاسی جماعت کو فاٹا میں دفاتر قائم کرنے، جھنڈا لہرانے یا جلسہ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ دوسری طرف جہادی تنظیموں اور مذہبی جماعتوں پر عملاً ایسی کوئی پابندی عائد نہیں ہے۔ نتیجتاً فاٹا کبھی قومی سیاست یا ریاست کے مرکزی دھارے میں شامل نہیں ہوسکا۔ سیاست پر پابندی نے جہاں فاٹا کے عوام کو سیاسی عمل سے دور رکھا ہے، وہاں اس پابندی سے مذہبی قوتوں اور جہادی تنظیموں نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور وہ عوام کو بغیر کسی رکاوٹ کے اپنی طرف راغب کرنے میں کامیاب رہیں۔ سیاسی جماعتیں چونکہ فاٹا میں تنظیم سازی نہیں کرسکتی تھیں اور نہ ہی ان کو سیاسی سرگرمیوں کی اجازت تھی، اس لئے اس کا تمام تر فائدہ مذہبی حلقوں کو پہنچتا رہا اور وہ قبائلی معاشرے پر حاوی رہے۔ کسی بھی سیاسی حکومت کو فاٹا میں اصلاحات کی جرأت نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ 1996ء میں قبائلی عوام کو بالغ رائے دہی کا جو حق دیا گیا، اس کا کریڈٹ بھی مرحوم فاروق لغاری کی نگران حکومت کو جاتا ہے۔ سیاسی حکومتیں پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ کی توسیع میں بھی ناکام رہیں اور یہی وجہ ہے کہ فاٹا سیاست کے قومی دھارے سے باہر رہا۔

2010ء میں صدر آصف علی زرداری نے فاٹا کے لئے اصلاحاتی پیکج کا اعلان کیا اور اس میں پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ کی توسیع کا نکتہ بھی شامل تھا، تاہم طاقتور اسٹیبلشمنٹ کو یہ اقدام ناگوار گزرا اور اس نے فاٹا میں دہشت گردی اور امن وامان کی بدترین صورتحال کے بہانے اس اعلان پر عمل نہیں ہونے دیا۔ یوں یہ مثبت اعلان محض نمائشی اقدام ہی ثابت ہوا (رواں برس اگست میں بالآخر ایف سی آر ترمیمی آرڈیننس جاری ہوگیا ہے، جس کے تحت قبائلی عوام کو کچھ حقوق حاصل ہوسکیں گے)۔ دوسری اصلاحات بھی محض اعلان تک ہی محدود رہ گئیں۔ حکومت یا سیاسی جماعتیں فاٹا میں کس قدر بے بس ثابت ہوتی آئی ہیں، اس کا اندازہ اس اَمر سے لگایا جاسکتا ہے کہ صدر زرداری نے فاٹا کے چیف ایگزیکٹو کی حیثیت سے اپنے دورِ اقتدار کے دوران اس خطے کا ایک بھی دورہ نہیں کیا۔ گورنر نے بھی اس خطے کا کوئی دورہ نہیں کیا۔ گورنر کی تمام فعالیت محض گورنر ہاؤس کی

عمارت یا کسی نمائشی قبائلی جلسے سے خطاب تک محدود ہو کر رہ گئی ہے اور سال 2001ء کے بعد فاٹا کے تمام معاملات پاک فوج یا اس کی ایجنسیاں چلاتی آ رہی ہیں۔ عملی طور پر فاٹا سیاستدانوں یا سول حکمرانوں کے لئے 2002ء کے بعد سے نوگوایریا کی صورت اختیار کر گیا ہے اور مستقبل میں بھی ان حالات میں تبدیلی کی کوئی امید نظر نہیں آ رہی۔

سات قبائلی ایجنسیوں پر مشتمل فاٹا کا شمار دنیا کے پسماندہ ترین علاقوں میں ہوتا ہے، یہاں کے لاکھوں عوام بنیادی انسانی حقوق اور ضروریات سے بھی محروم ہیں۔ انہیں تیسرے درجے کے شہری کی حیثیت بھی حاصل نہیں ہے۔ تعلیم کا معیار انتہائی ابتر ہے اور اس کی شرح بہت کم ہے۔ 65 فیصد لوگ غربت کی لکیر کے نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔ صرف 34 فیصد لوگوں کو صاف پانی تک رسائی حاصل ہے، جبکہ ہزاروں کلومیٹر پر مشتمل اس قدر وسیع علاقے میں صرف ایک ہزار مربع میل اراضی قابلِ کاشت ہے۔ فاٹا میں مردوں (میل) کی شرح خواندگی 17 سے 25 فیصد تک ہے، جبکہ خواتین کی شرح خواندگی پانچ فیصد سے زیادہ نہیں ہے۔ پورے علاقہ میں ایک بھی یونیورسٹی نہیں ہے جبکہ گرلز کالجز کی تعداد بھی نہ ہونے کی برابر ہے۔ 2004ء کے بعد تو لڑکیوں کے علاوہ لڑکوں پر بھی حصول علم کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق خواتین میں سب سے زیادہ شرح خواندگی 11.4 فیصد کرم ایجنسی میں ہے۔ دوسرے نمبر پر خیبر ایجنسی ہے، جہاں یہ شرح دس فیصد ہے۔ شمالی وزیرستان میں خواتین میں شرح خواندگی 1.47، جنوبی وزیرستان میں 4.3، اورکزئی میں 3.4، مہمند ایجنسی میں 3.4 جبکہ باجوڑ ایجنسی میں تین فیصد ہے۔

شعبۂ صحت کی حالتِ زار بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ علاقے میں 7670 افراد کے لئے محض ایک ڈاکٹر جبکہ 2179 افراد کے لئے ہسپتال کا محض ایک بیڈ میسر ہے۔ پاکستان کے دوسرے علاقوں کی نسبت فاٹا کے عوام کی تعلیم اور صحت کی سہولیات تک رسائی پچاس سے ساٹھ فیصد تک کم ہے۔ علاقے میں صنعتیں نہ ہونے کے برابر ہے جبکہ فاٹا کے 42 فیصد حصے میں بجلی کی سہولت میسر نہیں ہے۔ مواصلات کی سہولیات بھی نہ ہونے کے برابر ہیں اور 70 فیصد علاقے ایسے ہیں جہاں پر سڑکیں نہیں ہیں۔ ریاست کی رٹ صرف بڑی شاہراہوں تک محدود ہے۔ یہ شاید دنیا کا وہ واحد

علاقہ ہے جہاں عام عدالتی نظام موجود نہیں ہے۔ فرسودہ اور ناکارہ (اب غیر فعال بھی) انتظامی ڈھانچے کے تحت تحصیلدار، اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ یا پولیٹیکل ایجنٹ انتظامی سربراہ بھی ہوتا ہے اور وہ جج کے فرائض بھی سرانجام دے رہا ہوتا ہے۔ یعنی اگر کسی کو انتظامیہ سے کوئی شکایت ہو تو اسے اسی انتظامیہ کے سربراہ سے انصاف مانگنا ہوتا ہے۔ فاٹا کے عوام کو اس فرسودہ عدالتی نظام کے خلاف ملک کی اعلیٰ عدلیہ میں جانے کا حق بھی حاصل نہیں ہے۔ 2007ء میں نیویارک ٹائمز نے اپنی ایک رپورٹ میں پولیٹیکل ایجنٹ کو دنیا کے کسی بھی انتظامی ڈھانچے کا کرپٹ ترین شخص قرار دیا۔ پولیٹیکل ایجنٹ کے پاس لامحدود اختیارات اور مالی وسائل ہوتے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ متعدد سابق گورنرز اور پولیٹیکل ایجنٹس اربوں روپے کے اثاثوں کے مالک بن گئے۔

فاٹا میں بینکنگ کا بھی کوئی نظام نہیں ہے، جبکہ ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ اتنے وسیع علاقے اور اتنی بڑی آبادی کو این ایف سی ایوارڈ میں سرے سے شامل ہی نہیں کیا گیا۔ عوام کا اگرچہ زیادہ انحصار پشاور پر ہے، لیکن وہ بنیادی نوعیت کے فیصلوں اور اقدامات کے لیے وفاق کی جانب دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ صوبے اور وفاق کے درمیان سینڈوچ بنے ہوئے ہیں تو غلط نہیں ہوگا۔ قبائلی علاقوں کے اجتماعی ذمہ داری کے قانون کے تحت کسی بھی معصوم شہری کو اس کے کسی رشتہ دار کے جرم کی سزا دی جا سکتی ہے اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔ فاٹا کے عوام قبل ازیں پولیٹیکل انتظامیہ کے رحم وکرم پر تھے، اب ان کے مستقبل کے فیصلوں میں طالبان اور فوجی افسروں کے عمل دخل میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ فاٹا میں روایتی نظام کے خاتمے کے بعد کوئی متبادل نظام نافذ نہیں کیا گیا، جس سے بڑا انتظامی بحران پیدا ہو گیا ہے۔

فاٹا بعد از نائن الیون؛

فاٹا 80ء کی دہائی سے عسکریت پسندوں کا بہت بڑا مرکز رہا ہے، کیونکہ مقتدر قوتوں نے اس علاقے کو اس مقصد کے لئے استعمال کرنے کی مستقل پالیسی اپنائی ہوئی تھی۔ افغان جہاد کے دوران سب سے زیادہ بھرتی فاٹا، پختونخوا اور جنوبی پنجاب سے ہی ہوئی۔ کرم ایجنسی، باجوڑ ایجنسی اور وزیرستان کی دونوں ایجنسیوں میں جہادیوں کے بعض کیمپ بھی کام کرتے رہے، جبکہ یہاں

عربوں اور دوسرے جہادیوں کی آمدورفت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ قبائلی علاقوں میں چونکہ سیاسی ڈھانچہ موجود نہیں تھا اور ریاست نے اسے ''علاقہ غیر'' ہی قرار دے رکھا تھا، اس لئے جہادی سرگرمیوں کی راہ میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں تھی۔ 90ء کی دہائی میں جب افغانستان میں طالبان کی تحریک کا آغاز ہوا تو فاٹا میں جہادیوں کی سرگرمیوں میں ایک بار پھر شدت آئی۔ اب نصف درجن سے زائد عسکری تنظیمیں قائم ہوئیں۔ ان میں سے اکثریت کا تعلق دیوبندی مسلک سے تھا۔ حقانی نیٹ ورک کا مرکز چونکہ شمالی وزیرستان میں تھا، اس لئے دونوں ایجنسیوں میں کھلے عام عسکریت پسندوں کی بھرتی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ہزاروں افراد نے طالبان اور دوسری عسکریت پسند تنظیموں کی قیادت میں شمالی اتحاد کے خلاف لڑنا شروع کر دیا۔ سراج الدین حقانی' مولوی عمر' حافظ گل بہادر' عبداللہ محسود' قاری صادق' الیاس کشمیری' فقیر محمد' عمر خالد' حاجی نذیر اور متعدد دوسرے کمانڈروں کا اثر ورسوخ بڑھنے لگا، تاہم کمانڈر نیک محمد کو غیر معمولی اہمیت حاصل رہی۔ پنجابی اور کشمیری طالبان یا جہادی بھی وزیرستان کا رخ کرنے لگے۔ اس تمام عمل کو پاکستان کی مذہبی قوتوں اور متعدد حلقوں کی مکمل آشیرباد اور معاونت حاصل رہی کیونکہ ریاست اور اس کے اتحادی افغانستان میں طالبان کی مکمل حمایت کر رہے تھے۔ دیوبندی مسلک کے جید علماء افغانستان میں طالبان حکومت کے دور میں اہم عہدوں پر فائز ہوئے جبکہ عسکریت پسند کمانڈرز کو نئے سیٹ اپ میں بہت زیادہ اہمیت دی جانے لگی۔ نائن الیون کے سانحہ نے فاٹا کے عوام کی مشکلات میں مزید اضافہ کر دیا۔ طالبان حکومت کے خاتمے کے بعد نہ صرف پاکستانی عسکریت پسندوں اور افغان کمانڈرز نے فاٹا کا رخ کر لیا، بلکہ القاعدہ' جنداللہ سمیت متعدد غیر ملکی عسکریت پسند تنظیموں کے رہنماؤں، کمانڈروں اور جنگجوؤں نے بھی فاٹا خصوصاً وزیرستان کی دونوں ایجنسیوں میں روپوشی اختیار کی۔ ہزاروں کی تعداد میں عسکریت پسند فاٹا میں پھیلنا شروع ہوگئے۔ اس دوران مقامی عمائدین یا معززین نے ان قوتوں کی مخالفت کی کوشش کی، جس کے باعث انہیں چن چن کر مارا جانے لگا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 2008ء تک فاٹا میں 480 عمائدین کے علاوہ دو ہزار سے زائد دوسرے مخالفین کو قتل کیا جا چکا تھا۔ اس حوالے سے ایک ازبک کمانڈر طاہر یلداشیف اور اس کے دوسرے غیر ملکی جنگجوؤں نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ ایک وقت وہ آیا جب فاٹا میں مقامی اور افغان

جنگجوؤں کے علاوہ دنیا بھر سے آنے والے عسکریت پسندوں کی تعداد 35 سے 50 ہزار تک پہنچ گئی، جبکہ نئے آنے والوں کی تربیت کے لئے نصف درجن سے زائد تربیتی کیمپ بھی قائم کیے گئے۔ ان کیمپوں میں عسکریت پسندوں کی نظریاتی تعلیم کے علاوہ خودکش حملہ آوروں کی تربیت کا سلسلہ بھی جاری رہا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند ہی برسوں کے دوران سینکڑوں کی تعداد میں فدائین پورے خطے میں پھیل گئے۔

جون 2004ء میں عسکریت پسندوں کے سب سے اہم کمانڈر نیک محمد کو ڈرون حملوں کا نشانہ بنایا گیا، اس واقعہ سے محض چند ہفتے قبل 27 مارچ کو پاک فوج اور نیک محمد کے درمیان معاہدہ بھی ہوا تھا، جس کو معاہدۂ رشکئی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یوں 2004ء سے فاٹا میں ڈرون حملوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور 2007ء کے دوران اس میں مزید شدت آ گئی۔ 10-2009ء کے دوران ڈرون حملوں میں مزید اضافہ ہوا اور ان میں کم از کم 2700 لوگ مارے گئے، جن میں القاعدہ اور طالبان کے پچاس کے لگ بھگ کمانڈرز بھی شامل ہیں۔ ڈرون حملوں کا امریکہ کی طرف سے سب سے بڑا جواز یہ فراہم کیا جاتا رہا کہ اہم اور مطلوب افراد کو چونکہ پاکستانی فورسز نشانہ نہیں بنا سکتی ہیں، اس لئے ان کے خاتمے کے لئے ڈرون ہی سب سے موزوں ہتھیار ہے۔ ڈرون حملوں کی شرح میں دراصل اس وقت اضافہ شروع ہوا، جب 2007ء میں تحریک طالبان پاکستان (ٹی ٹی پی) کے نام سے ایک فعال اور خطرناک عسکریت پسند گوریلا تنظیم کا قیام عمل میں آیا اور اس نے پاکستان کے خلاف بھی کارروائیاں شروع کر دیں۔ تحریکِ طالبان کو بیت اللہ محسود کی صورت میں ایک متحرک کمانڈر میسر آ گیا جبکہ اس کی ٹیم میں حکیم اللہ محسود، ولی الرحمان، قاری حسین، طارق آفریدی اور بعض دوسرے کمانڈر بھی شامل تھے۔ تحریکِ طالبان پاکستان نے 2008ء کے بعد پشاور، اسلام آباد، لاہور، کراچی سمیت پاکستان کے تمام بڑے شہروں میں خودکش حملے کر کے ریاست، سیاست اور معاشرے کو ہلا کر رکھ دیا۔ دنیا بھر کی جنگجو تنظیمیں قبائلی علاقوں میں جمع ہو گئیں اور تحریکِ طالبان پاکستان نے تمام قبائلی ایجنسیوں میں نہ صرف یہ کہ اپنی تنظیمیں قائم کیں بلکہ کارروائیاں بھی تیز کر دیں، جس کے باعث ڈرون حملوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا جبکہ پاکستانی فورسز کی تعداد میں بھی اضافہ ہونے لگا۔

پاکستان کی تاریخ میں 2004ء میں پہلی بار تقریباً 80 ہزار فوجی افسر و اہلکار فاٹا اور خصوصاً وزیرستان میں تعینات کیے گئے۔ بعض حلقوں نے ڈرون حملوں کے علاوہ فوج کی تعیناتی کے فیصلے کو بھی غلط قرار دیا۔ پاکستانی کی قومی سلامتی اور عالمی برادری کی تشویش کے تناظر میں ریاست کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ فاٹا کو طالبان اور القاعدہ کے رحم و کرم پر چھوڑتی۔ اس تمام عرصہ کے دوران فاٹا میں مجموعی طور پر حکومت اور مختلف جنگجو تنظیموں کے درمیان کل 13 معاہدے ہوئے، تاہم یہ تمام معاہدے بوجوہ ناکام ثابت ہوئے۔ ان میں آٹھ معاہدے صرف جنوبی اور شمالی وزیرستان کے طالبان کے ساتھ کیئے گئے، اس کے باوجود تصادم کا سلسلہ جاری رہا اور معاہدے ٹوٹتے رہے۔ اس کے ساتھ ہی پاکستانی ریاست پر حملوں کی شرح بھی بڑھتی رہی۔ 2010ء کے وسط میں بیت اللہ محسود ایک ڈرون حملے میں ہلاک ہوگیا تو حکیم اللہ محسود کو تحریکِ طالبان پاکستان کا نیا سربراہ بنا دیا گیا، جس نے ریاست مخالف کارروائیوں کو مزید بڑھا دیا۔ اس عرصہ کے دوران دوسری ایجنسیوں میں بھی محدود پیمانے پر ڈرون حملے کیے گئے، جبکہ محدود پیمانے پر فوجی آپریشن بھی کیے جاتے رہے، تاہم ان تمام کارروائیوں کے باوجود حملہ آوروں کا نہ تو خاتمہ کیا جاسکا اور نہ ہی حملوں کی تعداد میں کمی لائی جاسکی۔ PIPS کی سالانہ سکیورٹی رپورٹ کے مطابق، 2010ء کے دوران پاکستان میں پرتشدد کارروائیوں میں 10700 افراد کو ہلاک کیا گیا۔ یہ تعداد عراق اور افغانستان میں ہونے والی ہلاکتوں کی مجموعی تعداد سے زیادہ ہے۔ مجموعی طور پر فاٹا کے عوام اس تمام عرصہ کے دوران نقل مکانی، معاشی بدحالی، معاشرتی انحطاط اور سہ طرفہ حملوں کا شکار رہے، یعنی ان کو بیک وقت القاعدہ و طالبان، پاک فوج اور ڈرون طیاروں کے مسلسل حملوں کا سامنا رہا اور ان کی زندگی اجیرن بن کر رہ گئی۔ اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ نائن الیون کے بعد پوری دنیا میں اگر مستقل طور پر کوئی ایک خطہ بہت بڑی تباہی، نسل کشی اور معاشرتی انحطاط کا شکار بنا ہے تو وہ فاٹا ہی ہے۔ فاٹا کے عوام اور ان کے نمائندے اس تمام کھیل کے دوران اجنبی بن کر بے بسی کی تصویر بنے رہے اور ان کو کسی وقفے کے بغیر سہ طرفہ حملوں، سازشوں، الزامات اور بدنامیوں کا سامنا کرنا پڑا، نہ کسی کی جان محفوظ رہی اور نہ ہی کسی کی آبرو اور مال۔ ریاستی انفراسٹرکچر مکمل طور پر تباہ و برباد ہوگیا ہے۔

فاٹا کا مستقبل؛

فاٹا میں صورتحال دن بدن بدتر ہوتی جارہی ہے۔ سیاست دانوں اور میڈیا کے علاوہ ان قبائلی ایجنسیوں میں ان قبائلی عمائدین کا داخلہ بھی ممنوع ہے جو عسکریت پسندوں کی مخالفت کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فاٹا اور خاص طور پر شورش زدہ علاقوں کے حالات کے بارے میں صحیح صورتحال عوام کے سامنے نہیں آ رہی۔ سیاسی اور انتظامی اصلاحات میں ایک تو مقتدر قوتیں رکاوٹیں ڈال رہی ہیں جبکہ دوسری طرف امن وامان کی مخدوش صورتحال بھی ان کے نفاذ کی راہ میں بڑی رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ 2002ء کے بعد فاٹا کے عوام پر جو پرتشدد رویے مسلط کئے گئے اور ان کو جس طرح دیوار کے ساتھ لگایا گیا، اس کے باعث فاٹا میں جرگہ سسٹم سمیت دوسرے تمام روایتی سماجی ڈھانچے بُری طرح متاثر ہوئے ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق مختلف ایجنسیوں میں منعقد ہونے والے جرگوں پر اب تک 20 سے زائد بڑے حملے کئے جا چکے ہیں، جن کی وجہ سے علاقے کے معززین کے درمیان فیصلہ سازی یا مشاورت کا صدیوں پرانا نظام تباہ ہوکر رہ گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی رائے اب پاکستان کے عوام یا میڈیا تک نہیں پہنچ رہی کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ قبائلی عوام کی ثقافت بھی سنجیدہ نوعیت کے خطرات کے باعث بری طرح متاثر ہوئی ہے جبکہ فوجی کارروائیوں نے بھی عام لوگوں کو بے شمار مسائل سے دو چار کر رکھا ہے۔ ماہرین کے مطابق فاٹا میں قیامِ امن اور ترقیاتی عمل کا آغاز اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک خطے میں جاری جنگ اور پرتشدد سرگرمیوں کا خاتمہ یقینی نہیں بنایا جاتا۔ ماہرین پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ کے نفاذ کو ناگزیر قرار دے رہے ہیں، جبکہ فاٹا کے لئے الگ اسمبلی یا کونسل کا قیام بھی ضروری ہے۔ فاٹا کے امور کے ماہر نوید شنواری کے مطابق؛ سیاسی اور اقتصادی اصلاحات کے بغیر فاٹا کو نہ تو موجودہ صورتحال سے نکالنا ممکن ہے اور نہ ہی مستقبل میں اسے مزید شورشوں سے بچایا جا سکتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سماجی انصاف کے فقدان' فرسودہ انتظامی ڈھانچے اور معاشی پسماندگی جیسے محرکات نے فاٹا کو بدترین حالات سے دو چار کر دیا ہے۔ ضرورت اس اَمر کی ہے کہ قبائلی عوام کے معاشی اور معاشرتی مسائل کے حل کے لئے فوری طور پر اقدامات کئے جائیں اور اس کے لئے قبائلیوں کو اعتماد میں لیا جائے۔

ممتاز سکالر ڈاکٹر خادم حسین کا کہنا ہے کہ فاٹا میں گزشتہ چند برسوں سے جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ریاست کی ان غلط پالیسیوں کا نتیجہ ہے جو کہ فاٹا کو 'لانچنگ پیڈ' کے طور پر استعمال کرنے کے لیے اپنائی گئی تھیں۔ ہم نے فاٹا پر ایک تو انتہائی فرسودہ انتظامی نظام مسلط کیا جبکہ دوسری طرف ان غیر ریاستی قوتوں کو کھلی چھوٹ دے دی جو کہ اس وقت پورے خطے اور دنیا بھر کے لئے خطرہ بنی ہوئی ہیں۔ ان عناصر کا خاتمہ کئے بغیر اصلاح احوال کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا۔ انہوں نے کہا کہ فاٹا کو خیبر پختونخوا کا حصہ بنانے اور اسے مرکزی سیاست کے دھارے میں لانے کے مطالبے یا تجویز پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ اس کی موجودہ حیثیت کو برقرار رکھنا اب ممکن اور قابل عمل نہیں ہے۔ ضرورت اس اَمر کی ہے کہ روایتی حکمتِ عملی اپنانے کی بجائے فاٹا کے حالات کا ادراک کیا جائے اور اس کے بعد موجودہ حالات کے تناظر میں کوئی ایسا عملی فارمولہ اپنایا جائے جس کے ذریعے قبائلی عوام کو حملہ آور قوتوں کے چنگل سے آزاد کرا کے خوشحالی، ترقی اور امن کے نئے دور میں داخل کیا جا سکے۔ نامور صحافی اور تجزیہ کار سلیم صافی کے مطابق؛ فاٹا میں امن کا قیام اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک ہماری خارجہ پالیسی اور مقتدر قوتوں کی اپروچ میں تبدیلی نہیں لائی جاتی۔ ہم نے اگر افغانستان اور بھارت کے ساتھ اپنے تعلقات بہتر بنالئے اور Strategic Depth کی اپنی پالیسی میں تبدیلی لانے میں کامیاب ہو گئے تو حالات میں بہت زیادہ بہتری واقع ہو گی اور اس کے فاٹا کے حالات اور معاشرت پر بھی انتہائی مثبت اثرات مرتب ہوں گے۔ ان کا کہنا ہے کہ کوئی بھی اس حقیقت کو نہیں جھٹلا سکتا کہ ہم نے ملکی اور غیر ملکی عسکریت پسندوں کو بڑی تعداد میں فاٹا کے اندر ٹھکانے فراہم کئے اور 'گڈ طالبان' کے نام پر ایسی پالیسی اپنائی جس پر عالمی برادری کے شدید تحفظات ہیں۔ ضرورت اس اَمر کی ہے کہ روایتی پالیسیوں پر نظر ثانی کر کے رٹ تسلیم کرنے والے طالبان کے ساتھ مذاکرات کئے جائیں۔

امن تحریک کے رہنما ڈاکٹر سید عالم محسود کا خیال ہے کہ فاٹا ہنوز حملہ آوروں کا محفوظ ترین ٹھکانہ ہے اور حکومت نے ان علاقوں کو غیر ریاستی عناصر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے، ان عناصر میں القاعدہ بھی شامل ہے۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ عالمی برادری فاٹا کی سرگرمیوں سے لاتعلق رہ سکے۔ انہوں نے کہا کہ عسکریت پسندوں نے فاٹا کے عوام کو یرغمال بنایا ہوا ہے اور ان کی آراء، مرضی یا

مطالبات پر کوئی توجہ نہیں دی جا رہی ۔انہوں نے دعویٰ کیا کہ فاٹا میں پنجابی طالبان اور غیر ملکی عسکریت پسندوں کی تعداد پشتون طالبان کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے، تاہم بدنام صرف پشتون ہو رہے ہیں۔

جے یو آئی کے رہنما مولانا عبد الجلیل جان نے کہا کہ فاٹا کے عوام کی خواہش کے خلاف یہاں پاک فوج بھیجنے کا حکومتی اقدام بالکل غلط تھا جبکہ ڈرون حملوں کی شدت نے بھی قبائلی عوام کو مزاحمت کے رویے پر مجبور کیا ہے۔بدقسمتی سے پاکستان کے حکمرانوں نے امریکہ کی خوشنودی کے لئے اپنے ہی عوام پر جنگ مسلط کر دی ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ فاٹا آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں ہے اور ہماری حکومت کو عوام کے بجائے ڈالرز کمانے کی فکر لاحق ہے۔ پی پی پی اور اے این پی جیسی پارٹیوں کا کردار بھی امریکہ اور مقتدر قوتوں سے مختلف نہیں۔

پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز کے ڈائریکٹر اور محقق محمد عامر رانا کے مطابق؛ فاٹا کے بارے میں روایتی پالیسیوں پر نظر ثانی کی اشد ضرورت ہے۔ ہمیں فاٹا میں برسر پیکار مزاحمتی گروپوں کے ساتھ اپنے تعلقات پر بھی پاکستان اور خطے کے وسیع تر تناظر میں از سرِ نو غور کرنا ہوگا۔ اگر فاٹا کو دنیا کا خطرناک ترین علاقہ قرار دیا جا رہا ہے اور ہم پر عالمی دباؤ بڑھتا جا رہا ہے تو اس کے اسباب موجود ہیں اور ہم ایک ذمہ دار ریاست یا قوم کی حیثیت سے اس قسم کے تاثر یا دباؤ سے خود کو الگ یا لاتعلق نہیں رکھ سکتے ۔ عامر رانا کے مطابق؛ روایتی حکمتِ عملی کے ذریعے ہم موجودہ دلدل سے باہر نہیں نکل سکتے۔ ہمیں امن کے قیام اور اپنا امیج بہتر بنانے کے لئے بعض تلخ اور غیر مروجہ فیصلے کرنا ہوں گے اور اب وقت آ گیا ہے کہ قومی سلامتی اور مفادات کے تناظر میں پالیسیاں ترتیب دی جائیں۔

پشتونوں کا امیج اور عالمی رائے عامہ

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ اگر آج عالمی سطح پر قابل ذکر قوموں یا قومیتوں پر ان کی تاریخ، مزاج، نفسیات اور اہمیت کے حوالے سے مختلف حلقوں میں کوئی بحث چل رہی ہے تو ان میں پشتون قوم سرفہرست ہے اور کہیں اگر اس قوم کی تاریخ اور مسائل پر کوئی سنجیدہ بحث نہیں ہو رہی تو وہ پاکستان اور افغانستان ہیں، ان دونوں ممالک میں یہ قوم صدیوں سے نہ صرف یہ کہ آباد ہے بلکہ برصغیر اور وسط ایشیاء پر اس قوم نے صدیوں تک حکمرانی بھی کی ہے۔ پشتون قوم پرستوں کو بھی یہ حقیقت تسلیم کرنا پڑے گی کہ اس قوم کے بارے میں جو کچھ برطانوی، امریکی، روسی اور دوسرے غیر ملکی مؤرخین، انتظامی سربراہان اور سیاح لکھ چکے ہیں، اتنا خود افغانوں یا پشتونوں نے بھی نہیں لکھا، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ انہوں نے کچھ خاص لکھا ہی نہیں تو غلط نہیں ہوگا۔ نائن الیون کے اہم ترین واقعے کے بعد بھی پشتون، افغان یا پاکستانی دانشوروں نے ایسی کوئی تحقیقی کوشش نہیں کی جس سے پشتونوں کی اصل نفسیات اور ایشوز کے بارے میں دنیا تو ایک طرف خود پاکستان اور افغانستان کے عام لوگوں کو بھی تفصیلات اور واقعات معلوم ہو سکیں۔ وہ سیاسی جماعتیں جو پشتون قوم پرستی کے نام پر سیاست کر رہی ہیں، ان کی عدم دلچسپی بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ نائن الیون کے واقعہ کے بعد عالمی اور علاقائی سطح پر پشتونوں کا جو امیج تشکیل پایا، وہ خاصا متاثر ہو چکا ہے اور دنیا کنفیوژن کا شکار ہے۔

ایک تحقیق کے مطابق دنیا میں دو بڑی قومیں ایسی ہیں جن میں کئی قدریں مشترک ہیں، ایک کُرد اور دوسری پشتون، دونوں مارشل یعنی جنگجو قومیں ہیں۔ دونوں کی مجموعی آبادی دس کروڑ کے لگ بھگ بنتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دونوں اس وقت متعدد ممالک میں تقسیم ہیں۔ اگر ان کے آبائی علاقوں کے رقبے کا درست اندازہ لگایا جائے تو پتہ چلے گا کہ ان کا مجموعی رقبہ دنیا کے بارہ چھوٹے ممالک سے زیادہ ہے، جبکہ ان کی قوت، قدرتی وسائل سے مالا مال خطے اور شاندار تاریخ کو بھی نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔ دونوں قوموں نے متعدد بار نہ صرف یہ کہ دوسری قوموں اور ممالک پر چڑھائی کر کے انہیں زیر کیا بلکہ نہیں خود بھی متعدد بار دوسروں کے حملوں کا نشانہ بننا پڑا

اور اسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ آخری ادوار میں لڑی گئی جنگوں کے دوران دونوں قوموں پر مخالفین بوجوہ اس قدر غالب آ گئے اور یہ سلسلہ اس قدر طوالت اختیار کر گیا کہ انہیں متعدد ممالک اور انتظامی یونٹوں میں تقسیم ہونا پڑا۔ کرد اس وقت عراق، ترکی، ایران، شام اور فلسطین میں تقسیم ہیں جبکہ پشتون افغانستان، پاکستان، بھارت اور کسی حد تک ایران میں منقسم ہیں۔ اگر ہم پشتونوں کے ماضی پر نظر ڈالیں تو ثابت ہوتا ہے کہ اس قوم کو یونانی، چنگیزی، مغل، عرب، برطانوی، سکھ، روسی اور اب امریکی مداخلت یا حملوں کا سامنا کرنا پڑا ہے اور یہ قوم کسی بڑے وقفے یا امن کے دورانیے کے بغیر مسلسل جنگوں کا سامنا کرتی رہی ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ یہ قوم اپنی پانچ ہزار سال کی تاریخ میں کسی ایک صدی میں بھی امن اور استحکام دیکھ سکی ہو۔ اسی طرح پشتونوں کو بھی جب کبھی موقع ملا اور انہوں نے طاقت حاصل کی، دوسری قوموں اور ممالک پر یلغار کرنے سے گریز نہیں کیا۔ اس ضمن میں ہم ہندوستان کی مثال دے سکتے ہیں جہاں پر افغانوں نے ایک محتاط اندازے کے مطابق مختلف ادوار میں پچاس سے زائد حملے کئے اور مجموعی طور پر مختلف ادوار میں 180 سال تک حکمرانی بھی کی۔ ان کے کامیاب ترین حکمرانوں میں شیر شاہ سوری (فرید خان) احمد شاہ ابدالی، شہاب الدین غوری، علاؤالدین خلجی اور متعدد دوسروں کی مثالیں دی جاسکتی ہیں، جنہوں نے خطے کی تاریخ کا رخ بدل ڈالا۔ شیر شاہ سوری کو تو اب بھارتی اور عالمی مؤرخین ہندوستان کے کامیاب ترین اور ذہین حکمرانوں میں شمار کرتے ہیں۔ اس مختصر سی عسکری تاریخ کے علاوہ پشتونوں نے دنیا اور خطے خصوصاً برصغیر اور وسط ایشیاء کی تاریخ پر انمٹ نقوش چھوڑے۔ باعثِ حیرت اَمر تو یہ ہے کہ ان کے کارنامے محض کسی ایک یا دو شعبوں تک محدود نہیں رہے۔ ہندوستان میں جب اسلام کا پیغام پھیلانے کا مرحلہ پیش آیا تو پشتون حکمرانوں، قبائلی مشران اور صوفیاء نے اس ضمن میں انتہائی اہم بلکہ کلیدی کردار ادا کیا۔ افغانستان نے دنیا خصوصاً اس خطے کی تبدیلیوں میں مختلف ادوار میں جو کردار ادا کیا اور تاریخ کو جن نئے ابواب سے روشناس کیا، ان سے تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں اور عالمی تاریخ ان ابواب کے بغیر نامکمل قرار دی جاسکتی ہے۔ پشتونوں کی اجتماعی زندگی ان کی روایات کے علاوہ جن ستونوں پر قائم رہی، ان میں اسلام، افغانیت، وطن پرستی اور قوم پرستی سرفہرست ہیں۔ پشتونوں کی دستیاب تاریخ میں جن اہم شخصیات نے میدان شہسواری، میدان

سیاست اور علم کے میدان میں نمایاں ترین مقام پایا، ان میں مذہب اور قوم پرستی پر مشتمل دو خصوصیات نمایاں رہی ہیں۔ پشتون دنیا کی واحد قوم ہے جس نے اجتماعی طور پر اسلام قبول کیا اور یہی وجہ ہے کہ دوسری اقوام کے مقابلے میں ان میں دوسرے مذاہب کے لوگ نہ ہونے کے برابر ہیں، تاہم یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ پشتونوں نے اقلیتوں کو اپنے معاشرے میں جو مقام دیا اور ان کو جس طریقے سے اپنی زندگی اور روایات کا حصہ بنایا، اس کی دوسری کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس سلسلے میں دوسرے واقعات پر بحث کئے بغیر تقسیم ہند یا آزادی ہند کی مثال کافی ہے جس کے دوران دونوں اطراف میں موجود سینکڑوں شہروں میں پشاور وہ واحد شہر تھا جس میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان کوئی تصادم نہیں ہوا بلکہ پشاور کے باسیوں خصوصاً خدائی خدمتگاروں اور جمعیت علمائے ہند کے کارکنوں نے ایسی بعض کوششوں کے دوران ہندوؤں کی حفاظت کے لئے پہرے دینے سے بھی گریز نہیں کیا۔

پاکستان میں جن اہم ترین شخصیات نے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے اور مختلف شعبوں میں بہت نیک نامی کمائی، ان میں بھی پشتون اپنی تعداد کے اعتبار سے سرفہرست ہیں۔ افسوسناک امر یہ ہے کہ گزشتہ تیس برسوں کے دوران اس قوم کے حصے میں کوئی بڑی نیک نامی یا کامیابی نہیں آئی۔ افغانستان میں روس اور سامراجی بلاک کے درمیان جو جنگ لڑی گئی، اس نے دونوں اطراف کے پشتونوں کی سیاست، معاشرت، معیشت، روایات اور ثقافت پر تباہ کن اثرات مرتب کئے۔ اس جنگ اور اس کے بعد افغانستان میں ہونے والی خانہ جنگی نے پشتونوں کے عالمی امیج کو بری طرح متاثر کیا حالانکہ جو لوگ اس جنگ میں شریک ہوئے تھے، وہ خود کو پشتون سے زیادہ مسلمان کہلانا پسند کرتے تھے۔ اس جنگ نے پشتونوں کی معاشرتی اور ثقافتی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں اور ان کا وہ نظام تباہی سے دوچار ہو گیا، جس پر صدیوں سے ان کی اجتماعی زندگی کا دارومدار تھا۔ رہی سہی کسر طالبان کی سرگرمیوں نے پوری کر دی جو کہ امریکہ اور پاکستان کی ایک مشترکہ مہم جوئی کے نتیجے میں 90ء کی دہائی میں کوئٹہ اور قندھار سے ہوتے ہوئے چند ہی مہینوں کے اندر پورے افغانستان اور اگلے پڑاؤ کے طور پر پاکستان کے قبائلی علاقوں میں مضبوط ہوئے۔ طالبان کے پرتشدد رویوں اور کارروائیوں نے ڈیورنڈ لائن کے اطراف کے پشتونوں کی زندگیوں کو نہ صرف یہ

کہ خطرے میں ڈال دیا بلکہ ان کے بنیادی اصولوں اور معاشرتی ڈھانچے کو بھی ہلا کر رکھ دیا۔ پشتونوں کی مجموعی آبادی میں طالبان کا تناسب نہ ہونے کے برابر تھا اور ان کو پشتون معاشرے کا اصولی یا متعین کردہ مینڈیٹ بھی حاصل نہیں تھا۔ اس کے باوجود ایک منظم مہم کے تحت سیاسی اور صحافتی حلقوں کے پروپیگنڈے کے ذریعے طالبان کو بطور پشتون دنیا کے سامنے پیش کیا گیا، اس کے نتیجے میں پشتون ایک سفاک، جاہل اور تشدد پسند گروہ کی صورت میں سامنے آئے۔ پشتون معاشرے کے ایک اقلیتی گروہ کو چار کروڑ سے زائد پشتونوں کے نمائندے کے طور پر پیش کیا گیا اور اس شعوری کوشش کا نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا بھر میں پشتونوں سے نفرت کی جانے لگی اور ان کو مہذب دنیا اور معاشرے کا دشمن تصور کر لیا گیا۔ اس عرصہ کے دوران پشتونوں کا سیاسی اور دانشور طبقہ ان حالات سے عملاً لاتعلق رہا اور انہوں نے ایسی کوئی کامیاب کوشش نہیں کی جس کے نتیجے میں عالمی اور علاقائی سطح پر اس قوم کا امیج بہتر ہوتا۔ یکطرفہ پروپیگنڈے اور طالبان کے بعض نامور غیر پشتون حمایتیوں نے اس پشتون کی شناخت ہی گم کر دی، جو کہ مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں سرانجام دینے میں مگن تھا۔

پشتونوں کے معاشرے میں مسجد اور حجرے کے اشتراک (Combination) کا مرکزی کردار رہا ہے۔ بدقسمتی سے سیاسی مفادات اور دوریوں کے باعث روایتی پشتون لیڈروں نے ان دو اہم سماجی اداروں کے درمیان پیدا ہونے والے فاصلوں کے خاتمے کے لئے کوئی کوشش نہیں کی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پشتون دو واضح مگر متصادم فکری گروہوں میں تقسیم ہو کر رہ گئے۔ حجرے والے مسجد سے بے خبر رہے جبکہ مسجد والے حجرے والے کو شک اور مخالفت کی نظر سے دیکھنے لگے۔ طالبان صرف افغانستان تک محدود نہیں رہے، بلکہ دوسرے مرحلے میں وہ فاٹا اور تیسرے مرحلے کے دوران صوبہ پختونخوا تک پھیل گئے۔ اس خطرناک سلسلے کی روک تھام کے لئے محققین اور دانشوروں نے کوئی عملی کوشش نہیں کی اور یہی وجہ ہے کہ افغانستان کے بعد پاکستان کے پشتونوں کو بھی انتہا پسند اور امن کا دشمن قرار دیا جانے لگا۔ وقت کا پہیہ گھومتا رہا اور جب نائن الیون کا واقعہ رونما ہو گیا تو عربوں کے بعد جس قوم کو عالمی میڈیا اور پروپیگنڈے کا سامنا کرنا پڑا، وہ پشتون قوم ہی تھی۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ امریکہ نے نائن الیون کے واقعہ میں ملوث جن

افراد کی فہرست جاری کی، ان میں کوئی بھی پشتون یا افغان نہیں تھا بلکہ وہ سب عرب تھے۔ اس کے باوجود چالیس ممالک افغانستان پر یہ کہہ کر حملہ آور ہو گئے کہ طالبان نے القاعدہ کو اپنی سرزمین پر پناہ دے رکھی ہے۔ ایک وقت وہ بھی آیا جب اُس وقت کے صدر جنرل مشرف بھی افغانستان کے پشتونوں کے طرفدار اور وکیل بن گئے، حالانکہ ان کے اپنے ملک کے پشتون ان کے دور میں بدترین صورتحال سے دوچار تھے اور مشرف کے اقتدار کے مخالف تھے۔

ڈیورنڈ لائن کے مستقل مسئلے نے پاکستان اور افغانستان کو کبھی ایک دوسرے کے قریب نہیں آنے دیا، جس کے باعث پاکستان کے تین انتظامی یونٹوں یعنی صوبہ پختونخوا' فاٹا اور بلوچستان (جنوبی پختونخوا) میں تقسیم پشتونوں کو بھی شک کی نظر سے دیکھا جاتا رہا۔ دوسری طرف افغانستان کے پشتون اکثریت میں ہوتے ہوئے ان نسلی گروپوں کے رحم و کرم پر رہے، جو پشتونوں سے زیادہ متحد' تعلیم یافتہ اور بااثر تھے۔ زیادہ تر حکمران پشتون ہی رہے، تاہم ان کی حکومتوں میں پشتونوں کی نمائندگی ہمیشہ کم ہی رہی۔ اس تمام کھیل میں جہاں ایک طرف افغانستان' فاٹا' پختونخوا' بلوچستان اور کراچی کے کروڑوں پشتونوں کو القاعدہ اور طالبان کا حامی سمجھ کر ان کے ساتھ ڈیل کرنے کی پالیسی اپنائی گئی، وہاں ایک مستقل المیہ یہ بھی رہا کہ افغانستان کے پشتون پاکستان جبکہ پاکستان کے پشتون افغان پشتون کو شک کی نظر سے دیکھتے رہے۔ اسی طرح بندوبستی علاقوں اور قبائلی علاقوں کے پشتونوں کے درمیان بھی بنیادی مسائل پر کوئی انڈر سٹینڈنگ سامنے نہیں آئی۔ اس تمام صورتحال کا نتیجہ یہ نکلا کہ پشتونوں کا امیج بہتر ہونے کی بجائے مزید خراب ہوتا رہا۔ اس اُمر پر کسی نے کوئی توجہ نہیں دی کہ اگر پشتون واقعتاً تشدد پسند اور جمہوریت مخالف ہوتے تو وہ 2008ء کے عام انتخابات میں اپنے اکثریتی علاقے یعنی صوبہ پختونخوا میں اے این پی اور پی پی پی جیسی سیکولر جماعتوں کو کیونکر ووٹ دیتے اور قندھار' ہرات اور ہلمند جیسے افغان صوبوں میں گزشتہ دو انتخابات کے دوران طالبان کی دھمکیوں کے باوجود مردوں کے علاوہ خواتین بھی ووٹ ڈالنے کے لیے نہ نکلتیں۔

سچی بات تو یہ ہے کہ پشتونوں کا امیج خراب کرنے اور ان کے مسائل میں اضافہ کرنے میں جہاں ایک طرف انتہا پسند قوتوں کا بڑا ہاتھ ہے، وہاں پشتون قیادت اور دانشوروں کا کردار بھی

قابل تعریف نہیں رہا۔ بدقسمتی سے اب بھی ایسی کوئی شعوری اور سیاسی کوشش دیکھنے کو نہیں مل رہی، جس سے اس قوم کا امیج بہتر ہو سکے۔ اس قوم کا ایک بڑا المیہ یہ بھی رہا کہ دو سے زائد ممالک میں رہنے والے ان لوگوں کے درمیان سیاسی، ثقافتی اور علمی سطح پر وہ رابطے قائم نہ ہو سکے جو کہ ایسی دوسری منقسم قوموں کے درمیان ایسے حالات میں قائم رہے ہیں، اس ضمن میں ہم جرمنوں، ہسپانویوں، ایرانیوں، کردوں، پنجابیوں (بھارت، پاکستان) اور بنگالیوں کے درمیان باہمی رابطوں کی مثال دے سکتے ہیں۔ پختونوں کی سیاسی لیڈر شپ نے یہ کوشش کبھی نہیں کی کہ چند افراد کی بجائے عوام کے درمیان قربت اور روابط قائم ہوں۔ اس ضمن میں ہم ولی باغ کی مثال دے سکتے ہیں، جس کے تمام لیڈروں کے مختلف افغان حکمرانوں کے ساتھ قریبی روابط رہے، تاہم یہ سلسلہ محض اس خاندان کے ذاتی مراسم تک ہی محدود رہا۔ دوسری طرف پاکستانی پشتونوں کی اکثریت امن میں رہنے کے باوجود ان حالات میں بھی اپنے پشتون بھائیوں کی مدد نہیں کر سکی جب وہ پے در پے جنگوں کے باعث شدید مشکلات میں تھے۔ مثال کے طور پر بعض دوسرے افغان حکمرانوں کی طرح ڈاکٹر نجیب اللہ کے دور میں بھی پاکستان کے پشتون قوم پرستوں کو کابل اور جلال آباد میں ریاستی میزبانی اور پروٹوکول فراہم کیا جاتا رہا، تاہم نجیب حکومت کے خاتمے کے بعد جب ان افغان حکمرانوں پر انتہائی برا وقت آیا اور وہ جان بچانے کے لئے کوئٹہ، پشاور اور فاٹا میں آ گئے تو ان کے ساتھ بے رخی اور لاتعلقی پر مبنی رویہ اپنایا گیا۔ پاکستان خصوصاً فاٹا سے تعلق رکھنے والے پشتون رہنما افغانستان میں وزارتوں اور اہم عہدوں پر فائز رہے جبکہ یہ سلسلہ طالبان کے دور میں بھی چلتا رہا، تاہم پاکستانی پشتون قیادت کا ردعمل مثبت نہیں رہا۔ 2004ء کے بعد پاکستان کے پشتون لیڈروں کو ایک بار پھر کابل میں سیاسی پروٹوکول ملنا شروع ہو گیا جبکہ ہم خیال لوگوں کی بڑی تعداد بھی سرکاری اور نیم سرکاری دوروں سے مستفید ہوتی رہی تاہم دونوں ممالک میں رہنے والے پشتون عوام کے روابط میں فروغ کے لیے انہوں نے کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ یہی وہ بنیادی عوامل ہیں جن کے باعث چار کروڑ سے زائد پشتون عوام کو آج بھی اپنی شناخت، حقوق اور سب سے بڑھ کر امیج سے متعلق مسائل کا سامنا ہے۔

امن لشکر اور عوام کی تشویش

پاکستانی ریاست کی دہشت گردی اور شورش کے خلاف جنگ فریقین کے ایک دوسرے پر تابڑتوڑ حملوں کی صورت میں کسی وقفے کے بغیر ہنوز جاری ہے۔ایک محتاط اندازے کے مطابق اس جنگ میں 23 ہزار بے گناہ شہری اور 10 ہزار سکیورٹی اہلکاروں سمیت فریقین کے 40 سے 55 ہزار تک لوگ مارے جاچکے ہیں۔ یہ بہت عجیب بات ہے کہ جس سال یعنی 2010ء کو ہم نے فوجی کارروائیوں کا کامیاب ترین سال قرار دیا، اس برس بھی مجموعی طور پر پاکستان میں جتنی ہلاکتیں ہوئیں، ان کی تعداد عراق اور افغانستان میں ہونے والی ہلاکتوں کی مجموعی تعداد سے زیادہ ہے۔ پاک انسٹی ٹیوٹ آف پیس سٹڈیز کی سالانہ رپورٹ کو کسی بھی طور چیلنج اور نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، جس کے مطابق پاکستان میں دس ہزار سے زائد ہلاکتیں ہوئی ہیں۔جبکہ 2010ء کے دوران عراق میں تین ہزار اور افغانستان میں سات ہزار افراد دہشت گردی کی کارروائیوں کا نشانہ بنے۔اس رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ 2009ء کے مقابلے میں 2010ء کے دوران پنجاب اور بلوچستان میں خودکش حملوں کی تعداد بڑھ گئی جبکہ خیبر پختونخوا میں صرف سات فیصد کمی واقع ہوئی۔ان حالات سے یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ پاکستان میں اس جنگ کی شدت اور ہلاکتوں کی تعداد عراق اور افغانستان سے زائد ہے۔

رپورٹ میں یہ بھی نشاندہی کی گئی ہے کہ پاکستان مذکورہ دونوں ممالک کے مقابلے میں مزاحمت کے متعدد اسباب اور پہلوؤں کے تناظر میں زیادہ سنگین خطرے سے دوچار ہے۔اس ضمن میں دہشت گردی کے علاوہ بدترین فرقہ واریت، صوبائیت، قوم پرستی اور ریاست مخالف اسباب کی متعدد مثالیں مختلف واقعات اور اعداد وشمار کی روشنی میں دی گئی ہیں۔ان اسباب کا بھی بغور جائزہ لیا گیا ہے جن کے باعث تشدد، دہشت گردی، فرقہ واریت اور علیحدگی پسندی کے واقعات اور رجحانات میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ناقابلِ تردید اعداد وشمار اور واقعات پر مبنی مذکورہ رپورٹ ان حلقوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہے، جن کا کہنا ہے کہ حالات بہت بہتر ہو گئے ہیں اور ریاستی رٹ کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ان حلقوں کو بھی غلط ثابت کیا گیا ہے جن کا خیال

ہے کہ افغانستان کے مقابلے میں پاکستان کی صورتحال بہت مثالی ہے۔اس مختصر سے جائزہ کے بعد اگر ملک کے موجودہ حالات، خصوصاً سکیورٹی کی صورتحال کا غیر جانبدارانہ تجزیہ کیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ پاکستان کے فیصلہ ساز اداروں' میڈیا اور دوسرے متعلقہ حلقوں کی خوش فہمیاں تباہی کو دعوت دینے کے مترادف ہیں۔ مارچ 2011ء امن وامان کی صورتحال کے حوالے سے بدترین ثابت ہوا۔وہ حلقے جو یہ ڈھنڈورا پیٹ رہے تھے کہ 2011ء پاکستان میں امن وامان کے حوالے سے بہتر ثابت ہوگا، ان کے خواب مارچ کے مہینے میں ریزہ ریزہ ہوگئے۔ بعض حلقوں نے ڈرون حملوں کی تعداد میں کمی کو ریمنڈ ڈیوس کی گرفتاری کا نتیجہ قرار دے کر اور بھی زیادہ لاعلمی کا مظاہرہ کیا، کیونکہ سابقہ برسوں کے دوران بھی جنوری اور فروری کے مہینوں میں دہشت گردی کے واقعات اور ڈرون حملوں کی تعداد اور شدت میں کمی واقع ہوتی رہی ہے۔اس کے ٹھوس اسباب موجود ہیں تاہم حالات اور اسباب سے بے خبر لوگوں نے وقتی خاموشی کو بڑی کامیابی یا تبدیلی کا نتیجہ قرار دے کر اپنے علاوہ عوام کو بھی خوش فہمی سے دوچار کردیا۔ڈرون حملوں کی تعداد ایک بار پھر بڑھ گئی۔ مارچ میں ڈرون حملوں کی تعداد خاصی بڑھ گئی، جبکہ اس وقت بھی ریمنڈ ڈیوس جیل میں تھا اور بعض حلقوں کے مطابق پاکستان امریکہ پر دباؤ بڑھانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ریمنڈ ڈیوس نے جس روز رہا ہو کر جانا تھا، اس روز وزیرستان کے علاقے دتہ خیل میں ایک جرگہ پر ڈرون حملے سے پچاس سے زائد افراد لمحوں میں ہی لقمہ اجل بن گئے، جبکہ دوسرے دن بھی فضا میں ڈرون گشت کرتے رہے۔ یہ واقعہ اس قدر افسوس ناک تھا کہ آرمی چیف کو پہلی بار ڈرون حملوں کے خلاف سخت بیان جاری کرنا پڑا، جس میں انہوں نے واضح کیا کہ پاکستان کو ان حملوں پر شدید اعتراض ہے اور امریکہ کو ایسا نہیں کرنے دیا جائے گا۔اسی روز پاکستان میں امریکی سفیر کو وزارت خارجہ میں طلب کرکے احتجاج ریکارڈ کروایا گیا۔اس تلخ حقیقت سے قطع نظر کہ جس وقت آرمی چیف کا بیان اور امریکی سفیر کی طلبی کی خبر نشر ہو رہی تھی، اس وقت بھی متعدد ڈرون وزیرستان کی فضاؤں میں محو پرواز تھے۔ایسا پہلی بار ہوا کہ گورنر پختونخوا' اے این پی' آرمی چیف اور ایم کیو ایم نے کھل کر ڈرون حملوں کی مذمت کی اور اس عمل کو پاکستان کے لئے ناقابل قبول قرار دیا، اس کے باوجود امریکی حکام کی طرف سے کسی قسم کی ٹھوس وضاحت سامنے نہیں آئی۔

پشاور کے نواحی علاقے میں نماز جنازہ کے دوران کئے گئے خودکش حملے کے دوران جتنی اموات ہوئیں اور اس کے بعد امن لشکروں اور کمیٹیوں کا جو ردِعمل سامنے آیا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو عناصر عسکریت پسندوں کی مخالفت کر رہے ہیں، ان کے درمیان رابطے کا فقدان ہے۔ اس واقعہ نے امن لشکروں اور اس سے مماثل اداروں کے مستقبل پر سوالیہ نشان لگا دیا، جبکہ کمیونٹی پولیسنگ کی کارکردگی پر بھی سوالیہ نشان لگ گیا۔ یہ سوال بڑی شدت کے ساتھ اٹھایا گیا کہ حملہ آوروں کے مقابلے میں ریاست اور اس کے حامیوں میں اس اتحاد' رابطے اور تعاون کا مظاہرہ دیکھنے کو کیوں نہیں مل رہا، جس کی اشد ضرورت ہے۔ تاہم ریاست اور اس کے حامیوں نے اس سوال کا جواب دینے کی بجائے ایک دوسرے پر الزامات عائد کرنے کا سلسلہ شروع کر کے عسکریت پسندوں کے مورال میں اور بھی اضافہ کر دیا، جبکہ امن پسند عوام کی تشویش میں اچانک اضافہ ہو گیا۔ یہاں یہ اَمر قابل ذکر ہے کہ مارچ میں ہونے والا یہ خودکش حملہ کسی جنازے پر پہلا حملہ نہیں تھا۔ اس سے قبل بنوں' سوات' پشاور' خیبر ایجنسی' کوہاٹ' ہنگو اور وزیرستان میں بھی شدت پسندوں نے مخالفین کے جنازوں پر اس طرح کے حملے کئے تھے، اس کے باوجود حفاظتی اقدامات نہ کرنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اس واقعہ سے چند روز قبل نوشہرہ کے ایک گاؤں کی مسجد میں بم رکھا گیا تھا، جس میں بیسیوں نمازی شہید ہو گئے تھے۔ ان دنوں ہی مردان کے علاقے لوند خوڑ میں دہشت گردوں نے پولیس کی موجودگی میں طالبات کے ایک کالج پر دن دیہاڑے حملہ کر کے تین معصوم طالبات کو شہید جبکہ 12 سے زائد کو زخمی کر دیا، جبکہ اس سے قبل مردان میں بیسیوں زیر تربیت کیڈٹ نشانہ بنائے گئے تھے۔ مردان' پشاور اور نوشہرہ کے حملوں سے یہ امر ایک بار پھر درست ثابت ہو گیا کہ حملہ آور فورسز' مسلکی مخالفین' تعلیمی اداروں اور جرگوں یا لشکروں کی شکل میں قائم گروہوں کے ساتھ کسی قسم کی رعایت برتنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ باعثِ حیرت اَمر یہ ہے کہ ان خطرناک حملوں اور واقعات پر ملک گیر سطح پر وہ ردعمل سامنے نہیں آیا، جس کی ضرورت تھی۔

اس سے قبل جنازوں کے علاوہ جرگوں' اجتماعات' مزارات اور لشکروں کو مختلف علاقوں میں 22 بار نشانہ بنایا گیا، ان حملوں کے نتیجے میں 100 سے زائد افراد شہید اور سینکڑوں زخمی ہوئے۔ اس کے باوجود حکومتی ادارے عوام سے بار بار یہ مطالبہ کرتے رہے کہ مقامی سطح پر حملہ آوروں کی

مزاحمت کے لئے لشکر قائم کئے جائیں۔ متعدد بار تو ایسا ہوا کہ جو عمائدین حملوں کے باعث ایسا کرنے سے معذرت کرتے رہے، ان پر شدید دباؤ ڈالنے سے بھی گریز نہیں کیا گیا۔ ایک جدید ملک اور دس لاکھ سے زائد فوجی اور نیم فوجی اہلکاروں کی موجودگی میں حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے لئے لشکروں اور امن کمیٹیوں کے قیام کی ایسی کوششوں اور پالیسیوں کا بظاہر کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ اس کے باوجود حکومت اور فورسز ایسا کرنے میں دلچسپی لیتی رہی ہیں اور اس کے نتائج درجنوں حملوں اور سینکڑوں ہلاکتوں کی صورت میں نکلتے رہے ہیں۔ یہاں یہ اَمر قابلِ ذکر ہے کہ حکومت پاکستان ایسے لشکروں کے قیام کے لئے اربوں ڈالرز لے چکی ہے اور یہ رقوم پولیٹیکل اور ضلعی انتظامیہ کے ذریعے ایسے لشکروں کو دی جاتی تھیں یا دی جارہی ہیں، تاہم افسوسناک امر یہ ہے کہ اس فنڈ میں بڑے پیمانے پر گھپلوں کی شکایات سننے کو ملتی رہی ہیں اور حالات یہاں تک پہنچ گئے ہیں کہ قومی اسمبلی کی ایک متعلقہ سٹینڈنگ کمیٹی نے فاٹا سیکرٹریٹ کو امریکی شکایات کے بعد باقاعدہ نوٹس بھی جاری کر دیئے۔ جرگوں اور لشکروں کو اس لئے بھی نشانہ بنایا جاتا رہا کہ عسکریت پسند ان اداروں کو امریکی ایجنڈے کا حصہ سمجھ رہے ہیں اور سرکردہ لوگوں یا سربراہوں کو امریکی ایجنٹ تصور کیا جاتا ہے۔

معاشرے میں ایسے حلقوں کی کوئی کمی نہیں ہے، جن کا کہنا ہے کہ ایسے لشکروں پر انحصار کرکے ریاست عوام کو سکیورٹی فراہم کرنے کی اپنی بنیادی ذمہ داری سے غفلت برت رہی ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ لشکروں کے ذمہ داروں اور اراکین کے علاوہ عام لوگ بھی بڑی تعداد میں لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔ پے در پے ہونے والے واقعات کے باوجود، اس پالیسی پر نظرِ ثانی نہ کرنے کی روش کا یہ تاثر لیا جارہا ہے کہ ریاست اس پالیسی کو نازک ترین حالات اور خطرناک علاقوں میں اب بھی ڈالرز کمانے کا ذریعہ سمجھ رہی ہے۔ جن حملہ آوروں کو انٹیلی جنس ادارے، فوج اور پولیس نہیں روک پاتی اور ان کا ہر حملہ عین ہدف پر جا کر لگتا ہے، ان سے نمٹنے کے لئے لشکروں کی تشکیل اور استعمال کا فارمولہ نہ تو درست نظر آرہا ہے اور نہ ہی اس کے نتائج کو حوصلہ افزا کہا جا سکتا ہے۔ وہ ادارے جو اسلام آباد جیسے شہر میں ایک وفاقی وزیر کو اس کے باوجود تحفظ فراہم نہیں کر سکے کہ موصوف حملہ آوروں کی ہٹ لسٹ پر تھے، ان کے بارے میں اگر عوام کے ذہنوں میں سوال

جنم لیتے ہیں تو انہیں غیر ضروری قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ایسی پالیسیوں کے ذریعے معاشرے کے مختلف طبقوں اور خاندانوں کو آپس میں لڑانے کی روایت اور خطرناک سلسلے کو جنم دیا جارہا ہے اور اس کے اثرات مختلف علاقوں میں ظاہر ہونا شروع بھی ہو گئے ہیں۔ متعدد ایسے واقعات ہوئے ہیں جن میں افراد، خاندان اور قبیلوں کے درمیان خونریز جھڑپیں ہوئیں اور فریقین کو قابو کرنا اور امن کا قیام حکومت کے لئے ممکن ہی نہیں رہا۔ اگر یہ سلسلہ اسی طرح ذاتی یا خاندانی دشمنیوں کی صورت اختیار کرتا گیا اور فریقین ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہوتے رہے تو اس کے سنگین نتائج برآمد ہوں گے اور ریاست کو عملاً لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

1۔ ملک کے ممتاز تجزیہ نگار سلیم صافی کے مطابق؛ قومی لشکروں کی حمایت اس لئے نہیں کی جا سکتی کہ حملہ آوروں سے نمٹنا یا عوام کو تحفظ فراہم کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے۔ ''پشتون بیلٹ میں کروڑوں کی تعداد میں ہتھیار موجود ہیں اور ہر پشتون ان کا استعمال بھی جانتا ہے۔ یہاں خاندانی اور قبائلی جھگڑوں کی روایت بھی موجود ہے۔ اگر یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا تو لشکر وغیرہ نہ صرف یہ کہ حکومت کے قابو سے باہر ہو کر ریاست کے لئے ایک بڑا مسئلہ بن جائیں گے بلکہ فریقین (عسکریت پسندوں، لشکر) کے درمیان بھی دشمنی اور تصادم کا خطرناک سلسلہ چل پڑے گا اور اگر ایسا ہوا تو ریاست کو ان سے نمٹنے کے لئے مستقبل میں خود لشکر کشی کرنا پڑے گی۔ یہ پالیسی بہت خطرناک ہے اور اس کا خاتمہ ہونا چاہئے، اگر ایسا نہیں کیا جاتا اور پورے معاشرے کو دفاع کے نام پر تشدد کی راہ پر ڈالا جاتا ہے تو ایسے لوگ شدت پسندوں سے بھی خطرناک ثابت ہوں گے۔

2۔ امن لشکر کے موجودہ سربراہ دلاور خان نے بتایا کہ ان کے علاقے کے عوام نے اس لئے ہتھیار اٹھائے ہیں، کیونکہ حملہ آوروں نے ان کا جینا دوبھر کر دیا تھا اور ہم ان کے ہاتھوں یرغمال اور برباد نہیں ہونا چاہتے تھے۔ اب تک ہماری شہادتوں کی تعداد 200 سے زائد ہو چکی ہے اور ہم پر پندرہ سے زائد حملے کئے جا چکے ہیں۔ افسوس صرف اس بات کا ہے کہ حکومت ذمہ داری اور دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کر رہی جس کی ہمیں اس وقت اشد ضرورت ہے۔ محض چند بندوقیں اور چند افراد کی بھرتی ہمارے مسئلے کا حل نہیں ہے۔ اگر ہم نے حملہ

آوروں سے نمٹنا ہے تو اس کے لئے روزانہ کی بنیاد پر رابطوں اور مشاورت کی ضرورت ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ان لوگوں سے نمٹنا صرف حکومت کے بس کی بات نہیں ہے اور عوام کو بھی آگے آنا ہوگا، تاہم اس کے لئے لازمی ہے کہ حکومت بھی اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرے۔ حالت یہ ہے کہ ہم اس امدادی رقم کے لئے بھی در بدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں جو کہ حکومت نے شہداء پیکج کے تحت ہمیں دینا ہوتی ہے، ایسا کب تک چلے گا۔

3۔ مہمند ایجنسی سے تعلق رکھنے والے ایک لشکر کے سربراہ نے نام نہ بتانے کی شرط پر بتایا کہ وہ عسکریت پسندوں کے خوف اور حکومت کے عدم تعاون کی وجہ سے جان بچانے کی خاطر پشاور بھاگ آئے ہیں، صرف مہمند ایجنسی کے پچاس سے زائد ایسے عمائدین کو مارا جا چکا ہے جو کہ مزاحمت کا ارادہ رکھتے تھے اور حکومت کے حامی تھے۔

4۔ امن تحریک کے کنوینئر ادریس کمال کا کہنا تھا کہ ریاست اپنی ذمہ داریاں پوری نہیں کر رہی۔ ہمارے اندازے کے مطابق اب تک ساٹھ ہزار افراد اس جنگ کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں اور ہم اب بھی اس بحث میں لگے ہوئے ہیں کہ یہ ہماری جنگ ہے یا کسی اور کی؟ ہماری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ دس لاکھ مسلح اور تربیت یافتہ فورسز چند ہزار دہشت گردوں کا خاتمہ کیوں نہیں کر سکتیں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ریاست اب بھی ابہام کا شکار ہے، اگر ایسا ہی ہے تو یہ انتہائی خطرناک بات ہے۔ اس طرح تو لوگ مرتے رہیں گے اور ہم اپنی اپنی باری کا انتظار کرتے رہیں گے۔ ایک سوال کے جواب میں ادریس کمال نے کہا کہ لوگ سوات جیسے علاقوں میں فورسز کے قیام کی طوالت سے تنگ آ گئے ہیں۔ اگر حکومت موجود ہے تو وہ سول اداروں کی فعالیت کو یقینی کیوں نہیں بناتی۔ اگر فوج نہیں نکل رہی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حالات خراب ہیں اور سول ادارے اہلیت سے محروم ہیں۔ مجھے تو یہ خوف ہے کہ اگر ریاست نے ان عناصر کا خاتمہ فوری طور پر یقینی نہیں بنایا تو عوام کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جائے گا اور پختون بیلٹ میں افغانستان کی طرح خانہ جنگی شروع ہو جائے گی، کیونکہ یہ خطہ دس سال سے حالت جنگ میں ہے اور کسی کو حالات کی سنگینی کا احساس بھی نہیں ہے، ایسا لگ رہا ہے کہ پختون بیلٹ کو پاکستان پر بوجھ سمجھا جا رہا ہے۔

علم سے محرومی، موجودہ مسائل کی بنیادی وجہ

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ کوئی بھی قوم' معاشرہ یا ریاست تعلیم کے بغیر باعزت' پرامن اور خوشحال زندگی کا تصور بھی نہیں کرسکتی ہے۔ اسلام نے تعلیم کے حصول کو انتہائی ضروری اور ناگزیر قرار دیا ہے، کیونکہ اسلام دین فطرت ہے اور فطرت کی پہچان حصول علم کے بغیر ناممکن ہے۔ کوئی بھی مسلمان علم یعنی تعلیم کی اہمیت سے انکار نہیں کرسکتا اور شاید یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں نے اپنے عروج کے دور میں تعلیم کے حصول پر بہت زیادہ توجہ دی اور بے شمار علمی درسگاہیں تعمیر کیں۔ لاکھوں کتب شائع کیں اور اساتذہ کو غیر معمولی عزت و مرتبہ دیا گیا، یوں مسلمانوں نے سائنس' طبیعات' ادب' فلکیات' فلسفہ اور دوسرے علوم دنیا کے کونے کونے میں پہنچا دیئے اور ایک مہذب اور ترقی یافتہ معاشرے کی بنیاد رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ بدقسمتی سے مسلمان حصول علم سے اپنی یہ محبت اور وابستگی بعد کے ادوار میں قائم نہ رکھ سکے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم زوال کی بدترین صورتحال سے دوچار ہوگئے۔ متحدہ ہندوستان کے عروج میں بھی مسلمانوں کے علمی استعداد اور ان کی علمی درسگاہوں نے بنیادی کردار ادا کیا۔ اس ضمن میں ہم جامعہ دیوبند اور علی گڑھ یونیورسٹی کی مثال دے سکتے ہیں، ان اداروں نے برصغیر کی سیاست اور معاشرت میں بہت نمایاں خدمات سرانجام دیں، تاہم تقسیم ہند کے بعد ہم پاکستان کے اندر اس قسم کے ادارے قائم کرنے میں ناکام رہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان تعلیم کے شعبے میں بھارت' سری لنکا' نیپال اور یہاں تک کے سقوط ڈھاکہ کے بعد بنگلہ دیش سے بھی پیچھے رہ گیا۔ ہم اگر مسلمانوں اور بالخصوص پاکستانیوں کی موجودہ ناکامیوں کا ایک جامع تجزیہ کریں تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان بالعموم اور پاکستانی بالخصوص تعلیم کے میدان میں دنیا سے بہت پیچھے ہیں۔ اس پر ستم یہ کہ مسلمانوں میں بعض ایسے حلقے بھی پیدا ہوگئے ہیں جو نئی نسل پر تعلیم کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کرکے ان کو اندھیروں میں دھکیلنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ پاکستان میں تعلیم کی شرح انتہائی کم ہے اور جو تعلیم دی جارہی ہے، وہ انتہائی غیر معیاری ہے۔ پشتون بیلٹ کے حالات تو اور بھی ناگفتہ بہ اور تشویشناک ہے۔ گزشتہ 64 سال کے دوران پشتون بیلٹ میں تعلیم کی ترقی پر کوئی توجہ نہیں دی گئی، یہی وجہ ہے کہ ان علاقوں

میں سندھ اور پنجاب کے مقابلے میں تعلیمی سہولیات کا بہت زیادہ فقدان ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ پاکستان تعلیمی اعتبار سے خطے کے دوسرے ممالک جبکہ خیبر پختونخوا، سندھ اور پنجاب سے جبکہ فاٹا، خیبر پختونخوا سے تعلیمی میدان میں پیچھے رہ گیا ہے۔

21ویں صدی میں فاٹا میں کوئی یونیورسٹی نہیں ہے، جبکہ یہاں پر گرلز کالج کا محض تصور ہی کیا جاسکتا ہے۔ مسلمانوں کے زوال میں تعلیم سے دوری نے بنیادی کردار ادا کیا جبکہ پاکستان اس وقت عملاً اس کی جیتی جاگتی تصویر بنا ہوا ہے۔ دنیا کے صرف دو ممالک امریکہ اور بھارت میں یونیورسٹیوں کی تعداد ساٹھ کے لگ بھگ اسلامی ممالک میں قائم یونیورسٹیوں سے زیادہ ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق علمی میدان میں یہودیوں نے اب تک جتنے نوبل ایوارڈ حاصل کئے ہیں، ان کی مجموعی شرح پچاس فیصد کے لگ بھگ ہے، جبکہ ان میں صرف چند ہی مسلمان شامل ہیں۔ پاکستان میں سرکاری سطح پر شرح خواندگی 34 سے 40 فیصد بتائی جاتی ہے، تاہم حقیقت میں یہ اس سے کہیں کم ہے کیونکہ اس میں ہر اُس شخص کو خواندہ تصور کیا جاتا ہے جو محض پڑھنا، لکھنا بھی جانتا ہے۔ تعلیم کا مطلب وسیع تناظر میں یہ نہیں ہے۔ ایک قومی ادارے نے اڑھائی کروڑ شہریوں کے جو کوائف جمع کئے، ان کے مطابق یہ شرح نو سے گیارہ فیصد بنتی ہے۔ اس کے مقابلے میں جنوبی ایشیاء کے دوسرے ممالک کی شرح بہت زیادہ ہے، مثال کے طور پر سری لنکا میں یہ شرح 98 فیصد ہے۔

ایک اور سروے کے مطابق مسلمانوں اور پاکستانیوں میں جدید علوم خصوصاً سائنس کی حالت بہت ناگفتہ بہ ہے۔ جاپان میں چھٹی جماعت کا طالب علم ہمارے گیارہویں جماعت کے طالب علم سے زیادہ معلومات رکھتا ہے اور امریکہ میں ثانوی درجے کا طالب علم ہمارے سائنس کے استاد سے زیادہ باخبر ہوتا ہے۔ چند برس قبل 04-2003ء کے دوران تعلیم کے پانچ سالہ منصوبے میں جو اہداف رکھے گئے تھے، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ سکول جانے والے بچوں کی تعداد میں 42 سے 60 فیصد تک اضافہ کیا جائے گا۔ تاہم افسوسناک امر یہ ہے کہ پندرہ کروڑ سے زائد کی آبادی والے ملک میں سکول جانے والے بچوں کی تعداد ایک یا سوا کروڑ سے بڑھ نہیں سکی۔ ملک میں آبادی کے تناسب سے سکولوں اور کالجوں کی تعداد عالمی معیار تو ایک طرف جنوبی

ایشیاء کے مروجہ معیار سے بھی چالیس فیصد کم ہے۔ چند ایک اسلامی ممالک کو چھوڑ کر ستر فیصد مسلمان ریاستوں کی حالت ایسی ہی ہے۔

اقوام متحدہ کی ترقیاتی کونسل نے 1990ء میں دنیا کے تقریباً تمام ممالک کے عوام میں تعلیم، صحت اور اقتصادی صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لئے ایک سروے کیا تھا۔ کل 174 ممالک میں کرائے گئے سروے سے ثابت ہوا کہ مسلمان ان شعبوں میں دوسروں کے مقابلے میں کہیں پیچھے تھے۔ انسانی ترقی کے اشاریوں میں کینیڈا پہلے، ناروے دوسرے جبکہ امریکہ تیسرے نمبر پر تھا۔ پہلے 24 ممالک کی فہرست میں کوئی ایک مسلمان ملک شامل نہیں تھا۔ کویت 35ویں، بحرین 41ویں اور قطر 43ویں نمبر پر تھا۔ وہ ممالک جو ترقی کے اعتبار سے ان اسلامی ممالک سے کہیں بہتر تھے اور ابتدائی 24 ممالک میں شامل تھے، ان کی مجموعی آبادی ساٹھ کروڑ سے زائد تھی۔ بعد میں ملائشیا بھی اس فہرست میں شامل ہوا جبکہ ترکی کے حالات میں بھی نسبتاً بہتری آنا شروع ہو گئی۔ یہ بات بہت عجیب رہی کہ مسلم دنیا میں تعلیم اور ترقی کے اعتبار سے جو چھ ممالک سب سے آگے تھے، وہ سب سوویت یونین کا حصہ رہے تھے۔ ان ممالک میں خواندگی کی شرح 95 سے 97 فیصد تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا کریڈٹ بھی سابق سوویت یونین یا اس کے نظام کو جاتا ہے۔ ایک اور رپورٹ کے مطابق سائنس کے مختلف شعبوں میں 2000ء کے اوائل میں ایک سال میں اوسطاً دو لاکھ ساٹھ ہزار تحقیقی مضامین شائع ہوتے تھے، ان میں مسلمان ممالک یا مسلمانوں کے تحقیقی مقالہ جات کی تعداد صرف ڈھائی ہزار سے چھ ہزار تک رہی۔ اس سے یہ اندازہ لگانا کوئی مشکل کام نہیں رہتا کہ مسلمان علمی میدان خصوصاً جدید علوم میں اقوامِ عالم سے کتنے پیچھے ہیں اور پاکستان میں تعلیم کا معیار ترکی، ملائشیا اور دوسرے اسلامی ممالک سے کس قدر پست ہے، اور پاکستان میں فاٹا اور صوبہ خیبر پختونخوا میں تعلیمی سہولیات کے فقدان کا محض تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔

اب جائزہ لیتے ہیں کہ گزشتہ دس سال کے دوران ہمارے صوبے اور فاٹا کو تعلیم کے شعبے میں کس قدر نقصان اٹھانا پڑا۔ 2002ء کے بعد پشتون بیلٹ میں تعلیمی اداروں، ماہرینِ تعلیم اور اساتذہ کو جس بربریت کا نشانہ بنایا گیا، اور ہماری نئی نسل کو جس طریقے سے اندھیرے میں دھکیلنے کا

رویہ اپنایا گیا، اس کی مثال کم از کم گزشتہ اور حالیہ صدی کے دوران نہیں ملتی۔ ایک نظریاتی اور پرتشدد فلسفے کی بنیاد پر اس خطے میں سینکڑوں سکولوں کو تباہ کیا گیا جبکہ 11 لاکھ بچے شورش، آپریشنوں اور دھمکیوں کے باعث تعلیم سے محروم رکھے گئے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق گزشتہ چند برسوں کے دوران پختونخوا اور فاٹا میں تقریباً ایک ہزار سکولوں کو نقصان پہنچایا جا چکا ہے۔ ان میں سے 400 سکول ایسے ہیں جو اب قابل استعمال نہیں رہے، جبکہ 200 کے قریب وہ ہیں جن کی تعمیر پر اربوں روپے کی لاگت آنے کے علاوہ بہت وقت بھی صرف ہوگا۔ ستم ظریفی کی بات یہ بھی ہے کہ جن شر پسند قوتوں نے تعلیم کے خلاف مہم چلائی اور سکولوں کو نقصان پہنچایا، ان کی کارروائیوں کی زد میں صرف گرلز سکول ہی نہیں آئے بلکہ انہوں نے بوائز سکولز کو بھی نہیں چھوڑا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حملہ آور قوتوں کے لیے تعلیم کا حصول قابلِ جرم ہے۔ اگر ان کو صرف لڑکیوں کی تعلیم یا مخلوط طرز تعلیم سے اختلاف ہوتا تو وہ سینکڑوں کی تعداد میں بوائز سکولز کو نشانہ نہ بناتے۔

نوے کی دہائی میں جب افغانستان میں طالبان کی حکومت قائم ہوئی تو اس نے بھی پردے کی شرط پر لڑکیوں کو الگ سکولوں میں حصول علم کی اجازت دے دی تھی، تاہم 2004ء کے بعد جب ہمارے خطے میں بدامنی کا سلسلہ شروع ہوا تو نشانہ بنانے والوں نے طالبات تو ایک طرف طلباء پر بھی حصول علم کے دروازے بند کرنا شروع کر دیئے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لاکھوں پشتون بچے چاہتے ہوئے بھی تعلیم جیسی ضرورت سے محروم کر دیئے گئے، اور ان کی صحت کی سہولیات تک رسائی کو بھی مسدود کر دیا گیا۔ اس ضمن میں ہم پولیو ویکسین کی مخالفت کی مثال دے سکتے ہیں۔ فاٹا اور پختونخوا کے بے شمار علاقوں میں پولیو کی ویکسین کو خلاف اسلام قرار دے کر لاکھوں بچوں کو اس سے محروم کر دیا گیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لاکھوں بچوں اور بچیوں کا مستقبل ایک بڑے خطرے سے دوچار ہو گیا، کیونکہ پولیو کا وائرس کئی کلومیٹر تک پھیلتا ہے اور اس کا علاج ممکن نہیں ہے۔ اس کے باوجود پولیو ویکسین کی کھل کر مخالفت کی گئی، جبکہ بعض مذہبی رہنماؤں کے علاوہ سینکڑوں جید علماء پولیو کے قطروں کو جائز اور لازمی قرار دے چکے ہیں۔ 11-2010ء کے دوران حالات اس قدر خراب ہو گئے اور مریضوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ عالمی اداروں کو یونیسیف کی رپورٹوں کی روشنی میں حکومت پاکستان سے احتجاج کرنا پڑا اور پاکستان کی امداد بند کرنے اور پولیو سے محفوظ ہونے

کے سرٹیفکیٹ کے بغیر پاکستانیوں کے سفر پر پابندی عائد کرنے کی دھمکیاں بھی دینی پڑیں، جس کے باعث صدر آصف علی زرداری نے 2011ء کو پاکستان سے پولیو کے خاتمے کا سال قرار دیا جبکہ بل گیٹس فاؤنڈیشن نے پاکستان کو اربوں روپے دینے اور ہر درکار تعاون فراہم کرنے کا اعلان کیا۔ دوسری طرف سعودی عرب نے بھی ویزا کے اجراء کے لیے سرٹیفکیٹ پیش کرنے کی شرط عائد کردی۔

اگر یہ کہا جائے کہ مسلمان' پاکستانی اور پشتون علم اور آگہی سے دوری کے باعث آج بدترین ناکامیوں' بدنامیوں' معاشی زوال اور معاشرتی انحطاط کا سامنا کر رہے ہیں تو اس میں کچھ غلط نہیں ہوگا، کیونکہ آج ہم جن حالات سے دوچار ہیں، اس کے ٹھوس اسباب اور عوامل موجود ہیں۔ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ ہم زوال کی بدترین صورتحال کے باوجود اپنے منفی رویوں کو ترک کرنے کی نہ کوئی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور نہ ہی ہمیں موجودہ بدترین حالات اور مستقبل کے چیلنجوں کا کوئی حقیقی ادراک ہو رہا ہے۔ یہ اَمر بالکل واضح ہے کہ اگر ہم نے بحیثیت مسلمان' بحیثیت پاکستانی اور بحیثیت پشتون اپنی عزت' وقار' سلامتی اور مستقبل کی مثبت اور درست سمت کا تعین کرنا ہے تو اس کے لئے لازمی ہے کہ ہم اپنی نئی نسل کو ان سنگین خطرات سے نکالنے اور ان کو تعلیم دلانے کے لیے اسباب پیدا کریں۔ آج اگر عالمی برادری میں ہمیں نفرت' شک اور خوف کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے تو اس میں دوسروں کی مخالفت کے علاوہ ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں کا بھی بڑا عمل دخل ہے اور ان حالات سے نکلنے کے لئے محض ریاستی اداروں پر ہی انحصار نہیں کرنا چاہیے بلکہ ہمیں انفرادی اور اجتماعی سطح پر بھی ہنگامی قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔

امن برائے فروخت

یہ حقیقت ایک بڑے صدمے یا مستقل سیاسی لاپرواہی سے کم نہیں ہے کہ پاکستان کی سیاسی قوتوں اور سول سوسائٹی کی مختلف تنظیموں نے فکری اور علمی طور پر تشدد پسند اور تنگ نظر قوتوں کے ابلاغ، پراپیگنڈے اور رابطے کے دوسرے ذرائع کا راستہ روکنے کے اقدامات کو ہر دور میں نظر انداز کئے رکھا۔ اگر ہم 1980ء کے بعد سے اس خطے میں جاری کشیدگی کے اسباب کا جائزہ لے لیں تو ثابت ہوتا ہے کہ تشدد پسند قوتوں نے ابلاغ کے مختلف ذرائع مثلاً ریڈیو، اخبارات، رسائل، ویب سائٹس اور سی ڈیز کو اپنے مقاصد اور کارروائیوں کی کامیابی کے لئے انتہائی منظم طریقے سے استعمال کر کے ان ذرائع کو نہ صرف یہ کہ اپنی تشہیر کیلئے استعمال کیا بلکہ معاشرے میں موجود عام لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے بھی ان ذرائع کا بھرپور استعمال کیا۔ اس ضمن میں ہم مولوی فضل اللہ کے ایف ایم ریڈیو کی مثال دے سکتے ہیں۔ اس ریڈیو نے سوات میں طالبان کو وہ مؤثر ترین پلیٹ فارم مہیا کر دیا جس کے ذریعے فضل اللہ اور ان کی تحریک کو کچھ ہی عرصے میں عام لوگوں میں وہ اثر ورسوخ حاصل ہوا جس کی سیاسی یا ریاستی قوتیں توقع بھی نہیں کر سکتیں۔ جنرل (ر) مشرف کی حکومت نے ایک خاص پالیسی کے تحت فضل اللہ کے ایف ایم ریڈیو چینل کے علاوہ فاٹا اور صوبہ سرحد میں ان 30 سے 60 غیر قانونی ایف ایم ریڈیو چینلز سے لوگوں کی جان چھڑانے کی کوئی کوشش نہیں کی اور یوں یہ چینلز ریاست، سیاسی قوتوں اور امن پسند لوگوں کے لئے ایک بڑے خطرے کی صورت اختیار کر گئے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق دسمبر 2009ء تک پاکستان میں جن چینلز کو بڑی تعداد میں سنا جاتا تھا، ان میں 70 فیصد وہ غیر قانونی ریڈیو چینل تھے جو تشدد پسند قوتوں یا تنظیموں کی ترجمانی کر رہے تھے۔ اخبارات اور رسائل کی سرکولیشن کے حوالے سے بھی مختلف دعوے کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اندازے کے مطابق اس وقت بھی دو سو کے لگ بھگ ویب سائٹس ایسی ہیں جن کے ذریعے جہاد کی آڑ میں تشدد کی وکالت کی جا رہی ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ ان سائٹس کا وزٹ کرنے والوں میں سرفہرست نوجوان نسل اور خواتین ہیں۔

2002ء کے بعد جب عالمی میڈیا اور ریاستی قوتوں نے غیر سرکاری تنظیموں کے ذریعے

پاکستانی خصوصاً پشتون معاشرے میں لبرل ازم کے بیج بونے کی مہم کا آغاز کیا تو یہ کام ایسے لوگوں کو سونپا گیا، جن کا معاشرے کی اقدار' ثقافت اور رسوم و رواج سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ ان عناصر میں اکثریت اس انگریزی دان طبقے کی تھی جس نے محض اپنی سماجی حیثیت کو بنیاد بنا کر معاشرے میں تشدد کا راستہ روکنے کی ضرورت کو ایک طرح کا کاروبار سمجھا مگر اصل مقصد یا ہدف کے حصول کو عملاً کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔

اس مرحلہ کے دوران عالمی قوتوں اور ریاستی اداروں نے ذرائع ابلاغ کے ان اداروں کی نہ تو کوئی حوصلہ افزائی کی اور نہ ہی کوئی مدد کی، جو معاشرے میں امن کے قیام میں بنیادی کردار ادا کر سکتے تھے یا کر سکتے ہیں۔ مختلف لوگوں نے نیک نیتی کی بنیاد پر پشتو میں ایف ایم ریڈیوز اور ٹی وی چینلز شروع کرنے کی جتنی بھی کوششیں کیں، ان کو متعلقہ ریاستی اداروں کی جانب سے کوئی معاونت فراہم نہیں کی گئی بلکہ ان کی مخالفت کی گئی۔ اس رویے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ریاست یا معاشرے کی جانب سے تشدد کی وکالت اور تشہیر کرنے والے عناصر کا راستہ روکنے کی کوئی عملی صورت سامنے نہیں آئی۔ پاکستان ٹیلی ویژن' ریڈیو پاکستان اور آئی ایس پی آر جیسے اداروں کی طرف سے بھی اس ضمن میں کوئی ٹھوس اور مؤثر حکمت عملی سامنے نہیں آئی۔ ان اداروں نے جو محدود کام کیا، وہ اس وجہ سے مؤثر ثابت نہیں ہو سکا کہ جن لوگوں پر یہ ادارے انحصار کر رہے تھے، ان کا پس منظر بھی غیر سرکاری تنظیموں کے لوگوں سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ مثال کے طور پر ہدایت کار شعیب منصور، جن کی ایک فلم ''خدا کے لئے'' کی کامیابی اور تیاری کے لئے بے پناہ وسائل فراہم کئے گئے۔ موصوف نے اس فلم میں جہاں ایک نان پشتون مصنف کا ناکام فارمولہ اپنایا، وہاں انہوں نے کروڑوں کے بجٹ کے ہوتے ہوئے بھی ان پشتون فنکاروں کو انتہائی کم معاوضے دیئے، جنہوں نے اس فلم میں اداکاری کی تھی۔ یہ فلم یکطرفہ سکرپٹ اور ڈائریکشن کا نمونہ تو قرار دی جا سکتی ہے، تاہم میرٹ اور انصاف کے تقاضوں کو بری طرح نظر انداز کیا گیا اور اس فلم میں بھی پشتونوں کو طالبان قرار دینے کی عملی کوشش کی گئی۔ شعیب منصور کی بجائے اگر اس پراجیکٹ کے لئے جمال شاہ' رؤف خالد' طارق سعید یا توفیق حسین شاہ جیسے ہدایت کاروں کا انتخاب کیا جاتا تو اس کے انتہائی مثبت نتائج برآمد ہوتے۔

آئی ایس پی آر' وزارت اطلاعات' فاٹا سیکرٹریٹ اور بہت سے دوسرے ادارے سوات

آپریشن کے بعد معاشرے میں امن اور ترقی کے لئے ماحول سازگار بنانے کے لئے میڈیا کے مختلف ذرائع کے ذریعے اپنے پیغام کی تشہیر پر اربوں روپے خرچ کر چکے ہیں، تاہم افسوسناک امر یہ ہے کہ بوجوہ وہ نتائج حاصل نہیں کیے جا سکے، جن کی توقع کی جا رہی تھی۔ اس وقت بھی پشتونخواہ' خیبر' سوات اور وزیرستان میں مختلف ریڈیو چینلز کام جاری رکھے ہوئے ہیں، تاہم سکرپٹ کی عدم موجودگی' وژن سے محروم سٹاف' ناتجربہ کار میزبانوں اور فنڈز کی کمی کے باعث یہ ریڈیو چینلز کم از کم امن کے قیام کی کوششوں کے سلسلے میں کوئی مؤثر کردار ادا کرنے میں ناکام ہی دکھائی دیتے ہیں۔ غیر ملکی ریڈیوز کی حالت (جو پشتو میں ہیں) بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے کیونکہ ان اداروں میں بھی میرٹ اور وژن کی اہمیت کو بری طرح نظر انداز کیا جا تا رہا ہے۔

ایک رپورٹ کے مطابق 2002ء سے 2010ء تک کے عرصہ کے دوران دہشت گردی' مذہبی جنونیت، علاقائی شورشوں اور اس سے متعلقہ دوسرے موضوعات پر ہالی ووڈ میں چالیس کے لگ بھگ جبکہ بالی ووڈ (ہندوستان) میں بیس سے زائد فلمیں بنائی جا چکی ہیں، تاہم جس خطے میں یہ جنگ عملاً لڑی جا رہی ہے، اس خطے کے ممالک کے متعلقہ ادارے ابھی تک اس حوالے سے پانچ فیصد کام بھی سامنے لانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ حال ہی میں چند ایک پشتون ڈائریکٹرز نے امن کے فروغ کے لئے بعض ڈرامے اور امن گیت تیار کئے تو توقع تھی کہ وہ ''خدا کے لئے''، ''خدا زمین سے گیا نہیں ہے'' اور بے شمار ویڈیوز اور ریڈیو پروگراموں کے نتائج کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے پچھلے ڈائریکٹرز کی طرح غلطیاں نہیں دہرائیں گے، تاہم ان کے تیار کردہ ڈرامے اور امن گیت بھی زیادہ مختلف یا پراثر ثابت نہیں ہو سکے۔ وسائل اور فنڈز سے فائدہ تو حاصل کیا گیا، تاہم اصل پشتون کے تاثر کی بحالی یا مسائل کی درست نشاندہی کو ممکن بنانے کی جانب توجہ مبذول نہیں کی گئی۔ ان چند مثالوں کے علاوہ ان بے شمار این جی اوز اور تھنک ٹینکس کا تو ذکر ہی کیا، جو عالمی اداروں سے پشتونوں کے رویئے تبدیل کرنے کے نام پر اربوں ڈالرز لے کر آٹھ سال کے طویل عرصہ کے دوران نتائج کے حوالے سے ابھی تک ''کاغذی خدمات'' کے مرحلے سے بھی باہر نہیں نکلے۔ پشتو کے واحد چینل نے انتہائی محدود وسائل کے ہوتے ہوئے اپنے ڈائریکٹرز کے علاوہ نجی شعبہ کے تعاون سے امن سے متعلق دو ڈرامہ فیسٹول منعقد کیے تو اس کے کافی مثبت نتائج اور

اثرات مرتب ہوئے۔اس ادارے نے وسائل کے فقدان کے باوجود نوآموز مصنفین، ہدایتکاروں اور اداکاروں پر انحصار کر کے خاصے مثبت نتائج دیئے، حالانکہ اس کے مالکان نہ تو پشتون ہیں اور نہ ہی وہ اس صوبے سے تعلق رکھتے ہیں۔

دوسری جانب اربوں کے بجٹ اور بے شمار اداروں کے باوجود نتائج حاصل نہیں کئے جا سکے۔اس ضمن میں صوبائی حکومت کی کارکردگی بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔ایک تلخ حقیقت یہ بھی ہے کہ پشتون فنکاروں، گلوکاروں، موسیقاروں، لکھاریوں اور دوسرے متعلقہ لوگوں کی حالت بہتر ہونے کی بجائے دن بدن بدتر ہوگئی ہے۔صفِ اول کے گلوکار اور فنکار پاکستان چھوڑ کر دوسرے ممالک میں آباد ہوگئے ہیں جبکہ باقی جو لوگ رہ گئے ہیں، ان کا یا تو استحصال کیا جارہا ہے یا وہ مفلسی، گمنامی اور بھوک کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو چکے ہیں۔

اے این پی کا اعلان کردہ کلچرل سیکرٹریٹ اپنے قیام کے کس مرحلے پر ہے اور اگر قائم ہو گیا ہے تو کیا کر رہا ہے، اس کا کسی کو کوئی علم نہیں ہے۔نشتر ہال میں کوئی سرگرمی عملاً کیوں نہیں ہو رہی، اس کے اسباب کا بھی کوئی پتہ نہیں۔اے این پی کی صوبائی حکومت ثقافت اور پشتون تاثر کو درپیش بدترین خطرات کے باوجود ابھی تک سرکاری سرپرستی میں ''اباسین ٹی وی'' کی لانچنگ کو یقینی بنانے میں بھی ناکام رہی ہے، حالانکہ اس چینل کے آغاز سے جہاں ایک طرف اس خطے کے مسائل، تاریخ اور وسائل کو اجاگر کیا جاسکتا ہے، وہاں مفلسی اور تنہائی کی اذیت سے دوچار فنکاروں کو رزق کا ایک دنیاوی وسیلہ بھی فراہم کیا جاسکتا ہے۔دیکھا جائے تو انتہا پسندوں کو میدانِ جنگ میں شکست دینے سے زیادہ اہمیت اور ضرورت اس بات کی ہے کہ اس خطے کے اکثریتی لوگوں، ان کی تاریخ، ان کی ثقافت، ان کی اقدار اور ان کے مسائل کو میڈیا کے ذریعے سامنے لا کر فکری اور ذہنی طور پر تشدد پسندوں کا راستہ روکا جائے۔امن کے نام پر نام نہاد منصوبوں کی حوصلہ شکنی کر کے ایک مربوط اور عملی منصوبہ کی تشکیل ریاست کی ذمہ داری ہے اور اگر ہم اس خطے میں امن کے خواہاں ہیں تو ہمیں ثقافت، کھیل اور دوسری مثبت سرگرمیوں کے فروغ کے لئے ٹھوس اقدامات کرنے ہوں گے۔ریاست کو ان عناصر کا اب واقعتاً راستہ روکنا ہوگا جو جنگ اور امن کو کاروبار سمجھ کر فوائد حاصل کر رہے ہیں۔

فاٹا عسکریت پسند تنظیموں کے نشانے پر

پاکستان کے ریاستی اداروں اور ان کی معلومات پر انحصار کرنے والے تجزیہ نگاروں کے دعوؤں کے برعکس پاکستان، افغانستان اور بھارت میں غیر ریاستی کرداروں کی سرگرمیاں عالمی دباؤ اور ریاستی کارروائیوں کے باوجود پھر سے بڑھتی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں۔ وسطی ایشیائی ممالک، ایران اور بعض سعودی ممالک میں بھی انتہائی بے چینی کی کیفیت دکھائی دے رہی ہے، جبکہ اسلامی ممالک پر امریکہ اور اس کے اتحادی مغربی ممالک کا دباؤ بھی کسی وقفے کے بغیر برقرار ہے۔ اس صورتحال کا اگر سنجیدگی سے تجزیہ کیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ پورے خطے میں رواں برس کے دوران کئی نئی پیچیدگیاں جنم لیں گی اور طاقت کے کئی مہرے اور سرچشمے اپنے اپنے مقاصد کے تناظر میں نئی حکمت عملی کے ساتھ میدان میں نکل کر ریاستوں کے تصور اور ڈھانچے کے لئے خطرہ بنتے دکھائی دیں گے۔ مجموعی طور پر اگر حقائق کی بنیاد پر کسی خطے کو شدید خطرات لاحق ہو سکتے ہیں تو وہ پاکستان اور افغانستان کا وہ خطہ ہے جہاں پر پشتون بڑی تعداد میں رہائش پذیر ہیں اور اسے ہم پشتون بیلٹ کا نام دیتے ہیں۔ یہ علاقہ 1978ء سے اب تک کسی وقفے کے بغیر عالمی اور علاقائی سازشوں، جنگوں اور شورشوں کا مرکز بنا ہوا ہے اور مستقبل قریب میں بھی اس بات کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا کہ یہاں پر امن قائم ہوگا، سیاسی استحکام آئے گا یا ترقی کا آغاز ہو سکے گا۔ اس حقیقت میں کوئی مبالغہ نہیں کہ یہ خطہ علاقائی اور عالمی قوتوں کے باہمی اختلافات، دوطرفہ سازشوں اور عملی تصادم کا مرکز بن گیا ہے اور اس کا یہ نتیجہ برآمد ہوا ہے کہ پاکستانی ریاست اور سیاسی قوتیں اس خطے میں تمام تر کوششوں کے باوجود مستقل امن کے قیام میں ناکام دکھائی دیتی ہیں۔

حکمرانوں نے 1947ء میں پاکستان کے آزاد ملک بننے کے بعد بھی فاٹا کے انتہائی اہم اور پیچیدہ علاقے کو واقعتاً ''علاقہ غیر'' سمجھ کر اس کو نہ صرف یہ کہ پاکستان اور افغانستان کے درمیان بفرزون برقرار رہنے دیا بلکہ 1980ء کی دہائی میں جب اس علاقے میں روس اور امریکہ کے درمیان ویت نام جنگ کا دوسرا حصہ شروع ہوا تو ہمارے فوجی حکمرانوں اور مذہبی قوتوں نے ڈالر کمانے کے چکر میں اس بفرزون کو سوویت یونین کے خلاف سرگرمیوں کے لئے بیس کیمپ بنا کر

اس کو ایک طرح سے جہادی سرگرمیوں کے لئے لیز پر دے دیا۔ ان پالیسیوں کا نتیجہ ہی تھا کہ یہ علاقہ (فاٹا) علاقائی اور عالمی قوتوں کے علاوہ پوری دنیا کے غیر ریاستی عناصر کے لئے پُرکشش ٹھہرا۔ دستیاب معلومات کے مطابق اس علاقے میں تیرہ ممالک کی 25 کے لگ بھگ انٹیلی جنس ایجنسیوں کے علاوہ عسکری تنظیموں کے نیٹ ورکس نہ صرف یہ کہ فعال ہیں بلکہ یہ قوتیں عملی طور پر ایک دوسرے کے خلاف صف آراء بھی ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ خطہ صرف طالبان کی سرگرمیوں کا مرکز ہی نہیں ہے، بلکہ یہ مختلف ممالک اور ان کی خفیہ ایجنسیوں کے لیے بھی اہمیت کا حامل ہے۔ سنگاپور اور آسٹریلیا سے تعلق رکھنے والے دو تھنک ٹینکس کی رپورٹ کے مطابق فاٹا میں جہاں ایک طرف امریکہ مخالف جہادی تنظیموں کا ایک مضبوط عالمی نیٹ ورک متحرک ہے، وہاں ایک درجن سے زائد عسکریت پسند تنظیمیں ایسی بھی ہیں جو اپنے اپنے ممالک کی حکومتوں کے خلاف کارروائیوں میں مصروف ہیں۔ اس ضمن میں عرب ممالک اور وسطی ایشیائی ریاستوں کی تنظیموں کی مثالیں دی جا سکتی ہے۔ اگر ان اطلاعات کو درست مان لیا جائے تو صورتحال مزید تشویش ناک رُخ اختیار کر لیتی ہے۔ فاٹا سے متعلق اس قسم کی اطلاعات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں رہتا کہ دنیا بھر کی بہت سی ریاست مخالف قوتوں نے اس بدنصیب خطے کو واقعتاً بارود کے ڈھیر میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔

پاکستانی اداروں کی موجودہ پالیسی کو عالمی سطح پر سراہے جانے کے باوجود شمالی وزیرستان میں غیر ملکیوں کی موجودگی کی اطلاعات یا الزامات کو موجودہ صورتحال کے تناظر میں نظرانداز کرنے کا رویہ مزید نئے سوالات اور خطرات کو جنم دینے کا سبب بن رہا ہے۔ عالمی سطح پر یہ تاثر کوئی اچھا پیغام نہیں دے رہا کہ پاکستانی فورسز صرف ان عسکری قوتوں کے مقابل لڑ رہی ہیں جو کہ پاکستان کے لئے خطرہ بنی ہوئی ہیں۔ اس تاثر کو عالمی طاقتوں اور ان کے اتحادیوں کی نظر میں کتنی اہمیت دی جا رہی ہے، اس کا اندازہ شمالی وزیرستان پر ڈرون حملوں کی تعداد میں اضافے سے لگایا جا سکتا ہے۔ امریکہ کو فاٹا میں عسکریت پسند تنظیموں کی موجودگی پر کس قدر تشویش ہے، اس کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ 2010ء کے دوران شمالی وزیرستان پر پچاس سے زائد ڈرون حملے کئے گئے۔ یہ اب معمول بن گیا ہے کہ اگر پاکستانی فورسز کسی قبائلی ایجنسی میں کوئی کارروائی کرتی ہیں تو

امریکہ اسی شرح سے شمالی وزیرستان پر ڈرون میزائل داغ دیتا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ڈرون حملوں کی مخالفت کرنے والی سیاسی و مذہبی قوتیں اپنی مخالفت کو بھینس کے آگے بین بجانے والا معاملہ سمجھ کر اب روایتی بیان بازی سے بھی باز آ گئی ہیں۔

فاٹا میں غیر ملکی عسکریت پسند تنظیموں کی موجودگی سے بھی زیادہ باعثِ تشویش اَمر یہ ہے کہ یہاں پر ان ممالک کی انٹیلی جنس ایجنسیاں بھی سرگرم عمل ہیں، جنہوں نے اپنے اختلافات کے پیشِ نظر ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے فاٹا کے میدانِ جنگ کا انتخاب کیا ہے۔ لیکن پاکستانی ادارے اور حکام بھارت کے علاوہ کسی اور ملک کا نام لینے کی جرأت کا مظاہرہ بھی نہیں کر سکتے، حالانکہ سب کو علم ہے کہ فاٹا اور بعض دوسرے شورش زدہ علاقوں میں متعدد غیر ملکی ایجنسیاں سرگرمِ عمل ہیں۔ اس حکمت عملی یا مجبوری کی ایک بڑی وجہ شاید یہ ہو سکتی ہے کہ جن ممالک کے جاسوسی نیٹ ورک یہاں موجود ہیں، ان میں سے بعض ہمارے وہ دوست یا اتحادی ممالک ہیں جن کے ساتھ ہمارے بہت سے سیاسی اور ریاستی مفادات وابستہ ہیں۔ اس قسم کی حکمتِ عملی پاکستان کے لئے مستقبل میں ایک بڑی تباہی کی وجہ بن سکتی ہے، تاہم اس کا کیا کیا جائے کہ موجودہ حکمران بھی اپنی خارجہ پالیسی کے تناظر میں سابق حکمرانوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ پالیسی تو یہی ہونی چاہئے تھی کہ دوست اور دشمن کی تمیز کئے بغیر فاٹا میں تمام قوتوں کی مداخلت یا سرگرمیوں کے خاتمے کے لئے انتہائی واضح اور دوٹوک مؤقف اختیار کیا جاتا اور اس ضمن میں کسی کے ساتھ کوئی بھی رعایت نہ کی جاتی۔ اگر پاکستانی حکمرانوں اور سکیورٹی اداروں کو صورتحال کی نزاکت اور اس کے نتائج کا واقعتاً ادراک ہوتا تو 2009ء کے بدترین حملوں کے بعد گڈ اور بیڈ طالبان کے امتیاز کے بغیر مربوط کارروائیاں کی جاتیں اور خطے اور دنیا کے دیگر ممالک کے انٹیلی جنس اداروں کی حد بھی متعین کر دی جاتی۔ اگر ایسا کیا جاتا تو آج پاکستان کی سلامتی موجودہ خطرات سے دوچار نہ ہوتی۔ ٹھوس معلومات، نئی صف بندیوں اور کارروائیوں کے عملی مظاہرے سے ثابت ہو رہا ہے کہ پاکستان کو مختلف محاذوں پر متعدد پیچیدگیوں اور سازشوں کا سامنا ہے۔ پاکستان کے عوام اور سیاسی قوتوں کو ریاست کی خارجہ پالیسی سے باہر رکھنے کے نتائج آج مملکت خداداد اور اس کے کروڑوں عوام کو بھگتنا پڑ رہے ہیں، ستم بالائے ستم یہ کہ اس کے باوجود دنیا میں ہمارے ہمدردوں، دوستوں

اور اتحادیوں کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے۔ بین الاقوامی تعلقات کا ایک طے شدہ فارمولہ یہ بھی ہے کہ ریاستی اور قومی مفادات کو اولین ترجیح دے کر اس کی بنیاد پر پالیسیاں ترتیب دی جاتی ہیں۔ اسی فارمولے کے تحت ایک مسلمہ اصول یہ ہے کہ مداخلت صرف مداخلت ہوتی ہے، خواہ وہ دوست کی طرف سے ہو یا دشمن کی طرف سے۔ افسوسناک امر یہ ہے کہ ہم اب بھی اپنے روایتی فارمولوں پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ ہمارے بعض دوست ممالک نہ صرف یہ کہ ہمارے سیاسی معاملات میں کھلی مداخلت کرتے ہیں بلکہ وہ آپس کے اختلافات کو ہماری دھرتی پر حل کرنے کی پالیسیوں پر بھی عمل پیرا ہیں۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ ہمارا ملک عالمی سطح پر بدنام ہونے کے علاوہ اندرونی خلفشار، سازشوں اور بدامنی کا بھی شکار ہو گیا۔ فاٹا میں غیر ملکی تنظیموں اور خفیہ اداروں کی موجودگی کی اطلاعات اور ان کی سرگرمیوں کو کسی بھی طور پاکستان کی قومی سلامتی کے تناظر میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان عناصر کا راستہ روکنا پاکستان کی سلامتی کے لئے انتہائی ضروری ہو گیا ہے اور اگر ایسا نہیں کیا جاتا تو فورسز کے جوانوں اور عام شہریوں کا خون بہتا رہے گا اور ملک کے حالات بہتر ہونے کی بجائے بدتر ہوتے جائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی فریقین اپنے اپنے اہداف کے حصول کے لئے ابھی سے تیاری کرنے لگے ہیں اور اس عمل میں دیگر عالمی قوتیں بھی نئی صف بندیوں میں مصروف ہو گئی ہیں۔ خدشہ ہے کہ پاکستان کے اندرونی اور بیرونی حالات آئندہ چند مہینوں کے دوران ایک نئی مگر خطرناک اور صبر آزما صورتحال سے دوچار ہوں گے اور بہت سی تبدیلیاں رونما ہوں گی۔

غیر ملکی عسکریت پسند گروہوں کی ترجیحات؛

سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ ایک نئی جنگ کا خدشہ کن اسباب کی بنا پر ظاہر کیا جارہا ہے؟ اس کے کئی اسباب ہیں تاہم سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جن لوگوں اور جن قوتوں نے پاکستان خصوصاً فاٹا کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا ہوا ہے، وہ ایک عالمی ایجنڈے اور نظریے کو اپنا کر آگے بڑھ رہی ہیں۔ یہ تمام قوتیں مقامی اور غیر مقامی عسکریت پسند گروہوں کا پس منظر رکھتی ہیں اور یہ سب پاکستان میں بیٹھ کر اپنے اپنے ممالک یا حکومتوں کے خلاف نظریاتی اور عملی کوششوں میں

مصروف ہیں۔ یہ قوتیں بنیادی مقاصد اور اہداف کے معاملے پر ایک دوسرے کی اتحادی ہیں، جبکہ سب سے اہم یہ ہے کہ یہ سب لوگ اپنے اپنے ممالک کو ان کی سرگرمیوں کے باعث انتہائی مطلوب بھی ہیں۔ اگر ان کو یہاں سے نکالا جاتا ہے تو ان کے لئے موجودہ صورتحال اور عالمی صف بندی کے باعث ایسا کوئی دوسرا ٹھکانہ ڈھونڈنا خاصا مشکل بلکہ ناممکن ہوگا۔ ایسے میں ان کی پالیسی یہی رہ جاتی ہے کہ پاکستان کے اندر اپنے اتحادیوں کو مضبوط کر کے اپنے قیام کے امکان کو برقرار رکھا جائے۔ ان قوتوں کو اس حقیقت کا بھی ادراک ہے کہ اگر وہ واپس اپنے اپنے ممالک یا علاقوں میں چلے جاتے ہیں تو ان کے لئے اپنی بقاء بھی مشکل ہو جائے گا، اس لئے بہتر یہ ہے کہ اگر مرنا ہی ہے تو موجودہ ٹھکانوں اور علاقوں میں رہ کر مزاحمت کا بظاہر آسان راستہ اختیار کیا جائے، جس کے باعث یہ قوتیں اور ان کے اتحادی فاٹا میں بالخصوص اور پاکستان میں بالعموم خود کو زیادہ محفوظ تصور کرتے ہیں۔ اگر پاکستان پر ان کو نکالنے کے لیے دباؤ برداشت کی حد عبور کرتا ہے یا یہ لوگ مقامی عسکریت پسندوں کے ساتھ مل کر پاکستان کو نشانہ بنانے کی اپنی پالیسی سے باز نہیں آتے تو پاکستانی فورسز کے لئے ان کے خلاف فیصلہ کن جنگ لڑنے کے سوا دوسرا کوئی آپشن باقی نہیں رہے گا، تاہم ایسا ہونے کی صورت میں یقینی ہے کہ یہ لوگ بھی اس راؤنڈ کے دوران پوری شدت کے ساتھ نہ صرف یہ کہ اپنا دفاع کریں گے بلکہ یہ پاکستان کے مختلف علاقوں خصوصاً بڑے شہروں کو نشانہ بنانے کا اپنا روایتی حربہ یا فارمولہ بھی ایک بار پھر آزمائیں گے۔

دنیا کی اڑھائی ارب آبادی میں بے چینی کی لہر

پاکستان، افغانستان، بھارت، چین اور ایران پر مشتمل اس خطے کے سیاسی، حکومتی اور اقتصادی حالات بدستور پیچیدگیوں، خطرات اور سازشوں کی ایسی صورتحال سے دوچار ہیں جن کے اثرات اور نتائج کا درست احاطہ کرنا یا تجزیہ کرنا خاصا مشکل ہے۔ ان ممالک کے حالات نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہو رہے ہیں بلکہ فریقین بوجوہ ایک دوسرے پر اندرونی معاملات میں مداخلت کے الزامات بھی لگا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر پاکستانی خفیہ ایجنسی آئی ایس آئی پر بھارت اور افغانستان کے علاوہ بعض مواقع پر امریکہ اور اس کے اتحادی بھی کھل کر تنقید کر رہے ہوتے ہیں، جبکہ بھارتی خفیہ ایجنسی ''را'' کے بارے میں پاکستان اور افغانستان کے بعض اہم ترین حلقوں کے اعتراضات بھی وقتاً فوقتاً سامنے آتے رہتے ہیں۔ اسی طرح جب کبھی ایران میں دہشت گردی کا کوئی بڑا واقعہ رونما ہوا اور جنداللہ جیسی کوئی تنظیم اس کی ذمہ داری قبول کر لے تو ایران کا پاکستان کے حوالے سے رویہ فوراً جارحانہ صورت اختیار کر لیتا ہے۔ چین اور بھارت کے درمیان تلخیوں اور الزامات کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے، جبکہ بھارت، پاکستان اور افغانستان، پاکستان کے دوطرفہ تعلقات بھی اکثر کشیدہ ہی رہتے ہیں۔ اس کشیدگی کا ہی نتیجہ ہے کہ امریکہ اور ایسے دوسرے ممالک اس خطے کی نہ صرف یہ کہ مسلسل نگرانی کر رہے ہیں بلکہ یہ ممالک اس علاقے میں کھلی مداخلت اور جارحیت سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اس وقت پاکستان میں بڑھتے ہوئے ڈرون حملے، کشمیر میں عوامی احتجاج اور اس پر بھارت کی تشویش، پاکستان کے بدترین اقتصادی حالات، امریکہ اور ایران کے درمیان کشیدگی اور افغانستان سے امریکی فوجوں کے انخلاء سے پیدا ہونے والی متوقع صورتحال سمیت متعدد دوطرفہ ایشوز ایسے ہیں جن کے باعث یہ خطہ مسلسل مسائل کا شکار ہے۔

پاکستان کی قبائلی ایجنسی شمالی وزیرستان میں ڈرون حملوں کا سلسلہ جاری ہے اور اس ضمن میں حکومت نے خاموشی اختیار کر رکھی ہے، جس سے متعدد سوالات جنم لے رہے ہیں۔ یکم ستمبر 2010ء سے پندرہ ستمبر 2010ء تک شمالی وزیرستان پر ایک اندازے کے مطابق سترہ ڈرون حملے

کیے گئے۔ یوں یہ کہا جاسکتا ہے کہ پاکستان میں روزانہ کم از کم ایک ڈرون حملہ کیا جارہا ہے اور یہ سلسلہ ختم یا کم ہونے کے بجائے بڑھتا ہی جارہا ہے۔ چار جون 2004ء سے شروع ہونے والے ڈرون حملوں کے آغاز کو سات سال بیت چکے ہیں۔ ان سات برسوں کے دوران فاٹا کی سات ایجنسیوں کو متعدد بار نشانہ بنا کر سینکڑوں افراد کو لقمۂ اجل بنایا جاچکا ہے۔ مرنے والوں میں متعدد غیر ملکی بھی شامل رہے ہیں، تاہم 2010ء کے دوران جب پاکستانی حکومت اور پاک فوج نے امریکہ کے شمالی وزیرستان میں فوجی آپریشن کرنے کے مطالبے پر عمل کرنے سے معذرت کرلی تو امریکہ نے باقاعدہ حکمتِ عملی کے تحت شمالی وزیرستان کو مسلسل ہدف بنانے کا آغاز کردیا اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے کیونکہ پاکستان کی طرف سے ڈرون حملوں کے خلاف عملاً کوئی حکومتی اور سیاسی آواز نہیں اٹھ رہی ہے۔ جے یو آئی کے امیر مولانا فضل الرحمٰن نے 15 ستمبر (2010ء) کو درگئی میں اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ڈرون حملوں کو پاکستانی حکمرانوں کی کھلی آشیر باد حاصل ہے، تاہم ایسا کہتے وقت وہ یہ بھول گئے کہ ان کی جماعت بھی دوسروں کی طرح حکمرانی سے لطف اندوز ہو رہی ہے (اس وقت جے یو آئی برسرِ اقتدار تھی)۔ اس کا مطلب بہت واضح ہے اور وہ یہ کہ کوئی بھی مؤثر سیاسی قوت ڈرون حملوں کی عملی طور پر مخالفت نہیں کر رہی۔ بین الاقوامی تعلقات کے طے شدہ طریقۂ کار کے تحت امریکہ ڈرون حملوں کے ذریعے اپنے ایک حلیف ملک کے خلاف کھلی مداخلت اور جارحیت کا ارتکاب کرکے اس کی جغرافیائی حدود کی خلاف ورزی کررہا ہے۔

پاکستان کی حکومت اور پاک فوج کی پالیسی تاحال کنفیوژن کا شکار ہے، اور بظاہر اس کو پالیسی کا نام نہیں دیا جاسکتا کہ امریکہ پر انحصار کرنے والا پاکستان شمالی وزیرستان میں آپریشن سے تو گریزاں ہے، تاہم ڈرون حملوں کی صورت میں امریکی خلاف ورزیوں کا کوئی نوٹس نہیں لیا جا رہا۔ پاکستان کی اس خاموشی کے باوجود اس ملک پر اس کے اتحادیوں کے عدم اطمینان اور الزامات کا سلسلہ وقفے وقفے سے جاری رہتا ہے۔ مثال کے طور پر 15 ستمبر (2010ء) کے روز جب آنجہانی رچرڈ ہالبروک اور حامد کرزئی اسلام آباد کے دورے پر تھے، اس سے محض ایک روز قبل فرانسیسی وزیر خارجہ برنالڈ نے الزام لگایا تھا کہ افغان طالبان کمانڈر ملا عمر پاکستان میں ہے۔

اسی شام کوشمالی وزیرستان پر تین چار گھنٹوں کے وقفے سے تین میزائل (ڈرون حملے) داغے گئے، جن میں بیس سے زائد افراد جاں بحق ہو گئے۔ ان حملوں میں پاکستان کے حامیوں یعنی حافظ گل بہادر گروپ اور حقانی نیٹ ورک کے ٹھکانوں کو نشانہ بنایا گیا۔ دوسری طرف پاک فوج کی جانب سے اورکزئی ایجنسی کو پرامن قرار دے کر یہاں آپریشن کے خاتمے کے اعلان کے باوجود 14 ستمبر ہی کوڈبوری کے مقام پر موجود چیک پوسٹ پر حملہ کیا گیا جس سے فریقین کے آٹھ افراد جاں بحق ہو گئے۔ یوں ریاست کی رٹ ختم ہو کر رہ گئی۔ اسی روز چیف جسٹس نے اپنے ریمارکس میں کہا کہ اگر ادارے اپنی حدود سے تجاوز کریں تو عدلیہ مداخلت کر سکتی ہے، جبکہ یہ خبر بھی سامنے آئی کہ حکومت پر عوام کے عدم اطمینان کا یہ عالم ہے کہ سیلاب کے ڈیڑھ ماہ گزرنے کے باوجود وزیراعلیٰ خیبر پختونخوا کے قائم کردہ فنڈ میں صرف تین کروڑ روپے جمع کرائے گئے ہیں۔ اسی روز ایک اور خبر یہ تھی کہ بدترین اقتصادی صورتحال اور سیلاب کے باوجود عوامی نمائندوں کے اثاثے ناقابل یقین حد تک بڑھ گئے ہیں اور یہ کہ امیر ترین ارکانِ اسمبلی میں خیبر پختونخوا اور فاٹا کے ارکان سب سے آگے ہیں۔ بعض ممبران اسمبلی کے اثاثوں میں غیر معمولی اضافے کی تفصیلات بھی سامنے آئیں۔ اس صورتحال کو ہی بنیاد بناتے ہوئے عالمی میڈیا کے بعض اداروں نے اپنے تبصروں اور تجزیوں میں پاکستان کو ''بھیک مانگنے والی قوم'' اور ریاست کے ارکان اسمبلی کو ''ارب پتی'' قرار دے کر سیاسی نظام کے بارے میں متعدد سوالات پیدا کر دیئے۔ ملک میں اس عرصہ کے دوران بعض اہم حلقوں کی جانب سے پاکستان میں ایک بار پھر فوجی مداخلت کے امکان اور اس کی ضرورت کی بحث چلتی رہی۔ اس صورتحال سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ پاکستان کے اندرونی اور بیرونی خطرات بدتر صورت اختیار کر گئے ہیں۔

دوسری طرف افغانستان میں اس اَمر پر بحث ہو رہی ہے کہ پارلیمانی انتخابات کے پرامن انعقاد اور امریکہ کی واپسی کی صورت (متوقع) میں نئے منظرنامہ کے لئے کون سی حکمت عملی اپنائی جا سکتی ہے۔ حزب اسلامی کے سربراہ گلبدین حکمت یار کے ایک حالیہ انٹرویو کو بھی باخبر حلقے بہت اہمیت دے رہے ہیں۔ بعض حلقوں نے اس انٹرویو میں ان کے افغانستان کے حوالے سے امریکی پالیسیوں کو مثبت قرار دیئے جانے کو ان کے تبدیل شدہ مگر حقیقت پسندانہ رویئے کا نتیجہ قرار دیا اور

اب جن اہم نکات پر بحث چل نکلی ہے،، ان کے اثرات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر انہوں نے پہلی بار نائن الیون کے واقعات میں القاعدہ کے ملوث ہونے کا اعتراف کیا۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ اگر امریکہ واقعتاً افغانستان سے نکل رہا ہے تو افغانستان سپر پاور سمیت عالمی برادری کو یہ یقین دہانی کرانے کو تیار ہے کہ افغان سرزمین دنیا کے خلاف استعمال نہیں ہوگی۔ تیسری اہم بات انہوں نے یہ کہی کہ جماعت اسلامی اور حزب اسلامی کے درمیان اب پہلے کی طرح رابطے قائم نہیں ہیں اور یہ کہ جو علماء، حلقے یا لوگ خودکش حملوں کو جائز اور حلال کہہ رہے ہیں، وہ بالکل غلط کہہ رہے ہیں۔ اس انٹرویو سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ افغانستان کی سیاسی قیادت پاکستان کے مقابلے میں زیادہ ذمہ داری، اہلیت اور لچک کا مظاہرہ کرتی دکھائی دے رہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ افغانستان کے حالات طالبان اور فورسز کے درمیان جھڑپوں کی اطلاعات کے باوجود بہتر ہوتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔

بھارتی مقبوضہ کشمیر میں طویل عرصہ تک خاموشی چھائی رہنے کے بعد ایک بار پھر کشمیری نوجوانوں کی تحریک چل نکلی اور عالمی میڈیا میں اس ایشو پر بحث شروع ہوگئی۔ اس تحریک کے دوران پہلی دفعہ ایک مثبت بات یہ سامنے آئی کہ بھارت نے ماضی کی طرح پاکستان کو موردالزام قرار دینے سے گریز کا راستہ اختیار کیا اور بعض مبصرین اس طرز عمل کو مثبت رجحان کہہ کر یہ مؤقف پیش کرتے ہیں کہ اگر بھارت نے پھر آئی ایس آئی یا پاکستان کو حالات کا ذمہ دار قرار دیا ہوتا تو کشیدگی میں ایک بار پھر اضافہ ہو جاتا اور پاکستان کی مشکلات بڑھ جاتیں۔ بھارت اور پاکستان کے بہتر تعلقات کو بعض حلقے افغانستان میں قیام امن کیلئے بھی بہت ضروری سمجھ رہے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ خطے کے ممالک کو علاقائی تنازعات کے حل کیلئے امریکہ پر انحصار کرنے یا اس کی مخالفت کی بجائے آپس ہی میں پر اعتماد دوطرفہ تعلقات قائم کرنا ہوں گے۔ تاہم بعض مبصرین کا کہنا ہے کہ چین اور ایران کا اس حوالے سے کوئی کردار امریکہ کیلئے قطعاً قابل قبول نہیں ہوگا اور یہی وجہ ہے کہ فی الحال اس ضروری آپشن پر کوئی سنجیدہ غور نہیں ہو رہا ہے۔

نیٹو کی سپلائی لائن کو لاحق خطرات

ستمبر 2010ء کے آخری ہفتے کے دوران نیٹو کی جانب سے کرم ایجنسی پر چار ہیلی کاپٹر حملوں میں چار ایف سی اہلکاروں سمیت تقریباً 50 افراد کی ہلاکت کے واقعات نے امریکہ اور پاکستان کی حکومتوں کے درمیان کشیدگی کی ایک ایسی بنیاد رکھ دی کہ پاکستان کو احتجاج کے طور پر نیٹو افواج کو پاکستان کے راستے جانے والی سپلائی روکنے کا انتہائی اقدام اٹھانا پڑا۔ پاکستان کی حکومت، فوج اور سیاست دانوں نے ہیلی کاپٹر حملوں پر شدید ردِعمل کا اظہار کرتے ہوئے خدشہ ظاہر کیا کہ اگر ان حملوں پر روایتی خاموشی اختیار کی گئی تو ڈرون حملوں کی طرح نیٹو فورسز کی یہ جارحیت بھی معمول کی کارروائیوں میں تبدیل ہو جائے گی اور اس کے باعث پاکستان کی نہ صرف یہ کہ عالمی برادری میں سبکی ہوگی بلکہ اس کی سلامتی بھی خطرے سے دوچار ہو جائے گی۔ پاکستانی فوج کی اعلیٰ قیادت کا ردِعمل اتنا سخت تھا کہ جنرل پیٹریاس (اس وقت ایساف فورسز کے سربراہ تھے) کو آرمی چیف جنرل کیانی کو ٹیلی فون کرنا پڑا جبکہ آنجہانی رچرڈ ہالبروک نے ان واقعات پر باضابطہ طور پر اظہار افسوس بھی کیا۔ یہ پاکستانی ردعمل ہی کا نتیجہ تھا کہ امریکہ کو تحقیقاتی کمیٹی کے قیام کا بھی اعلان کرنا پڑا، جبکہ اُس وقت پاکستان کے وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی نے پانچ اکتوبر کو برسلز میں نیٹو کے سربراہ اور دوسرے حکام سے ملاقات کی اور ان پر واضح کیا کہ اگر اس قسم کے حملوں کی روک تھام نہ کی گئی تو اس سے پاکستان میں شدید ردعمل سامنے آئے گا اور امریکیوں کے علاوہ حکومت پاکستان کی مشکلات میں بھی بے حد اضافہ ہوگا۔ پاکستانی حکومت نے نیٹو کی سپلائی کے سب سے اہم روٹ طورخم بارڈر پر کئی روز تک سپلائی روکے رکھی، جس کے باعث سینکڑوں گاڑیاں وہاں پر پھنس گئیں اور بالآخر نیٹو کو صورتحال کی سنگینی کا احساس کرنا پڑا۔

حکومت پاکستان کا یہ مؤقف رہا کہ سپلائی کی معطلی کا اقدام حفاظتی بندوبست کے طور پر اٹھایا گیا ہے کیونکہ خدشہ ہے کہ اگر سپلائی جاری رہی تو امریکہ مخالف عناصر گاڑیوں اور ٹینکرز پر حملے کر کے صورتحال کی مزید خرابی کا باعث بنیں گے۔ حکومت پاکستان کے سخت مؤقف اور اس قسم کے انتہائی اقدام کے باوجود نیٹو کنٹینرز کو نامعلوم افراد کی جانب سے تین بار حملوں کا نشانہ بنایا

گیا۔ کراچی سے چمن جانے والے ایک کانوائے پر فائرنگ کی گئی اور چمن بارڈر پر بعض گاڑیوں کو بھی نشانہ بنایا گیا۔ اسی طرح شکارپور میں متعدد آئل ٹینکرز کو بھی فائرنگ کر کے آگ لگا دی گئی جس سے کروڑوں روپے مالیت کے کنٹینرز جل کر خاکستر ہو گئے اور تیل ضائع ہو گیا۔ یہ سلسلہ یہاں نہیں رکا بلکہ پانچ اکتوبر کی شب اسلام آباد کے نواح میں ایک اور حملہ کیا گیا جس میں 6 فراد جاں بحق جبکہ تقریباً 20 نیٹو ٹینکر تباہ ہو گئے۔ یہ حملہ اس قدر شدید تھا کہ چھ گھنٹوں تک ٹینکرز سے آگ اٹھتی رہی اور اس پر قابو پانا ممکن نہ رہا۔ اسی رات کو وزیر داخلہ نے انکوائری کا حکم دے دیا تاہم ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ گاڑیوں اور سامان کی حفاظت کی ذمہ داری کنٹریکٹرز کی ہے، حکومت کی نہیں۔ اس صورتحال نے دونوں ممالک یعنی امریکہ اور پاکستان کے درمیان عرصہ دراز کے بعد شدید قسم کے اختلافات اور بدگمانیاں پیدا کیں۔

نیٹو افواج کی 60 فیصد سپلائی پاکستان سے جاتی ہے، اور اس مقصد کیلئے طورخم اور چمن کے بارڈرز استعمال کئے جا رہے ہیں۔ جب بھی سپلائی کا سلسلہ معطل ہوتا ہے، نیٹو کی تشویش اور مشکلات بڑھ جاتی ہیں۔ اگرچہ نیٹو نے تاجکستان کے راستے ایک متبادل روٹ بھی قائم کر رکھا ہے، تاہم مسئلہ یہ ہے کہ اس روٹ پر اخراجات بہت زیادہ آتے ہیں جبکہ پاکستانی روٹ اس کے مقابلے میں خاصا سستا ہے۔ پاکستان کو ایک معاہدے کے تحت اس سپلائی لائن کے استعمال کیلئے مخصوص رقم بھی راہداری کی مد میں ادا کی جا رہی ہے، تاہم مشاہدے میں آیا ہے کہ مختص کردہ رقم اس سے خاصی کم ہے جو کہ امریکہ عراق میں سپلائی کے لیے ترکی کو ادا کر رہا تھا۔ پاکستان اور امریکہ کے درمیان یہ معاہدہ 2002ء میں جنرل مشرف کے دور میں کیا گیا تھا۔ یہاں یہ اَمر قابل ذکر ہے کہ 2006ء تک یہ سپلائی کراچی کی بندرگاہوں سے براہ راست جاتی تھی اور اس مقصد کیلئے کنٹینرز کے علاوہ پاکستان ریلوے سے استفادہ حاصل کیا جاتا تھا، تاہم 2007ء میں جنرل (ر) مشرف نے اپنے چند رشتہ داروں اور دوستوں کو نوازنے کیلئے اس کیلئے ٹھیکیداری نظام وضع کیا جس کے تحت یہ تمام اشیاء مذکورہ کنٹریکٹرز پاکستان سے گزار کر افغانستان بھیجنے کے پابند تھے۔ نئے فارمولے کے تحت 2007ء کے آخر میں پشاور میں رنگ روڈ پر دس ٹرمینل قائم کئے گئے۔ ان ٹرمینلز کے ذریعے روزانہ ساٹھ سے دو سو تک گاڑیاں لوڈ ہو کر افغانستان جاتی تھیں اور اس کاروبار سے ٹرانسپورٹرز کی بڑی تعداد وابستہ ہو گئی، ان میں اکثریت قبائلیوں کی تھی۔ باعث حیرت اَمر یہ ہے کہ اس وقت خیبر

پختونخوا میں ایم ایم اے کی حکومت تھی، تاہم ایم ایم اے کے رہنماؤں نے اس طریقۂ کار پر احتجاج کرنے کی بجائے مصلحتاً خاموشی اختیار کرلی۔

2008ء کے انتخابات کے بعد پشاور کے ٹرمینلز پر حملوں کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ نئی صوبائی حکومت ہل کر رہ گئی۔ دسمبر 2008ء سے فروری 2009ء تک پشاور کے ٹرمینلز پر ایک محتاط اندازے کے مطابق 45 حملے کیے گئے، جن کے نتیجے میں 300 کے لگ بھگ کنٹینرز اور دوسری گاڑیوں کو تباہ کیا گیا جبکہ ان واقعات میں 30 افراد بھی ہلاک ہو گئے۔ چنانچہ اس وقت پشاور پولیس نے اعلیٰ سطحی احکامات کے بعد سخت کارروائی شروع کی اور یوں دسمبر 2008ء کے دوران حیات آباد سے ہجرت خان نامی ایک افغانی کی گرفتاری بھی عمل میں لائی گئی۔ تحقیقات کے بعد پتہ چلا کہ اس کا اصلی نام مصطفیٰ ہجرت ہے اور وہ طالبان کے دور حکومت میں صوبہ ننگرہار کے ایک علاقے کا کمانڈر رہ چکا ہے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ اس کو طالبان کی قیادت نے 2002ء میں چمن بارڈر پر نیٹو کی سپلائی لائن پر حملوں کی ذمہ داری دی تھی، وہاں اس نے متعدد حملے کیے اور جب طورخم بارڈر پر سپلائی بڑھ گئی تو موصوف کو پشاور بھیج دیا گیا۔ پشاور کے ٹرمینلز پر حملوں کی منصوبہ بندی اس کے ذمہ تھی اور اس کے لیے اسے خیبر ایجنسی اور ایف آر پشاور کے ان عناصر کی حمایت حاصل تھی جو کہ محدود پیمانے پر فورسز کے خلاف برسرپیکار تھے جبکہ درہ آدم خیل سے بھی اس کو افرادی قوت مہیا کی جاتی تھی۔ حملوں کا یہ سلسلہ محض پشاور تک محدود نہیں رہا بلکہ اٹک، ترنول، میانوالی، خضدار، کوئٹہ اور چمن بارڈر پر نیٹو کے ساتھ کام کرنے والے متعلقہ اداروں اور ٹرانسپورٹرز کو نشانہ بنایا گیا۔ 2009ء کے دوران کراچی اور سندھ کے بعض دوسرے علاقوں میں بھی ٹینکرز کو نشانہ بنایا گیا۔ 2008-09ء کے دوران جب پشاور کے ٹرمینلز پر حملوں کی شدت نے صوبائی حکومت کی پریشانی میں اضافہ کر دیا تو حکومت نے اس سلسلے کو محدود بلکہ عملاً ختم کر دیا، جس کے بعد ترنول، اٹک اور اسلام آباد میں ٹرمینلز کے قیام کے انتظامات کیے گئے تاہم وہاں پر بھی وقتاً فوقتاً حملے ہوتے رہے، لیکن ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ حکومت نے ہیلی کاپٹر حملوں کے بعد ریاستی پالیسی کے طور پر طورخم کے راستے نیٹو کی سپلائی روک دی، جس کے باعث امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو مسئلے کی شدت کا پہلی بار احساس ہوا۔ دفاعی ماہرین کے مطابق ہیلی کاپٹر حملوں اور سپلائی لائن کی بندش جیسے واقعات نے امریکہ اور پاکستان کے دوطرفہ تعلقات میں دراڑ پیدا کی اور یہ صورتحال کسی بھی وقت بدترین کشیدگی میں تبدیل ہو سکتی ہے۔

کیا اب شمالی وزیرستان کی باری ہے؟

سیاسی اور دفاعی مبصرین کے مطابق امریکہ اور پاکستان کے درمیان فاٹا میں مبینہ طور پر موجود غیر ملکی انتہا پسند قوتوں کی موجودگی کے معاملے پر اختلافات اب اندرون خانہ کشیدگی کی صورت اختیار کر گئے ہیں اور فریقین اس اہم ایشو پر اپنے اپنے مفادات کے تناظر میں فیصلہ کن اقدامات کی سفارتی اور عسکری کوششیں کر رہے ہیں۔ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کا دعویٰ ہے کہ شمالی وزیرستان میں موجود عسکریت پسند نہ صرف یہ کہ افغانستان میں نیٹو فورسز پر حملے کر رہے ہیں بلکہ یہ لوگ ایک مستقل پالیسی کے تحت دنیا بھر کے ان انتہا پسند عناصر کو تربیت بھی دے رہے ہیں جو کہ امریکہ اور یورپ سے بوجوہ ناراض ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ عسکری تربیت لے کر جب اور جہاں بھی ممکن ہو، امریکی مفادات کو نقصان پہنچا سکیں۔ امریکہ کا ایک بڑا الزام یہ بھی ہے کہ پاکستانی ریاست ان عسکریت پسندوں کے خلاف آپریشن کر رہی ہے جو کہ صرف پاکستان کے اندر گڑبڑ پھیلانے کا سبب بن رہے ہیں جبکہ پاکستان ان عناصر کے ساتھ نرمی برت رہا ہے جو کہ افغانستان میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں پر حملے کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں امریکہ حقانی گروپ اور القاعدہ کا نام لے کر ان کے خاتمے کے لئے مسلسل دباؤ ڈالتا آیا ہے۔ دوسری طرف پاکستان کا مؤقف ہے کہ اگر پاکستان کے قبائلی علاقوں سے حملہ آور افغانستان میں داخل ہو رہے ہیں یا حملوں کے بعد وہ پاکستان میں پناہ لیتے ہیں تو انہیں ایسا کرنے سے روکنا نیٹو، امریکی اور افغان فورسز کا کام ہے، کیونکہ پاکستان کے لئے اتنی طویل اور پیچیدہ سرحد کی نگرانی کرنا ممکن نہیں ہے۔ عرصہ دراز سے دونوں ممالک اپنے اپنے مؤقف پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ پاکستان کا ایک اور موقف یہ بھی ہے کہ اسے القاعدہ اور اس کے اتحادیوں سے شدید خطرات لاحق ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ پاکستانی فورسز جب بھی سوات یا ایسے کسی دوسرے پاکستانی علاقے میں کارروائی کرتی ہیں تو ردِعمل میں حملہ آور پاکستان کے دوسرے علاقوں اور شہروں پر حملے کرنا شروع کر دیتے ہیں، جس سے ملک کا انتظامی و دفاعی ڈھانچہ ہل کر رہ جاتا ہے۔

پاکستان میں ایسے حلقوں کی بھی کوئی کمی نہیں ہے جن کا مؤقف ہے کہ حملہ آور تنظیمیں

پاکستانی ریاست کو اس لئے نشانہ بنا رہی ہیں کہ یہ ملک امریکہ کا فرنٹ لائن اتحادی بن کر افغانستان اور خطے میں امریکی مفادات کی جنگ لڑ رہا ہے اور یہ کہ ان عسکریت پسند تنظیموں کے خلاف کارروائی کر رہا ہے جو کہ افغانستان کو غیر ملکی تسلط سے آزاد کرانے کی جدوجہد کر رہی ہیں۔ ان حلقوں کا یہ کہنا ہے کہ اگر پاکستان 'دہشت گردی کے خلاف جنگ' میں امریکی اتحاد سے الگ ہو جاتا ہے تو اس کے اندرونی حالات پرامن ہو جائیں گے، تاہم ریاستی حکام کا کہنا ہے کہ پاکستان کے لئے اس عالمی اتحاد سے الگ ہونا یا مزاحمت کا راستہ اختیار کرنا ممکن نہیں ہے۔ غیر جانبدار مبصرین کی نظر میں امریکہ اور پاکستان ایک دوسرے پر انحصار کرنے کے باوجود بعض ایشوز پر اس ہم آہنگی اور اعتماد سازی کا اظہار نہیں کر رہے جس کی ضرورت ہے اور یہی وجہ ہے کہ فریقین ایک دوسرے کا اتحادی ہونے کے باوجود بعض مواقع پر ایک دوسرے کے ساتھ ڈبل یا ٹرپل گیم کا فارمولہ اپنانے سے گریز نہیں کرتے۔ امریکہ کا ابتداء سے ہی یہ مطالبہ تھا کہ پاکستانی فورسز جنوبی وزیرستان کے ساتھ ساتھ شمالی وزیرستان میں بھی کارروائی کریں اور اس ضمن میں امریکی یہ دلیل دیتے رہے کہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں القاعدہ سمیت دوسری عسکریت پسند تنظیمیں پناہ کے لئے شمالی وزیرستان میں جمع ہو جائیں گی۔ دوسری طرف پاکستان کا مؤقف تھا کہ فورسز کے لئے بیک وقت دو یا اس سے زائد مقامات یا علاقوں میں کارروائی کرنا ممکن نہیں ہے اور اس سلسلے میں وسائل کی کمی کا بہانہ بھی بنایا جاتا رہا۔ امریکہ کے اس مؤقف کو بعض دوسرے حلقوں کے علاوہ حکومت کی دو اتحادی جماعتوں یعنی اے این پی اور ایم کیو ایم کی تائید بھی حاصل رہی، بلکہ اے این پی کا مسلسل یہی مطالبہ رہا کہ جب تک تمام قبائلی ایجنسیوں سے انتہا پسندوں کا مکمل خاتمہ نہیں کیا جاتا، مخصوص علاقوں میں فوجی کارروائیوں کے نتائج اپنے اثرات کے حوالے سے نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوں گے۔ اے این پی تو پشاور سے ملحقہ خیبر ایجنسی میں بھی فوجی آپریشن کا مطالبہ کرتی رہی ہے تاہم عسکری قیادت بوجوہ شمالی وزیرستان اور بعض دوسرے علاقوں میں مکمل فوجی آپریشن سے گریز کرتی رہی۔ 2009ء اور 2010ء کے دوران جب پاکستانی فوج نے سوات کے بعد اگلے مرحلے کے طور پر جنوبی وزیرستان میں آپریشن کا آغاز کیا تو امریکہ اور اے این پی کی طرف سے یہ کہا جانے لگا کہ عسکریت پسند قیادت شمالی وزیرستان منتقل ہو گئی ہے۔ اس نشاندہی کے باوجود جب

فورسز شمالی وزیرستان میں فوجی کارروائی سے گریز کرتی دکھائی دیں تو امریکہ نے ردعمل کے طور پر 2010ء کے دوران شمالی وزیرستان کو ڈرون حملوں کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ ان حملوں کے دوران جب بھی کسی غیر ملکی کو نشانہ بنایا گیا، امریکہ کا مؤقف مزید سخت ہو گیا جبکہ تحریک طالبان پاکستان کے متعدد اہم رہنماؤں کی ہلاکتوں سے بھی پاکستان کا مؤقف کمزور ہوا۔ تحریکِ طالبان پاکستان کے امیر بیت اللہ محسود سمیت متعدد دوسرے عسکریت پسند کمانڈر بھی ان ڈرون حملوں کا نشانہ بنے، جبکہ استاد فدائین قاری حسین بھی ایسے ہی ایک ڈرون حملے کا نشانہ بنا۔

2010ء کے وسط میں امریکہ کا پاکستان پر دباؤ اور بھی بڑھنے لگا اور یہاں تک کہا جانے لگا کہ اگر پاکستان ان ٹھکانوں کے خاتمے کے لئے آپریشن نہیں کرتا تو امریکہ اور نیٹو خود کارروائی کریں گے۔ دوسری طرف افغان صدر حامد کرزئی کو کئی مواقع پر یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ اگر امریکہ افغانستان میں اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے پاکستان میں ان ٹھکانوں کو ختم کرنا ہوگا جو کہ القاعدہ اور اس کے اتحادیوں کے زیر استعمال ہیں اور جہاں سے افغانستان پر حملے ہو رہے ہیں۔ اس صورتحال کو سہ فریقی اتحاد کے اعلیٰ سطحی اجلاسوں کے علاوہ 2010ء کے وسط میں پاک امریکہ، سٹریٹیجک ڈائیلاگ کے دوران بھی ایک اہم ایشو کے طور پر زیر بحث لایا گیا۔ امریکہ پاکستان کی حکومتی اور سیاسی قیادت پر بھی مسلسل زور دیتا رہا کہ جب تک فاٹا خصوصاً شمالی وزیرستان میں عسکریت پسند گروہ فعال ہیں، افغانستان کے حالات میں بہتری نہیں آئے گی اور مجبوراً امریکہ اور نیٹو کو سخت مؤقف اختیار کرنا پڑے گا، تاہم پاکستان کی عسکری قیادت تمام تر امریکی دباؤ اور بعض پاکستانی سیاستدانوں کی خواہش کے باوجود شمالی وزیرستان میں آپریشن سے گریز کی پالیسی اپنائی۔ عسکری قیادت نے اگر اس معاملے پر کہیں پر کوئی لچک دکھا کر معاونت کی حکمت عملی اپنائے رکھی تو وہ ڈرون حملوں کی اجازت تھی، کیونکہ اس طرح پاکستان اپنی فورسز کی قربانی اور دفاعی بجٹ کی مد میں نقصان اٹھانے سے بچ رہا تھا اور اس کے بعض مقاصد بھی پورے ہو رہے تھے۔

ستمبر 2010ء میں پاکستان کی مسلح افواج نے حکومت سے ایک ایسے وقت میں ایک بڑی رقم کا تقاضا کر دیا جبکہ ملک کے چاروں صوبے سیلاب کی تباہ کاریوں کی زد میں تھے اور حکومت کو دیگر ممالک اور خصوصاً امریکہ کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑ رہے تھے۔ حکومت نے فوج کو پارلیمنٹ کی

اجازت یا بحث کے بغیر 110 ارب روپے دینے کا اقدام اٹھایا، جس پر برسرِ اقتدار جماعت پیپلز پارٹی کی ایک اہم رہنما شیری رحمان نے پارلیمنٹ میں آواز بھی اٹھائی، تاہم حکومت کا مؤقف تھا کہ وہ نامساعد حالات کے باوجود عسکری اداروں کی ضروریات پر کوئی سمجھوتہ نہیں کرے گی۔ بعدازاں ایک بار پھر امریکہ پر دباؤ ڈالا جانے لگا کہ ملک کی معیشت فوجی کارروائیوں کے باعث بہت زیادہ متاثر ہو رہی ہے، اس لئے اگر امریکہ مزید کسی تعاون کا تقاضا کرتا ہے تو اسے پاکستان کی غیر معمولی امداد کرنا ہوگی۔ اکتوبر کے وسط میں پاک فوج کے سربراہ جنرل اشفاق کیانی پاک امریکہ سٹرٹیجک ڈائیلاگ کے لئے واشنگٹن گئے تو شمالی وزیرستان کے معاملے کو ایک بار پھر اٹھایا گیا۔ جنرل کیانی نے دوسری رکاوٹوں کے علاوہ جب مالی وسائل کی کمی کا معاملہ اٹھایا تو امریکہ پاکستان کو دو ارب ڈالرز کی امداد دینے پر آمادہ ہوگیا، جس کے بعد بعض حلقوں کی جانب سے اس طرح کے مثبت اشارے ملنا شروع ہوگئے کہ پاکستانی فورسز ملکی مفاد کے تناظر میں شمالی وزیرستان میں آپریشن لانچ کر سکتی ہیں۔ اس وقت کے وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی نے بھی ایک بیان جاری کیا کہ شمالی وزیرستان میں آپریشن کا آغاز کیا جا سکتا ہے، تاہم ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ یہ کارروائی کسی اور کے کہنے پر نہیں کی جا رہی۔ اس تمام صورتحال کا جو خاکہ اور خلاصہ بنتا ہوا دکھائی دے رہا ہے، وہ کچھ یوں ہے کہ پاکستان کی حکومتی اور عسکری قیادت شمالی وزیرستان میں آپریشن کے اس فیصلے پر آخرکار راضی ہوگئی ہے، جس پر پاکستان اور امریکہ کی طویل عرصے سے کشیدگی چلی آ رہی تھی۔ مبصرین اگرچہ اس متوقع کارروائی کو امریکی دباؤ کے علاوہ پاکستان کے اپنے مفاد میں بھی درست قرار دے رہے ہیں، تاہم ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ آپریشن کے ردعمل میں ملک بھر میں فعال عسکریت پسند ایک فیصلہ کن کارروائی کرتے ہوئے دہشت گردی کی شدید کارروائیاں کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، کیونکہ ان کے لئے شمالی وزیرستان کا مورچہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔

کرم ایجنسی میں تشدد کا پسِ منظر

فاٹا کی کرم ایجنسی میں سب سے پہلے شیعہ اور سنی آبادیوں کے درمیان فرقہ ورانہ فسادات شروع ہوئے۔ اس قبائلی ایجنسی کی سرحدیں افغانستان کے جن صوبوں سے ملتی ہیں، ان میں گردیز، خوست، پکتیا اور ننگر ہار جیسے وہ صوبے بھی شامل ہیں جو کہ 80 کی دہائی سے اب تک جہادی تنظیموں کے اہم اور مستقل مراکز رہے ہیں اور یہ صوبے القاعدہ اور اس کے دوسرے اتحادیوں کے لئے بھی انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کے ساتھ ہی کرم ایجنسی کی سرحدیں وزیرستان، اورکزئی اور خیبر کی قبائلی ایجنسیوں کے ساتھ بھی ملتی ہیں، اس لئے اس قبائلی ایجنسی کو جغرافیائی طور پر مختلف ریاستی اور غیر ریاستی متحارب قوتوں کے لئے بیس کیمپ کی حیثیت سے انتہائی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اسی وجہ سے یہ علاقہ اسّی کی دہائی سے اب تک کبھی پر امن نہیں رہا۔ 80 کی دہائی میں جب سی آئی اے اور آئی ایس آئی کے ذریعے مہاجرین کو تربیت کے لئے افغانستان سے پاکستان لانے کا سلسلہ شروع کیا گیا تو وزیرستان کی دونوں ایجنسیوں کے بعد کرم ہی وہ تیسری ایجنسی تھی جہاں پر انہیں بڑی تعداد میں بسایا گیا اور یہاں پر ایک سے زائد تربیتی کیمپ بھی قائم کئے گئے۔ دوسری ملحقہ ایجنسیوں سے بھی عسکریت پسند کرم ایجنسی کے راستے ہی افغانستان جایا کرتے تھے۔ کرم ایجنسی اپنی جغرافیائی ساخت کے لحاظ سے ایک ایسے مقام پر ہے، جہاں سے اطراف کے انتہائی اہم، آسان اور محفوظ راستوں کو بوقت ضرورت زیر استعمال لایا جا سکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ ایجنسی باقی قبائلی علاقوں کے مقابلے میں بہت پہلے متحارب قوتوں کی محاذ آرائی کا مرکز بن گیا۔ 1987ء کے دوران یہاں پر سنی اور شیعہ آبادی کے درمیان فرقہ ورانہ کشیدگی کا آغاز ہوا اور یہ کشیدگی اس تمام عرصہ کے دوران کسی بڑے وقفے کے بغیر جاری رہی ہے۔ 1987ء سے قبل 80-1979ء کے دوران بھی فریقین کے درمیان جھڑپیں ہوئی تھیں۔ اس زمانے میں انقلاب ایران کے بعد جب شیعہ آبادی نے اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں تو سنی آبادی نے اس پر رد عمل ظاہر کیا اور یوں یہ علاقہ مستقل کشیدگی کی زد میں آ گیا۔

افغان جہاد کے دوران افغانستان کی مختلف جہادی تنظیمیں اپنے اپنے حامیوں کی حمایت

کرتی رہیں، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ علاقہ مسلکی تقسیم اور تصادم کا اکھاڑا بن گیا اور فریقین اپنے خارجی حامیوں کی مدد سے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے رہے۔ یہ نکتہ انتہائی اہم ہے کہ پاکستان کی شیعہ آبادی کا تقریباً 20 فیصد حصہ کرم ایجنسی اور اس کے مضافات میں رہائش پذیر ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس ایجنسی کو بار بار کیونکر نشانہ بنایا جاتا رہا ہے۔ اس علاقے میں منگل اور طوری جبکہ بنگش اور ملیل خیل قبائل مختلف ادوار میں ایک دوسرے کے خلاف کئی کئی ہفتوں اور مہینوں تک برسر پیکار رہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق گزشتہ ایک دہائی کے دوران اس قبائلی ایجنسی میں فریقین کے چار سے پانچ ہزار تک لوگ ہلاک ہو چکے ہیں۔ اگر ان ہلاکتوں کا تجزیہ اور موزانہ کیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ پاکستان میں شیعہ اور سنی آبادی کی سب سے زیادہ ہلاکتیں کرم ایجنسی ہی میں ہوئی ہیں اور یہ سلسلہ متعدد معاہدوں کے باوجود تاحال جاری ہے۔ 3380 مربع کلومیٹر پر محیط کرم ایجنسی کی کل آبادی 1998ء کی مردم شماری کے مطابق 448310 ہے، یعنی ایک کلومیٹر میں اوسطاً 133 افراد رہائش پذیر ہیں۔ اتنی کم آبادی کے باوجود اس ایجنسی میں فریقین کے درمیان اب تک 300 سے زائد بار جھڑپیں ہوئی ہیں۔ ان جھڑپوں میں ایک رپورٹ کے مطابق 50 سے زائد گاؤں اور سینکڑوں گھروں کو مارٹر گولوں کے ذریعے تباہ یا مسمار کر دیا گیا ہے، جبکہ لشکر کشی کے باعث درجنوں گاؤں نذر آتش بھی کیے جا چکے ہیں۔ اگر کرم ایجنسی کو ایک مستقل میدان جنگ کا نام دیا جائے تو غلط نہیں ہوگا کیونکہ گزشتہ تین دہائیوں کے دوران یہ خوبصورت علاقہ کبھی پرامن نہیں رہا۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ کرم دوسری قبائلی ایجنسیوں کے مقابلے میں شرح خواندگی، روزگار اور قدرتی وسائل کے اعتبار سے انتہائی بہتر ہے، تاہم امن و امان کی بدترین صورتحال نے یہاں کے باسیوں کو بڑی تعداد میں دوسرے علاقوں خصوصاً بڑے شہروں کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ حتیٰ کہ 2008ء میں یہاں کے ایک گاؤں کے باسیوں نے امن و امان کے حالات اور دہشت گرد حملوں سے تنگ آ کر اپنے گھروں پر امریکی اور افغان پرچم لہرا دیئے تھے، جنہیں بعد ازاں جرگہ اور پولیٹیکل حکام کے کہنے پر ہٹا دیا گیا۔

یہ ایجنسی اسلام آباد سے تین سو جبکہ جلال آباد سے محض اسی، نوے کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ 80ء سے اب تک یہ ایجنسی ایک معروف گزرگاہ کے طور پر عام لوگوں

کے علاوہ گوریلا حملہ آوروں کے لئے بھی انتہائی اہم رہی ہے۔ اسی اہمیت کا نتیجہ ہے کہ کوئی بھی جہادی تنظیم اس علاقے سے لاتعلق نہیں رہی اور ان کی ہر دور میں کوشش رہی کہ کرم ایجنسی کے حالات ہر صورت اور ہر قیمت پر عدم استحکام اور شورش کا شکار رہیں۔ کرم ایجنسی سے وزیرستان کی دونوں ایجنسیاں بہت کم فاصلے پر واقع ہیں، جبکہ یہ شمالی و جنوبی وزیرستان، اورکزئی اور خیبر کے درمیان راہگزر بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ایجنسی عسکریت پسندوں کی آمدورفت کا مرکز رہی۔

2007ء کے دوران جب بیت اللہ محسود کی سربراہی میں تحریک طالبان پاکستان کی بنیاد رکھی گئی تو تحریکِ طالبان پاکستان نے وزیرستان کی دونوں ایجنسیوں کے بعد جس علاقے پر زیادہ توجہ دی، وہ کرم ایجنسی تھی۔ یہاں تک کہ یہ ایجنسی تنظیمی طور پر قاری حسین، حکیم اللہ محسود اور طارق آفریدی جیسے انتہائی اہم طالبان کمانڈروں کی زیرِ قیادت رہی۔ تحریکِ طالبان سے قبل یہاں کی سنی آبادی کو حقانی نیٹ ورک کی سرپرستی حاصل رہی اور اب بھی حقانی نیٹ ورک کو اس علاقے کے بعض سنی گروہوں کی معاونت حاصل ہے۔ یہی وجہ تھی کہ 17 نومبر 2007ء کو یہاں پر تحریکِ طالبان پاکستان کے قیام کے بعد فریقین کے درمیان ایک خونریز لڑائی لڑی گئی، جس کے نتیجہ میں 102 افراد جاں بحق اور 200 سے زائد زخمی ہوگئے۔ اس لڑائی کے دوران 11 سکیورٹی اہلکار بھی لقمہ اجل بن گئے، تاہم حکومت اور عسکری قیادت نے اس ردعمل اور حکمت عملی کا مظاہرہ نہیں کیا، جس کی لوگ توقع کر رہے تھے۔ اس سے قبل اپریل 2007ء کے دوران بھی ایک خونریز جھڑپ کے دوران 55 قبائلی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ ان جھڑپوں میں جدید ترین اسلحہ استعمال کیا گیا۔ ایک رپورٹ کے مطابق 25 دسمبر 2007ء کو ہونے والی ایک جھڑپ میں تحریکِ طالبان پاکستان بھی شریک ہوئی اور اس کے دو اہم کمانڈروں حکیم اللہ اور قاری حسین نے اس کی براہ راست نگرانی کی۔ اس لڑائی میں شرکت کرنے کے لئے 200 محسود طالبان وزیرستان سے کرم آئے۔ ابتدائی دو دنوں کی لڑائی میں 50 سے زائد لوگ جاں بحق ہوگئے جبکہ درجنوں گھروں، دکانوں اور مارکیٹوں کو مارٹر گولوں سے نشانہ بنایا گیا۔ اس موقع پر فورسز اور مقامی لشکر کی ایک کارروائی میں وزیرستان سے آنے والے 13 طالبان کی ہلاکتوں کی اطلاعات بھی موصول ہوئیں، جس کے بعد تحریکِ طالبان اور بھی متحرک ہوئی۔ یہ اَمر قابل ذکر ہے کہ کرم ایجنسی پاکستان کا وہ

واحد علاقہ ہے جہاں پر شیعہ تنظیموں نے دو تین مسلح تنظیمیں قائم کر رکھی ہیں۔ ان کے نام مہدی ملیشیا' حیدری طالبان اور کرم حزب اللہ ہیں۔ ابتداء میں جو کمانڈر ان کی قیادت کرتے رہے، ان کے نام حسین علی شاہ اور عابد حسین ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق ان تین تنظیموں کے مسلح رضا کاروں کی تعداد آٹھ سے دس ہزار تک ہے اور ان کو افغانستان کی بعض شیعہ جماعتوں کے علاوہ ایران کی حمایت بھی حاصل ہے۔ سنی لشکر کے علاوہ تحریکِ طالبان پاکستان کے بعض کمانڈر الزام لگاتے ہیں کہ افغانستان اور ایران کی بعض بااثر قوتیں کرم ایجنسی کو تحریک طالبان اور دوسری سنی تنظیموں کے خلاف اپنے ایک مضبوط مرکز کے طور پر استعمال کرتی آئی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ردِ عمل کے طور پر سنی آبادی یا تحریکِ طالبان جیسی قوتیں اس صورتحال سے خود کو لاتعلق نہیں رکھ سکیں۔

2007-08ء میں تحریکِ طالبان کے جو کمانڈر مسلح کارروائیوں کی نگرانی کر رہے تھے، ان میں فقیر عالم محسود اور ملا نور جمال المعروف ملا طوفان نمایاں تھے۔ فقیر عالم محسود کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے ہاتھوں سے 100 سے زائد افراد کو ہلاک کیا تھا۔ 2009ء کے دوران ملا لانچر کے نام سے ایک اور طالب کمانڈر کا بھی بہت چرچا اور خوف رہا۔ وہ بندوق کی بجائے راکٹ لانچر سے مخالفین کو نشانہ بناتا تھا اور اسی نسبت سے اس کا نام ملا لانچر پڑ گیا۔ اسے پاکستانی فورسز نے یکم دسمبر 2009ء کو ایک آپریشن میں ہلاک کر دیا۔ اس کارروائی میں ہیلی کاپٹرز کے ایک دستے نے بھی حصہ لیا تھا۔ کرم ایجنسی میں فورسز کو بھی 20 سے زائد بار نشانہ بنایا گیا۔ 23 اگست 2010 کے روز ایک جرگہ پر خودکش حملہ کیا گیا جس میں تقریباً 12 افراد ہلاک ہوگئے۔ یہ وہی دن تھا جس روز وزیرستان کے علاقے وانا کے ایک مدرسے پر بھی خودکش حملہ کیا گیا تھا، جس میں سابق ایم این اے مولانا نور محمد سمیت 25 افراد ہلاک ہوگئے تھے۔ اس واقعہ کے تقریباً ایک ماہ بعد امریکی ہیلی کاپٹرز نے کرم ایجنسی کی ایک ایف سی چیک پوسٹ پر حملہ کر کے (26 دسمبر 2010) متعدد افراد کو نشانہ بنایا جس کے بعد پاکستان اور امریکہ کے تعلقات انتہائی کشیدہ ہوگئے اور پاکستان نے بطور احتجاج کئی ہفتوں تک نیٹو کی سپلائی لائن کو معطل کئے رکھا۔ فرقہ ورانہ کشیدگی صرف کرم ایجنسی تک محدود نہیں رہی بلکہ اس کے دو قریبی شہروں ہنگو اور کوہاٹ میں بھی دہشت گردی کی کارروائیاں ہوتی رہتی ہیں۔ کرم ایجنسی کے دو بڑے قصبوں یعنی صدہ اور پاڑا چنار میں اب تک

22 دہشت گرد حملے کیے گئے ہیں، جن میں متعدد خودکش بھی تھے۔ پانچ بار بس سٹینڈز کو جبکہ چھ بار جرگوں اور اجتماعات کو نشانہ بنایا گیا۔ 2008ء کے بعد کوہاٹ اور ہنگو کو بھی اس نوعیت کی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا۔ ان دوشہروں کو پشاور کے بعد سب سے زیادہ بار بم دھماکوں اور خودکش حملوں کا نشانہ بنایا گیا جبکہ 140 سے زائد اہم علماء، عمائدین اور افسروں کو ٹارگٹ کلنگ کے ذریعے ہلاک کیا گیا۔

اس تمام لڑائی کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ فریقین عام لوگوں کے ساتھ بھی کوئی رعایت نہیں برتتے۔ بیسیوں افراد کو گاڑیوں سے باہر نکال کر گولیاں ماردی گئیں۔ درجنوں امام بارگاہوں، درگاہوں اور مساجد کو نشانہ بنانے کے علاوہ انہیں نذر آتش کرنے سے بھی گریز نہیں کیا گیا، جبکہ سڑکوں، پلوں، ہسپتالوں اور سکولوں کو بھی بطور خاص نشانہ بنایا گیا۔ پشاور، پاڑہ چنار روڈ کو 2007-08ء کے بعد 18 بار بند کیا گیا ہے، جس کے باعث آمدورفت کا پورا نظام ہی ٹھپ ہو کر رہ گیا اور لوگ افغانستان کا طویل اور پیچیدہ راستہ اختیار کر کے پشاور اور دوسرے علاقوں تک پہنچتے رہے۔

حالات کی سنگینی کا اندازہ اس اَمر سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ پشاور پاڑہ چنار روڈ کو اڑھائی سال کے بعد کھولا گیا۔ دوسری جانب عسکریت پسندوں کی جانب سے متعدد افراد کو جاسوسی کے الزام میں سرعام پھانسیاں اور دوسری سخت سزائیں بھی دی گئی۔ بعض ذرائع کے مطابق خیبر ایجنسی کی دو عسکریت پسند تنظیمیں بھی کرم ایجنسی میں فعال اور متحرک ہیں۔ جنوری 2011ء کے آخری ہفتے کے دوران بعض قبائلی اراکینِ اسمبلی، سینیٹرز اور جرگہ عمائدین کے ذریعے فریقین کے درمیان جنگ بندی کے لئے کوششیں شروع ہوئیں۔ اس مقصد کے لئے بھوربن، اسلام آباد اور پشاور میں متعدد اجلاس منعقد ہوئے۔ طریقۂ کار کے مطابق 210 عمائدین پر مشتمل ایک جرگہ قائم کیا گیا، جس کی قیادت سابق ایم این اے وارث خان آفریدی کو سونپی گئی۔ اس جرگہ کو وفاقی حکومت کی براہ راست حمایت حاصل رہی بلکہ بعض اطلاعات کے مطابق جرگہ کی کامیابی کے لئے کروڑوں روپے کے غیر اعلانیہ فنڈز بھی فراہم کئے گئے۔ طویل مگر مستقل جرگوں کے بعد فریقین کو ایک معاہدے پر متفق کر لیا گیا۔ اس معاہدے پر فروری (2011ء) میں دستخط کئے گئے اور جن اہم شرائط کو معاہدے میں شامل کیا گیا، ان میں مرکزی شاہراہ کو ہر قسم کی آمدورفت کے لئے کھولنا، ایک

دوسرے پر حملے نہ کرنا، اغواء کی وارداتوں سے اجتناب کرنا اور متعلقہ علاقوں میں ایسے واقعات کا تدارک کرنا، املاک کو نقصان نہ پہنچانا، ایک دوسرے کے عقائد کا احترام کرنا اور سرکاری تنصیبات کو نقصان نہ پہنچانا شامل تھا۔ معاہدے کے دوران طے پایا کہ جو بھی فریق ان نکات کی خلاف ورزی کرے گا، اس پر دو کروڑ روپے جرمانہ عائد کیا جائے گا۔ اس معاہدے کے نتیجے میں وفاقی حکومت نے کرم ایجنسی کی تعمیرِ نو کے لئے ایک ارب روپے کے پیکج کا بھی اعلان کیا۔

اس معاہدے کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ 24 مارچ کو لوئر کرم کے ایک علاقہ بگن میں نامعلوم عسکریت پسندوں نے پشاور سے پاڑاچنار جانے والی تین بسوں پر حملہ کر کے 14 افراد کو ہلاک جبکہ 35 کو اغواء کر لیا۔ حملہ آور چھ خواتین اور سات بچوں کو بھی اغواء کر کے لے گئے، یہ تمام افراد شیعہ مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کا ردِعمل کچھ یوں سامنے آیا کہ ایک فریق اپنے علاقے میں پھر سے مورچہ زن ہونے لگا اور حالات انتہائی کشیدہ ہو گئے۔ حملہ آوروں نے مغویوں کے بدلے کوہاٹ اور پشاور کی جیلوں میں قید بعض اہم قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا، جس سے یہ خدشہ یقین میں بدل گیا کہ یہ کارروائی کسی منظّم عسکریت پسند تنظیم کی کارستانی ہے۔ دہشت گردی کی اس بدترین کارروائی سے محض ایک روز قبل 23 مارچ کو دوآبہ پولیس سٹیشن پر خودکش حملہ کیا گیا تھا جس میں 8 اہلکار جاں بحق اور 25 زخمی ہو گئے تھے جبکہ اسی دوران میٹرک کا امتحان دینے والے دس بچوں کو بھی اغواء کر لیا گیا تھا۔

کارروائیوں کا یہ سلسلہ یہاں نہیں رکا بلکہ ایک مسلح گروہ نے افغانستان سے کرم ایجنسی میں داخل ہونے والی ایک گاڑی کو 25 مارچ کو راکٹ لانچر سے نشانہ بنایا جس کے باعث چھ افراد جاں بحق ہو گئے۔ ان واقعات کے بعد پشاور پاڑہ چنار شاہراہ محض چند ہفتے بعد ایک بار پھر بند کر دی گئی جبکہ فریقین کے درمیان کشیدگی کا سلسلہ ایک بار پھر چل نکلا۔ متاثرہ فریق نے ان حملوں کا الزام طالبان پر لگایا جبکہ انہوں نے جرگہ اور حکومت کے ساتھ تعاون نہ کرنے اور سرکاری مراعات کے بائیکاٹ کا بھی اعلان کیا۔

جرگہ کے سربراہ وارث خان آفریدی اور اس کے ایک رُکن منیر خان اورکزئی نے ان واقعات کے بعد گورنر پختونخوا سے مداخلت کا مطالبہ کیا جبکہ متاثرہ فریق کا مؤقف ہے کہ وہ گورنر

سمیت کسی پر بھی اعتماد کرنے کو تیار نہیں ہے۔اس ڈیڈ لاک نے امن معاہدے کو کس پوزیشن پر لا کھڑا کیا ہے اور جرگہ نے اس صورتحال میں کیا کردار ادا کرنا ہے، اس کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اعتماد سازی کا ماحول بری طرح متاثر ہو گیا ہے۔ریاست بے بس نظر آ رہی ہے جبکہ حملہ آور کسی کی گرفت میں آتے ہیں اور نہ ہی وہ خود کو جرگہ، حکومت یا عوام کے سامنے جوابدہ تصور کرتے ہیں۔

غلطیاں دہرانے کا ریاستی سلسلہ

پشاور سے کچھ ہی فاصلے پر واقع مہمند ایجنسی میں منعقدہ امن جرگے پر چھ دسمبر (2010ء) کے روز کیے گئے دو خودکش حملوں میں 45 افراد ہلاک جبکہ 100 زخمی ہو گئے۔ اس افسوسناک سانحہ سے یہ بات ایک بار پھر ثابت ہوگئی کہ عسکریت پسندان لوگوں کے ساتھ کسی قسم کی نرمی یا رعایت برتنے پر تیار نہیں ہیں جو کہ حکومت اور سکیورٹی فورسز کی حمایت کرتے ہیں یا عسکریت پسندوں کے مقابل مزاحم ہوتے ہیں۔ یہ واقعہ جس روز وقوع پذیر ہوا، اسی روز کور کمانڈر پشاور نے میڈیا کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے دعویٰ کیا تھا کہ 85 فیصد قبائلی علاقوں میں امن قائم ہو گیا ہے اور فوج عسکریت پسندوں سے نمٹنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ اُمر قابلِ غور ہے کہ اس دعوے سے محض ایک روز قبل معروف قصبے لنڈی کوتل کے بازار میں موبائل فونز کی ایک مارکیٹ کو بم دھماکے کا نشانہ بنا کر تباہ کر دیا گیا اور یہ دھمکی دی گئی تھی کہ ان بازاروں پر مزید حملے کیے جائیں گے جہاں سے فحاشی پھیلائی جا رہی ہے۔ 5 دسمبر کے روز ہی سوات کے علاقے خوزہ خیلہ میں جھڑپ کے دوران چار عسکریت پسندوں کو ہلاک کر دیا گیا تھا، جبکہ چھ دسمبر کے روز سوات ہی میں سرچ آپریشن کے دوران متعدد مطلوب افراد کی گرفتاری اور کانجو سے بڑی مقدار میں بارودی مواد کی برآمدگی بھی عمل میں لائی گئی تھی۔

مہمند ایجنسی کے خودکش حملوں کے فوراً بعد مقامی عسکریت پسندوں کے ایک گروہ نے اس کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے مؤقف اپنایا کہ جو بھی لوگ عسکریت پسندوں کی مخالفت کا راستہ اپنائیں گے، ان کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا جائے گا۔ قبل ازیں 9 جولائی 2010ء کے روز بھی مہمند ایجنسی کے علاقے یکہ غونڈ میں منعقدہ ایسے ہی ایک جرگے پر دو خودکش حملے کیے گئے تھے، جن میں 80 سے زائد قبائلی جاں بحق جبکہ 100 سے زائد زخمی ہو گئے تھے۔ اس واقعہ کے بعد مہمند ایجنسی سے ان لوگوں کی بڑے پیمانے پر نقل مکانی عمل میں آئی جن پر حکومت خصوصاً پولیٹیکل انتظامیہ اور فورسز کی طرف سے دباؤ تھا کہ وہ عسکریت پسندوں کے خلاف قومی یا امن لشکر کے نام سے کوئی گروہ تشکیل دیں، کیونکہ قبائلی عوام کو علم تھا کہ عسکریت پسند اس قسم کے لشکروں کی تشکیل قطعاً

پسند نہیں کرتے۔ مہمند ایجنسی کے علاوہ جن دوسری ایجنسیوں میں اس سے قبل ایسے ہی اجتماعات کو نشانہ بنایا گیا، ان میں خیبر ایجنسی (درہ آدم خیل) اور کرزئی ایجنسی، کرم ایجنسی اور وزیرستان کی دونوں ایجنسیاں شامل ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تقریباً تمام قبائلی علاقوں میں حکومت کے حمایت یافتہ لشکر، اجتماعات اور جرگے نشانہ بنائے جا چکے ہیں۔ یکہ غونڈ کے 9 جولائی کے افسوسناک سانحہ سے سبق سیکھنے کی بجائے حکومت نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مقامی لوگوں کو لشکر بنانے پر مجبور کیا، جبکہ امن قائم کرنا اور عسکریت پسندوں وغیرہ سے نمٹنا درحقیقت ریاست کی ذمہ داری ہے۔

9 جولائی اور 6 دسمبر کے دونوں اجتماعات حکومتی اداروں کے دباؤ پر مسلح سکیورٹی اہلکاروں کی موجودگی میں منعقد ہوئے اور متعلقہ ادارے اپنے حامیوں کے ان اجتماعات کو سکیورٹی فراہم کرنے میں اس کے باوجود ناکام رہے کہ ان کو عسکریت پسندوں کی پالیسی کا بخوبی علم تھا۔ اتنی زیادہ ہلاکتوں پر بھی حکمرانوں، سیاستدانوں اور میڈیا کی حسبِ معمول وہی پراسرار خاموشی دیکھنے میں آئی جو کہ اب ہمارے معاشرے کی شناخت بن چکی ہے۔ یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اگر پاکستان میں کوئی شے ارزاں ہے تو وہ انسانی خون ہی ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ایسے جرگوں پر اب تک 9 سے زائد حملے کئے جا چکے ہیں اور ان حملوں میں تقریباً 400 کے لگ بھگ قبائلی اپنی جانیں گنوا چکے ہیں، اس کے باوجود یہ حکومتی منطق کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی، اگر ریاستی ادارے اپنے حامیوں کے ایسے اجتماعات کو سکیورٹی فراہم نہیں کر سکتے تو وہ معصوم اور بے بس قبائلیوں کی اس طرح جانیں قربان کرنے کی ناکام پالیسی پر کیوں عمل پیرا ہیں۔ یہاں یہ اَمر قابل ذکر ہے کہ پولیٹیکل انتظامیہ اور دوسرے متعلقہ اداروں نے اس قسم کے لشکروں کی تشکیل کیلئے قبائلی عمائدین پر دباؤ ڈالنے کے علاوہ ان کے خلاف کارروائیاں کرنے اور انہیں دھمکیاں دینے سے بھی گریز نہیں کیا۔ حکومت نے فاٹا میں موجود قبائلی عمائدین کے علاوہ ان لوگوں کو بھی زبردستی لشکر اور کمیٹیاں تشکیل دینے پر مجبور کیا جو کہ عسکریت پسندوں کے خوف، دھمکیوں اور کارروائیوں کے باعث اپنے گھر اور اپنے علاقے چھوڑ کر قریبی شہروں کی جانب ہجرت کر چکے ہیں۔ بعض اطلاعات کے مطابق متعلقہ اداروں نے حال ہی میں ان شہروں کی پولیس کو عمائدین کی فہرستیں بھیج

کر ان کی گرفتاریوں کی سفارش بھی کی ہے، جہاں پر بے بس مگر باعزت قبائلی پناہ لے چکے ہیں۔ اس ضمن میں دوسرے منفی حربے بھی استعمال کئے جاتے رہے۔ اس سے قبل 23 اگست (2010ء) کو وزیرستان کے سابق ایم این اے مولانا نور محمد سمیت 26 دیگر افراد کو مدرسہ میں درس کے دوران شہید کر دیا گیا تھا کیونکہ مولانا موصوف حکومت کی حمایت کرنے لگے تھے۔ افسوسناک امر یہ ہے کہ ایک طرف تو رٹ قائم کرنے کے دعوے کئے جاتے ہیں اور فورسز تعینات کی گئی ہیں جبکہ دوسری طرف فورسز اور دوسرے متعلقہ ادارے عام لوگوں کو تو ایک طرف سرکاری عمارتوں میں منعقدہ اپنے حامیوں کے ایسے اجتماعات کو بھی تحفظ فراہم نہیں کر پاتے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ پاکستان کی جانب سے بازوئے شمشیر کا خطاب پانے والے قبائلی عوام اگر ایک طرف عسکریت پسندوں کی وجہ سے زندگی سے تنگ آ گئے ہیں تو دوسری طرف انہیں ریاست کے دباؤ کا بھی سامنا ہے، باقی رہی سہی کسر ڈرون حملے پوری کر رہے ہیں۔ 6 دسمبر کی شام شمالی وزیرستان کے ایک علاقے میں 4 ڈرون حملوں میں 6 افراد ہلاک ہو گئے۔ سوال یہ ہے کہ قبائلی عوام کا قصور کیا ہے اور ان کو اپنے گھروں اور علاقوں میں عزت کی زندگی گزارنے کیوں نہیں دی جا رہی؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ عسکریت پسندوں اور اس قسم کے دوسرے لوگوں سے نمٹنا اور حکومتی رٹ قائم کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے یا شہریوں کی؟ تیسرا سوال یہ ہے کہ فاٹا میں اس قسم کے لشکروں اور کمیٹیوں کے قیام کے لیے اب تک جو اربوں ڈالرز لئے جا چکے ہیں، ان میں سے فاٹا پر کتنے فنڈز خرچ کئے گئے ہیں؟ ان تمام سوالات کا جواب اس سے بڑھ کر اور کچھ نہیں کہ قبائل ان جرائم کی سزا بھگت رہے ہیں جو کہ حقیقتاً ان سے سرزد بھی نہیں ہوئے اور ابھی ان کو اور بھی قربانیوں کا سامنا کرنا ہے کیونکہ ریاست عملاً اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے میں ناکام رہی ہے۔ ایسے لشکروں اور کمیٹیوں کے نام پر ریاست امریکہ سے کتنی رقم لے چکی ہے، اس کا اندازہ ایک مؤثر ویب سائٹ 'پشتونستان گزٹ' کی اس رپورٹ سے لگایا جا سکتا ہے کہ امریکہ اب تک اس مد میں 1466.80 ملین کی خطیر رقم دے چکا ہے، اس میں سے جو رقم مہمند ایجنسی کو دی گئی ہے۔ وہ 337 ملین ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق یہ رقم فاٹا سیکرٹریٹ کے ذریعے تمام ایجنسیوں کے پولیٹیکل ایجنٹوں کو وقتاً فوقتاً دی جاتی رہی ہے۔ یہ رقم کیسے اور کہاں خرچ ہوئی اور اس کا کیا فائدہ ہوا؟ یہ وہ

سوال ہے جس کا جواب دینا ریاست کی ذمہ داری ہے مگر ریاست خود کو جوابدہ تصور نہیں کر رہی اور غلطیوں پر غلطیاں کرنے میں مصروف ہے۔ اگر یہ غلطیاں نہ کی جاتیں تو اب تک 30 ہزار لوگ لقمۂ اجل نہ بنتے۔

2005ء کے بعد پاکستان میں دہشت گردی کے واقعات میں کم از کم 30 ہزار پاکستانی شہری ہلاک ہو چکے ہیں جبکہ اتنی ہی تعداد میں زخمی بھی ہوئے۔ زخمیوں میں سے تقریباً 7 ہزار ایسے ہیں جو کہ بم دھماکوں کے باعث معذور ہو چکے ہیں۔ ان ہلاکتوں میں پاک فوج، فرنٹیئر کانسٹیبلری، خفیہ اداروں اور پولیس کے شہداء کی تعداد تقریباً 8 ہزار ہے جبکہ باقی تعداد عام اور معصوم شہریوں کی ہے۔ ایک اور رپورٹ کے مطابق 2007ء کے بعد خیبر پختونخواہ اور فاٹا سے کم از کم ایک ہزار افراد کو اغوا کیا گیا، اور ان سے اربوں روپے وصول کئے گئے یا تاوان کی رقم نہ ملنے کے باعث بیسیوں کو ہلاک کر دیا گیا۔ اگر اس صورتحال کا بغور تجزیہ کیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ حکومت جس رٹ کا دعویٰ کرتی آ رہی ہے، عملاً اس کا کوئی وجود نہیں ہے بلکہ نفسیاتی طور پر ریاست کمزور اور حملہ آور طاقتور ثابت ہوئے ہیں۔ سابق افغان سفیر عبدالخالق فراحی نے بی بی سی کو بتایا تھا کہ جس روز ان کو پشاور سے اغواء کیا گیا، اس روز رنگ روڈ پشاور پر تعینات پولیس اہلکاروں نے ان کی گاڑی اور آمد کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ اغواء کاروں نے ان کو آسانی کے ساتھ اغواء کر لیا۔

مہمند ایجنسی میں جس روز (چھ دسمبر 2010ء) دھماکے کیے گئے، اس کے اگلے روز یعنی سات دسمبر کو حملہ آوروں کے مورال کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے جنوبی وزیرستان میں آرمی چیف جنرل اشفاق پرویز کیانی کے دورہ کے دوران حملے کئے، جس کے باعث صورتحال خاصی پیچیدہ ہوگئی۔ اسی روز دہشت گردی کی ایک اور کارروائی میں بلوچستان کے وزیراعلیٰ اسلم رئیسانی پر سریاب روڈ کوئٹہ میں خودکش حملہ کیا گیا۔ اس حملے کے نتیجے میں دس افراد زخمی ہو گئے جبکہ وزیراعلیٰ کی گاڑی سمیت چھ گاڑیوں کو شدید نقصان پہنچا۔ وزیراعلیٰ پر کئے گئے حملے کی ذمہ داری کالعدم تنظیم لشکر جھنگوی نے قبول کی۔ یہ وہی تنظیم ہے جو کہ پنجاب اور بلوچستان میں گزشتہ کئی برسوں سے اپنی کارروائیاں جاری رکھے ہوئے ہے اور اس کو سرکاری کاغذات میں کالعدم قرار دیا جا چکا ہے۔ حملہ آوروں کے مورال، اہداف تک رسائی اور سب سے بڑھ کر درست وقت کا تعین یہ ثابت کرتا ہے

کہ خفیہ اداروں، سکیورٹی فورسز اور دوسرے ریاستی ادارے امن و امان کی بحالی سے متعلق جو دعوے کرتے آ رہے ہیں، وہ حقائق پر مبنی نہیں ہیں، جبکہ یہ اُمر بھی بارہا ثابت ہوتا آیا ہے کہ ریاست کی پالیسیاں اپنے نتائج کے حوالے سے نہ صرف یہ کہ ابہام کا شکار ہیں بلکہ حالات سے نمٹنے کے لیے ان کی منصوبہ بندی کو درست اور مؤثر بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر ریاستی ادارے واقعتاً فعال اور متحرک ہوتے تو تین روز کے دوران خیبر ایجنسی، سوات، مہمند ایجنسی، وزیرستان اور کوئٹہ میں ایک ترتیب کے ساتھ دہشت گردی کے واقعات رونما نہ ہوتے۔ رٹ کے قیام کے دعوے کرنے والے ادارے اگر ان مقامات کو جہاں جرگہ ہو رہا ہے یا وزیر اعلیٰ اور آرمی چیف کی آمد متوقع ہے، تحفظ فراہم نہیں کر سکتے تو جنگ زدہ ملک کے عام باسیوں کو سکیورٹی فراہم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ضرورت اس اُمر کی ہے کہ ریاست روایتی دعوؤں اور پالیسیوں سے گریز کی راہ اپناتے ہوئے موجودہ صورتحال کے تناظر میں ٹھوس، فوری اور مستقل حکمت عملی اپنا کر عوام کے علاوہ اپنے ریاستی مفادات کو بھی یقینی بنائے کیونکہ اس کی اپنی سیکورٹی پر بھی سوالیہ نشان لگ چکا ہے۔

کلچر انڈر ٹرائل

پشتونوں کی اجتماعی زندگی میں ان کی ثقافتی اقدار اور روایات کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے کیونکہ یہ قوم ہر دور میں اپنی ثقافت کے ساتھ جڑی رہی ہے اور اس معاملے میں پشتون کسی بھی سطح پر سمجھوتہ کرنے کے قائل نہیں رہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ماضی میں وسط ایشیاء اور برصغیر پر حکمرانی کرنے والے بادشاہوں اور فاتحین میں سے بے شمار ایسے بھی تھے جو کہ اپنے وقت کے بہترین شاعر اور موسیقار تھے۔ جب اس خطے میں اسلام کی روشنی پھیلی تو پشتونوں نے بحیثیت قوم اس نئے مذہب کو اجتماعی طور پر اس لئے بھی قبول کیا کہ اسلام اور پشتونولی میں کئی بنیادی چیزیں مشترک تھیں۔ اس حقیقت کو کوئی رَد نہیں کرسکتا کہ خطہ ارض پر اگر کوئی ایک قوم بحیثیت مجموعی مسلمان ہے تو وہ پشتون ہی ہے۔ یونانی، مغل، انگریز اور دوسرے مورخین کی مشترکہ رائے یہی رہی ہے کہ پشتونولی اپنے معنی اور مفہوم کے تناظر میں پشتونوں کے معاشرتی اور نفسیاتی ڈھانچے اور اس کی بنیاد کا نام رہا ہے اور اس میں پشتونوں کی ثقافت، روایات اور اقدار کو مرکزی اہمیت حاصل رہی ہے۔ یہ بڑی ستم ظریفی کی بات ہے کہ پشتون بیلٹ میں جب انتہا پسندی کے سیاہ دور کا آغاز ہوا تو انتہا پسند طرزِ فکر نے یہاں کے باسیوں کی ثقافت اور روایات کو ایک مستقل پالیسی کے تحت نشانہ بنایا۔ دوسرے لفظوں میں پشتون ثقافت کی بیخ کنی کی گئی اور پشتونولی سے وابستہ لوگوں پر زندگی تنگ کردی گئی۔ دنیا کی سب سے بڑی فلم انڈسٹری بالی وڈ کی بنیاد رکھنے والے پشتونوں کے اپنے شہر پشاور، کابل، کوئٹہ اور قندھار گزشتہ کئی برسوں سے ثقافتی بانجھ پن کا کچھ ایسا نقشہ پیش کر رہے ہیں، جس کی اس قوم اور اس خطے کی پانچ ہزار سال پر مشتمل دستیاب تاریخ میں اس سے پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔ 2004ء کے دوران جب صوبہ خیبر پختونخوا میں ایم ایم اے کی حکومت قائم ہوگئی تو نہ صرف یہ کہ ثقافت کا محکمہ ختم کر دیا گیا بلکہ ڈبگری گارڈن پر پولیس نے فنکاروں کو پریشان کرنا شروع کر دیا اور ان کے آلات موسیقی کو سڑکوں پر پھینکنے سے بھی گریز نہیں کیا گیا۔ اس طرز عمل کے باعث عالمزیب مجاہد، قمر گلہ، شاہ ولی، ہارون بادشاہ اور فن کی دنیا کے متعدد دوسرے بڑے نام ملک چھوڑنے پر مجبور ہوگئے، جبکہ خیال محمد، گلزار عالم، مہ جبین قزلباش، سردار یوسفزئی، گلریز تبسم، سردار

علی ٹکر اور بے شمار دوسرے فنکار خوف اور فاقہ کشی کے باعث یا تو دوسرے شہروں میں منتقل ہو گئے یا زیر زمین چلے گئے۔ گلزار عالم پر متعدد بار حملے بھی کیے گئے۔ ایک وقت وہ بھی آیا جب وہ اپنی بقاء کے لیے اور روزگار کی تلاش میں کوئٹہ اور اس کے بعد کراچی جا کر مزدوری کرنے لگا۔ قوم پرستوں کے سیاسی ترانے گانے والا یہ تعلیم یافتہ فنکار جب کراچی میں ٹیکسی چلا رہا تھا تو اسے اس حالات میں دیکھنے والوں کی آنکھیں مایوسی اور حیرت سے کھلی کی کھلی رہ جاتیں۔ سینکڑوں صاحبِ ثروت قوم پرستوں میں سے کسی ایک نے بھی اس نامور فنکار کی دادرسی کرنے کی زحمت نہیں کی۔ اسی دوران پشاور اور مردان سے دو بڑے ٹی وی فنکاروں ارشد حسین اور عالمزیب مجاہد کو اغواء کر لیا گیا تو ٹی وی اور فنِ اداکاری سے وابستہ لوگوں میں بھی شدید بے چینی پھیل گئی۔ مسلسل دھمکیوں اور فاقہ کشی سے تنگ آ کر متعدد فنکاروں نے پشاور چھوڑ دیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پشاور جیسا شہر فنون لطیفہ کے لئے ممنوعہ علاقہ قرار دے دیا گیا۔

2008ء کے الیکشن کے بعد قوم پرست جماعت اے این پی اور سیکولر پارٹی پی پی پی کی حکومت قائم ہوئی تو پہلے ہی دن دعویٰ کیا گیا کہ صوبے میں ثقافتی سرگرمیوں کو کچھ ہی عرصے میں شروع کر دیا جائے گا اور شہر کے فنکاروں کو نہ صرف یہ کہ تحفظ فراہم کیا جائے گا بلکہ ان کے اقتصادی حقوق پر بھی خصوصی توجہ دی جائے گی۔ گلزار عالم اس یقین دہانی کے بعد کراچی سے پشاور واپس آ گیا، کیونکہ اس کو بطور خاص واپس آنے کی تاکید کی گئی تھی۔ تاہم پشاور پہنچ کر اسے مایوسی ہی ہوئی۔ اس نے باچا خان مرکز کے سامنے کبابوں کی دکان کھول لی، جہاں سے وہ باچا خان مرکز کی عالی شان عمارت میں قوم پرست رہنماؤں کو لمبی اور جدید گاڑیوں میں آتے جاتے دیکھتا رہا۔ کسی کے پاس اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ اتنے بڑے فنکار کی دادرسی کے لئے تھوڑی دیر کے لئے رک جاتا۔ یہ کاروبار نہ چلا تو گلزار عالم پھر سے گوشہ نشین ہو گیا اور اس کے بچے ضروریات زندگی کے لئے ترستے رہے۔ یہ وہی گلزار عالم تھا جس کی نظمیں اور ترانے سنتے وقت خان عبدالولی خان، ڈاکٹر نجیب اللہ، افراسیاب خٹک، اسفندیار ولی، لطیف آفریدی اور محمود خان اچکزئی سمیت موجودہ کابینہ کے تقریباً سبھی وزرا کھڑے ہوا کرتے تھے۔

صوبائی حکومت نے ڈائریکٹوریٹ آف کلچر کے قیام کا وعدہ نبھانے میں اڑھائی برس کا

طویل عرصہ لگا دیا۔ اس ادارے میں جن 40 لوگوں کی تعیناتی عمل میں لائی گئی ہے، ان میں اکثریت ان سفارشیوں کی ہے جن کو ثقافت کی الف ب کا بھی علم نہیں ہے۔ اس ادارے کے لئے فنڈز مختص نہیں کئے گئے بلکہ اس کو وزارت سیاحت کے فنڈز سے چلایا جا رہا ہے۔ ایک ریٹائرڈ پروڈیوسر کو اس ادارے کا ڈائریکٹر بنایا گیا ہے حالانکہ موصوف اپنی پروڈیوسر کی حیثیت سے ملازمت کے دوران اپنے طرزِ عمل اور رویئے کے باعث اب بھی متعلقہ محافل میں زیرِ بحث رہتے ہیں۔ انہوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ نشتر ہال میں ازسرِ نو ثقافتی سرگرمیاں بحال کرنے پر ہی اپنی ساری توجہ مرکوز رکھی۔ نشتر ہال میں ثقافتی سرگرمیاں تو شروع ہو گئیں تاہم اسے کیسے چلایا جاتا رہا، یہ سب کو علم ہے۔ ایسے لوگوں کو بلایا جاتا رہا، جن کی پشاور کے ثقافتی حلقوں میں کوئی وقعت نہیں تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈائریکٹر موصوف ریٹائرمنٹ کے بعد ان عناصر کے احسان مند ہو گئے تھے۔ موصوف نے نشتر ہال تو کھول دیا مگر ہال میں حاضرین کی تعداد ہر بار نہ ہونے کے برابر ہی رہی کیونکہ چالیس رکنی بریگیڈ میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو کہ شرکاء کو لانے یا دعوت دینے کے قابل ہو۔ اس محدود مگر ناکام تجربے کے دوران بھی گلزار عالم، خیال محمد، سردار علی ٹکر اور دوسرے بڑے فنکاروں کو حسبِ سابق نظر انداز کر دیا گیا۔ فنکار خالی کرسیوں کو مخاطب کر کے چالیس رکنی ٹیم اور چند دوسرے معززین ہی کو مستفید کرتے رہے۔ ثقافت کے ٹرائل کا یہ سلسلہ محض وزارت ثقافت اور مذکورہ ادارے تک محدود نہیں رہا، بلکہ پاکستان ٹیلی ویژن پشاور سنٹر، ایک نجی ٹی وی اور بعض پرائیویٹ پروڈیوسر بھی فنکاروں کے استحصال میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ بظاہر تو یہی لگ رہا ہے کہ قوم پرستوں کی حکومت کا طرزِ عمل ایم ایم اے کی حکومت اور اس کی اتحادی انتہا پسند تنظیموں سے قطعاً مختلف نہیں ہے۔

دوسری طرف شعبۂ کھیل کی حالت بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔ حکومت کے اعلانات کے نتائج قیوم سٹیڈیم سے باہر نکلتے ہوئے دکھائی نہیں دے رہے، جبکہ اب تو ایک ایسا مافیا بھی میدان میں آ گیا ہے جو کہ ملک سعد جیسے لوگوں کے نام استعمال کر کے کھیلوں کی سرگرمیوں کو فروغ دینے کی آڑ میں ذاتی مفادات کے حصول اور تشہیر میں مصروف عمل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کھیلیں بھی انڈر ٹرائل ہیں۔ ثقافتی سرگرمیوں اور کھیلوں کا فروغ دہشت گردی سے دوچار صوبے میں فوجی

کارروائیاں کرنے اور دیگر حکومتی اقدامات سے زیادہ اہم ہے، کیونکہ پشتونوں کے اجتماعی مزاج اور طرزِ زندگی میں ان دو شعبوں کی انتہائی اہمیت رہی ہے اور یہی وہ دو شعبے ہیں جو کہ 2006ء کے بعد بدترین قسم کے خطرات سے دوچار ہیں۔ اس کو بدقسمتی یا حکمرانوں کی نااہلی کے علاوہ دوسرا کوئی نام ہی نہیں دیا جاسکتا کہ اے این پی جیسی قوم پرست پارٹی نے ان دو اہم ترین شعبوں کی ترویج اور ترقی پر کوئی توجہ نہیں دی اور اگر کچھ اقدامات کئے بھی ہیں تو ان کا زیادہ فائدہ ان شعبوں کے بجائے مافیا کو پہنچتا رہا ہے۔ بدقسمتی سے دونوں شعبوں کی وزارت ایک ایسے وزیر کے پاس ہے جو کہ اپنی غیر سنجیدگی کے باعث کافی شہرت رکھتے ہیں جبکہ وہ ثقافت میں بھی کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتے۔ اگر ملک سعد کے نام پر کھیلوں کا کوئی ادارہ مافیا کی شکل اختیار کر گیا ہے اور ایسے کسی فورم کو صوبے کے ایک سابق انسپکٹر جنرل آف پولیس کے ذریعے مال کمانے کے لئے استعمال کیا جارہا ہے تو لازمی بات ہے کہ اسے بھی متعلقہ صوبائی وزیر کی آشیرباد اور معاونت حاصل ہوگی۔ اگر ایسا نہیں ہے تو متعلقہ وزارت اس قسم کی سرگرمیوں پر پراسرار خاموشی اختیار نہ کرتی۔ مذکورہ دونوں وزارتوں کی کارکردگی اور فعالیت حکومت کے قیام کے تقریباً تین سال کا طویل عرصہ گزرنے کے باوجود عملاً نہ ہونے کے برابر ہے اور یہی وجہ ہے کہ دونوں شعبوں کا مستقبل بہت تاریک نظر آرہا ہے۔

کھیلوں کی سرگرمیاں قیوم سٹیڈیم اور وزارت کے دفاتر سے آگے بڑھتی ہوئی دکھائی نہیں دے رہی ہیں۔ حالانکہ صوبے میں بارہ سے زائد اضلاع ایسے ہیں جہاں پرامن وامان کی صورتحال خاصی بہتر ہے اور اگر وزارت چاہتی تو ان علاقوں میں کھیلوں کی سرگرمیاں دوبارہ شروع کی جاسکتی تھیں۔ اس سے قبل سوات آپریشن کی تکمیل کے بعد فوجی حکام کی نگرانی میں سوات میں ایسے ہی میوزک شوز کے انعقاد کا ایک ناکام تجربہ کیا گیا تھا، جیسا کہ اب نشتر ہال میں کیا جارہا ہے۔ ان شوز کے دوران بھی نامور اور مقبول فنکاروں کو نظرانداز کر کے ایسے لوگوں کو نوازا گیا جن کی شہرت نہ ہونے کے برابر تھی، جبکہ بعض ایسی فنکاراؤں نے بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کے لئے این جی اوز بھی قائم کیں، جن کا نہ تو اس صوبے سے کوئی تعلق تھا اور نہ ہی ان کی ساکھ' شہرت اور سرگرمیاں پشتونوں کے مخصوص مزاج سے ہم آہنگ تھیں۔ فاٹا سیکرٹریٹ میں بھی ثقافت کے فروغ کے لئے بھاری فنڈز مختص کیے گئے ہیں، تاہم یہاں کی صورتحال بھی وزارتِ ثقافت اور کھیل سے مختلف نہیں

ہے۔ایک مخصوص ٹولے نے یہاں بھی مافیا کی صورت اختیار کر لی ہے۔ یہ لوگ بے مقصد منصوبوں پر کروڑوں روپے صرف کر رہے ہیں، اس تلخ حقیقت کے باوجود کہ اس عمل کا رائے عامہ پر نہ کوئی مثبت اثر مرتب ہو رہا ہے اور نہ ہی ایسے منصوبوں کا کوئی فیڈ بیک ملنے کی توقع ہے۔اگر متعلقہ اداروں کی پالیسی اور کارکردگی ایسی ہی رہی تو اس اَمر میں کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ ثقافتی سرگرمیاں شروع ہونے سے قبل ہی دم توڑ جائیں گی اور حکومت کو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

فاٹا، بفرزون سے وارزون تک

سات قبائلی ایجنسیوں پر مشتمل فاٹا کا شمار دنیا کے پسماندہ ترین اور خطرناک ترین علاقوں میں ہوتا ہے۔ انگریز جب برصغیر میں داخل ہوئے تو انہوں نے قبائلی علاقوں کی جغرافیائی اہمیت اور یہاں کے عوام کے مزاج کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان علاقوں کے لئے دوسرے نوآبادیاتی علاقوں کے برعکس بعض ایسے قوانین تشکیل دیئے، جن کی دنیا کے کسی بھی مہذب معاشرے میں مثال ملنا مشکل ہے۔ انگریزوں نے افغانستان اور روس کی سرحد پر واقع ان قبائلی علاقوں کو بفرزون قرار دیتے ہوئے اس قبائلی پٹی کو ملک کے دوسرے علاقوں سے الگ حیثیت دی۔ قبائلی عوام پر ایسے ظالمانہ اور فرسودہ قوانین مسلط کئے گئے کہ ان کے لئے حکومت کے احکامات کی پیروی کرنے کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ یا آپشن بچا ہی نہیں۔ افغانستان کے ساتھ خونی اور ثقافتی رشتوں میں بندھے قبائل کو ایف سی آر اور اس طرح کے دوسرے غیر انسانی قوانین میں جکڑا گیا اور اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ قبائلی بنیادی انسانی حقوق سے بھی محروم رہے۔ ان کی عجیب انتظامی حیثیت کو انگریزوں نے اپنے مفادات کے لئے کچھ اس طریقے سے استعمال کیا کہ قبائلی عوام صدیوں تک اپنی شناخت' حقوق اور اختیارات سے محروم رہے۔ قبائلی عوام نے اس تمام عرصہ کے دوران متعدد بار اپنے حقوق اور آزادی کی زبردست تحاریک چلائیں اور اس سلسلے میں بے پناہ قربانیاں دیں، تاہم جب برصغیر آزاد ہوا اور فاٹا پاکستان کا حصہ بن گیا تو پتہ چلا کہ فاٹا کو پاکستان کا بازوئے شمشیر قرار دینے کا نعرہ محض نعرہ ہی تھا۔ نئی اسلامی ریاست نے ان علاقوں کو اسی حیثیت میں قائم رکھتے ہوئے یہاں انگریزوں کے متعارف کردہ نظام کو قائم رہنے دیا۔ نوآموز مسلمان ریاست کے حکمرانوں نے ریاستی سطح پر اس اہم ترین جغرافیائی خطے کو عملاً پاکستان کا حصہ ہی نہیں سمجھا۔ اس کو جرائم اور منشیات کے گڑھ کی حیثیت دے دی گئی اور اس کو واقعتاً ''علاقہ غیر'' قرار دے دیا گیا۔ پچاس کی دہائی سے ستر کی دہائی تک اس کی انتظامی حیثیت میں ردوبدل کا غیر ضروری سلسلہ جاری رکھا گیا مگر اس اَمر پر کوئی توجہ نہیں دی گئی کہ اس علاقے کو پاکستان کے دوسرے علاقوں کی طرح انتظامی' اقتصادی اور سیاسی حقوق دیئے جائیں۔ پاکستانی حکمرانوں نے

فاٹا میں وہی پالیسی جاری رکھی جو انگریز سرکار نے تشکیل دی تھی۔ ان کی بفرزون کی حیثیت کو اور بھی مستحکم کیا گیا اور ایک مستقل پالیسی کے تحت قبائل کو ان ظالمانہ قوانین اور نظام میں جکڑ کر رکھا گیا جس کی بنیاد برطانوی راج نے رکھی تھی۔

قیام پاکستان کے بعد ان علاقوں کی بدحالی اور پسماندگی میں وقت گزرنے کے ساتھ اضافہ ہوتا گیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستانی ریاست اور فاٹا کے درمیان موجود خلیج تیزی سے بڑھنے لگی۔ 'بازوئے شمشیر' کو ایک فرسودہ پولیٹیکل انتظامیہ کے رحم و کرم پر کچھ اس انداز سے چھوڑا گیا کہ مہذب دنیا اور فاٹا کے درمیان رابطے اور موازنے کا کوئی راستہ ہی باقی نہیں بچا۔ قبائلی علاقے پاکستان کے ساتھ ساتھ افغانستان پر بھی انحصار کرنے لگے، جبکہ ان کو پاکستان کی سیاست' ریاستی امور اور وفاقی ڈھانچے سے عملاً خارج کر دیا گیا۔ 20ویں صدی کے دوران بھی اس علاقے کا کوئی سیاسی اور اقتصادی ڈھانچہ سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔ 80ء کی دہائی میں جب افغانستان میں جہاد کے نام پر جنگ مسلط کی گئی تو پاکستانی ریاست اور امریکہ کی حکمت عملی کے تحت فاٹا سے بفرزون ہی کا کام لیا گیا۔ صرف وزیرستان کی دو ایجنسیوں میں ایک لاکھ پچاس ہزار کے لگ بھگ مہاجرین کو محض اس مقصد کے لیے بسایا گیا کہ انہیں تربیت دے کر روس سے لڑنے کے لیے افغانستان بھیجا جا سکے۔ اب ان علاقوں پر جہادی تنظیموں کا تسلط قائم ہو گیا اور پشاور کے بعد فاٹا کے بہت سے علاقے افغان جنگ کے مراکز میں تبدیل ہو گئے۔ ریاست کی مستقل پالیسی کے تحت فاٹا میں سیاسی جماعتوں اور جمہوری عمل پر پابندی کچھ اس انداز سے برقرار رکھی گئی کہ سیاست کو شجر ممنوعہ بلکہ ایک سنگین جرم قرار دے دیا گیا۔ جمہوریت پر یقین رکھنے والی سیاسی جماعتوں کو سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی اجازت نہیں تھی، تاہم مذہبی قوتوں خصوصاً جہادیوں کے لئے فاٹا کو محفوظ جنت میں تبدیل کر دیا گیا۔

یہ باعثِ حیرت اَمر ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو' نواز شریف اور بے نظیر شہید بھٹو جیسے مقبولِ عام رہنماؤں نے بھی اپنے ادوار کے دوران فاٹا کو سیاست جمہوریت اور انتخابات کے لئے شجر ممنوعہ ہی رہنے دیا۔ عوام کو براہ راست ووٹ ڈالنے اور کسی سیاسی جماعت میں شمولیت کی اجازت نہیں تھی بلکہ چند مَلک صاحبان ہی ووٹ ڈال سکتے تھے اور وہ انہیں فروخت کر کے مخصوص افراد کو

اسمبلیوں میں فاٹا کے نمائندوں کے طور پر بھیجنے کے مجاز تھے۔عوام بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ووٹ ڈالنے کے حق کا مطالبہ کر رہے تھے مگر اسلام آباد اور پشاور کے محلوں میں ان کی آواز نہیں پہنچ رہی تھی۔ترقیاتی فنڈز گورنر ہاؤس اور پولیٹیکل ایجنٹ ہاؤس سے باہر نظر نہیں آتے تھے (اب بھی نظر نہیں آتے)۔گورنر اور پولیٹیکل ایجنٹ پر مشتمل انتظامی ڈھانچے کو 1990ء کے دوران دنیا کا بدترین اور کرپٹ نظام قرار دیا گیا۔یہ بہت عجیب بات ہے کہ قبائل کو رائے دہی کی بنیاد پر ووٹ ڈالنے کا حق بھی کسی سیاسی رہنما یا پارٹی کی بجائے نوے کی دہائی میں فاروق لغاری کے نگران سیٹ اپ کے دوران دیا گیا۔یہ نیک کام بھی کسی سیاسی پارٹی کے کریڈٹ پر نہیں آیا۔فاٹا میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر الیکشن کرائے گئے تو عوام کی بڑی تعداد نے ووٹ ڈال کر ثابت کیا کہ وہ الیکشن میں حصہ لینے اور ووٹ ڈالنے کے عمل کو دوسروں سے بہتر سمجھتے ہیں۔باجوڑ ایجنسی کے ایک حلقہ میں اس قدر بڑی تعداد میں ووٹ ڈالے گئے کہ شرح کے اعتبار سے اس حلقے نے پاکستان کے دیگر حلقوں کا ریکارڈ توڑ دیا۔اس حلقے سمیت متعدد دوسرے علاقوں میں خواتین بھی ووٹ ڈالنے گھروں سے باہر آئیں۔قبائلیوں کو بالغ رائے دہی کا حق دیے جانے کے باوجود سیاسی پارٹیوں پر پابندی برقرار رکھی گئی۔یوں یہ خطہ سیاسی سرگرمیوں سے محروم ہی رکھا گیا۔اس پالیسی کا ان قوتوں اور گروہوں نے بھرپور فائدہ اٹھانا شروع کیا جو تشدد' جرائم اور جہاد کے نام پر گروہی بالادستی قائم کرنے کے لئے اسّی کی دہائی کے دوران قبائلی علاقوں میں منظّم کیے گئے تھے۔

طالبان کے دور حکومت کے دوران فاٹا افغانستان کے کسی صوبے کا نقشہ پیش کرتا رہا،فرق صرف یہ تھا کہ یہاں پاکستان کا اور وہاں افغانستان کا جھنڈا لہراتا رہا۔طالبان' القاعدہ اور ان کے دوسرے اتحادیوں نے پاکستان کی مقتدر قوتوں کی آشیرباد سے فاٹا کو عسکریت پسندوں کا مضبوط مرکز بنا دیا اور یہاں کے صدیوں پرانے فرسودہ ڈھانچے کو تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔نائن الیون کے واقعہ کے بعد جب امریکہ اور اس کے اتحادی افغانستان پر حملہ آور ہوئے تو ہماری مقتدر قوتوں نے اس بفرزون کو ایک بار پھر ان عناصر کے نرغے میں دے دیا جن کو وقتی طور پر پاکستان یا افغانستان کے کسی محفوظ علاقے یا ٹھکانے کی تلاش تھی۔ بڑی تعداد میں وہ تمام عسکریت پسند فاٹا میں یکجا ہونا شروع ہو گئے جو کبھی افغانستان میں طالبان یا ان کے حامیوں کے

نام سے برسر اقتدار تھے۔ ان لوگوں نے 300 کے لگ بھگ ان قبائلی مشران کو ایک ایک کر کے ہلاک کر دیا جو کہ ان کے عزائم کی راہ میں رکاوٹ بن سکتے تھے۔ اس پالیسی کا مقصد یہ تھا کہ کوئی بھی ان کے خلاف اور عوام کے حق میں آواز اٹھانے کے قابل نہ رہ سکے۔ پاکستانی فوجی حکومت نے ایک مستقل پالیسی کے تحت لاکھوں قبائلی عوام کو جان بوجھ کر طالبان یا اس قسم کے دوسرے مقامی اور غیر مقامی عناصر کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔ قبائلی علاقوں میں حقانی گروپ، وسطی ایشیاء کے عسکریت پسندوں، عرب تنظیموں، پاکستانی جہادی گروہوں اور پختون طالبان سمیت دنیا بھر کے جہادی اکٹھے کئے گئے۔ یہی وہ لوگ تھے جو کہ بعدازاں تحریکِ طالبان پاکستان کے پلیٹ فارم سے پاکستانی ریاست پر حملہ آور ہوئے، ان کی تربیت و تشکیل پاکستانی ریاست کے زیرِ سایہ ہی ہوئی تھی۔ بدقسمتی سے اس تمام عرصہ کے دوران کسی نے بھی یہ ضرورت محسوس نہیں کی کہ فاٹا میں سیاسی اصلاحات اور انتظامی تبدیلیوں پر توجہ دے کر اس خطے کو پاکستان کے دوسرے علاقوں کی طرح مرکزی دھارے کی سیاست میں شامل کیا جائے۔ یہ سینکڑوں میل پر محیط وہ علاقہ ہے جہاں 21ویں صدی میں بھی کوئی یونیورسٹی یا گرلز کالج نہیں ہے۔ اس خطے کا یہ بھی اعزاز ہے کہ یہاں پر پولیس یا عدالتیں موجود نہیں ہیں۔ یہ شاید دنیا کا واحد علاقہ ہے جہاں پر ٹیکس اور بینکنگ کا نظام نہیں ہے۔ یہاں پر شرح خواندگی عملاً پانچ فیصد سے کم جبکہ روزگار کی شرح تین فیصد سے بھی کم ہے۔ صحت کی حالت صومالیہ اور ایتھوپیا سے بھی بدتر ہے۔

نائن الیون کے بعد اس خطے کی ترقی کے لئے اربوں روپے کے جو فنڈز آئے، وہ راولپنڈی، اسلام آباد اور پشاور کے حاکموں یا چند مخصوص لوگوں کے بنک اکاؤنٹس میں جمع ہوتے گئے۔ فاٹا میں ان فنڈز کا دس فیصد بھی خرچ نہیں کیا گیا۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ فاٹا کو این ایف سی ایوارڈ میں سرے سے شامل ہی نہیں کیا گیا، حالانکہ یہاں پر بے شمار قدرتی وسائل کے علاوہ وارسک ڈیم کے نام سے پانی اور بجلی کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ فاٹا کو انتہا پسندوں اور حملہ آوروں کے مرکز کے طور پر پاکستان اور عالمی برادری میں اس قدر بدنام کیا گیا کہ یہاں کے لوگوں اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کو نہ تو روزگار ملتا ہے اور نہ ہی وہ رزق کی تلاش میں بیرونِ ملک جا سکتے ہیں۔ صدر پاکستان آصف علی زرداری کی جانب سے چودہ اگست 2009ء کو فاٹا میں ایف سی

آر کے سیاہ قوانین کے خاتمے یا اس میں ترامیم اور پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ کے نفاذ کے اعلان پر تاحال عملدرآمد نہیں کیا گیا (رواں سال اگست میں بالآخر صدرِ مملکت نے ایف سی آر کے ترامیمی آرڈیننس پر دستخط کر دیئے ہیں)۔ ساتوں قبائلی ایجنسیوں میں حملہ آوروں کی بیخ کنی کے نام پر کارروائیاں جاری ہیں تاہم کسی کو کچھ پتہ نہیں چل رہا کہ جو شخص مر رہا ہے وہ واقعی مجرم تھا یا نہیں۔ بعض لوگ اس عمل کو ناگزیر اور بعض اس کو قبائل کی نسل کشی کا سلسلہ قرار دے رہے ہیں۔

دوسری طرف ڈرون حملوں نے بھی یہاں کے عوام کو بدترین عدم تحفظ اور مسلسل خوف سے دوچار کر رکھا ہے۔ صدر پاکستان اور منتخب اسمبلیوں کے مینڈیٹ کے باوجود کسی بھی پارٹی کو فاٹا میں اپنا جھنڈا الہرانے کی ہمت نہیں ہو رہی۔ فاٹا کے نام پر ملنے والی اربوں روپے کی غیر ملکی امداد کے استعمال کے کوئی آثار اور مظاہر نظر نہیں آ رہے۔ جہالت بے روزگاری' بدامنی اور پسماندگی دن بدن بڑھتی جا رہی ہے، جبکہ عوامی نمائندوں کی حالت یہ ہے کہ وہ وزیر' ایم این اے اور سینیٹر ہو کر بھی چیخ چیخ کر یہ کہہ رہے ہیں کہ ان کو کسی بھی ریاستی فیصلے کے حوالے سے اعتماد میں نہیں لیا جا رہا۔ حال ہی میں ایک وزیر حمید اللہ جان آفریدی کو ایسی ہی شکایت کرتے ہوئے سنا گیا جبکہ دوسرے اراکینِ قومی اسمبلی کی بے بسی بھی قابل دید ہے۔ چند روز قبل فاٹا کی تمام ایجنسیوں کے تعلیم یافتہ طبقات خصوصاً نوجوانوں نے حالات سے مایوس ہو کر متحدہ قبائل پارٹی (ایم کیو پی) کی بنیاد رکھی اور ایک باشعور نوجوان حبیب اورکزئی کو اس پلیٹ فارم کا بانی چیئرمین بنایا گیا۔ اس پارٹی میں ہر علاقے' ہر قوم اور ہر طبقے کے نمائندے شامل ہیں اور انہوں نے معاشی اور معاشرتی حقوق کے حصول کے لیے تین بنیادی مقاصد یا نکات کو اپنے منشور کا حصہ بنایا ہے۔ اس میں یہ مؤقف اختیار کیا گیا ہے کہ چونکہ 1973ء کے آئین میں فاٹا کو پاکستان کا پانچواں یونٹ تسلیم کیا جا چکا ہے، اس لئے اس علاقے کو ملک کے دوسرے حصوں کی طرح پاکستان کے پانچویں صوبے کی حیثیت دی جائے اور سات قبائلی اور آٹھ نیم قبائلی (ایف آر ز) علاقوں پر مشتمل ایک الگ صوبے کے قیام کو یقینی بنایا جائے اور انہیں دورِ جدید کے تمام ریاستی اور انتظامی حقوق دیئے جائیں۔ انہوں نے فاٹا کی ترقی کے لیے ملنے والے اربوں روپے کے فنڈز کا آڈٹ کرانے کا مطالبہ بھی کیا جبکہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ تمام تر خطرات اور خدشات کے باوجود اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے نہ صرف یہ کہ ہر

جائز راستہ اپنایا جائے گا بلکہ اس مقصد کے لئے عالمی برادری سے بھی رابطے کئے جائیں گے۔ قبل ازیں خیبر ایجنسی میں بھی ایسے ہی ایک پلیٹ فارم کے قیام کا اعلان کیا جا چکا ہے جبکہ بعض دوسری ایجنسیوں میں بھی باشعور، تعلیم یافتہ اور پرامن مگر ذمہ دار لوگ سیاسی جماعتوں، عوامی نمائندوں اور حکومت سے مایوس ہو کر اپنے اپنے طور پر ایسی ہی تنظیموں کے قیام کا اقدام اٹھا چکے ہیں۔ فاٹا کے عوام خصوصاً نوجوانوں میں بڑھتی ہوئی تشویش کو بغاوت اور مزاحمت میں تبدیل ہونے سے روکنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ان کے مطالبات، ان کے مسائل اور سب سے بڑھ کر ان کی تجاویز کو سنجیدگی سے سن کر سنگین ترین مسائل کے حل کے لئے ان کی مدد کی جائے۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا اور سیاسی و ریاستی اداروں نے فاٹا میں اصلاحات اور سیاسی جمہوری عمل کے فروغ پر توجہ نہیں دی تو اس کے انتہائی سنگین نتائج برآمد ہوں گے اور ظاہر ہے کہ پاکستان ان حالات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ فاٹا کو انتہا پسندوں کے چنگل سے چھڑانے کے لئے فوجی کارروائیوں کے ساتھ ساتھ سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی اصلاحات بھی کی جائیں۔ اگر ہمارے ارباب اختیار واقعتاً فاٹا میں امن دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے لازمی ہے کہ فاٹا کے پرامن اور ترقی پسند طبقوں کو اعتماد میں لیکر ان علاقوں کو ملک کے دوسرے حصوں کی طرح قومی ریاستی دھارے میں شامل کرنے کے لئے ٹھوس اقدامات کئے جائیں۔ اس بات پر بھی غور کرنے کی اشد ضرورت ہے کہ فاٹا کو الگ صوبہ یا الگ انتظامی یونٹ بنانے کے کتنے امکانات موجود ہیں اور اگر ایسا کیا جائے تو اس کے اثرات کیا ہوں گے۔

”ٹرننگ پوائنٹ“

پاکستان کے خلاف برسرِ پیکار ریاست اور سیاست مخالف قوتوں کی صلاحیت اور قوت نہ صرف یہ کہ بڑی حد تک قائم اور موجود ہے بلکہ حملہ آور گروپوں کی تکنیک میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں بھی رونما ہوتی آئی ہیں۔ ہم متعدد بار اس خطرے کی بھی نشاندہی کرتے آئے ہیں کہ 2010ء کے دوران طالبان اور ان کی حامی دوسری تنظیمیں پاکستانی ریاست کے اصل مراکز یعنی اسلام آباد اور لاہور کے علاوہ اہم شخصیات اور اداروں کو ٹارگٹ بنانے کی کوشش کریں گی۔ ہم یہ بھی عرض کر چکے ہیں کہ سوات اور وزیرستان آپریشن کے بعد عسکریت پسند بہت بڑی تعداد میں منتشر ہو کر ملک کے دوسرے شہروں اور علاقوں میں منتقل ہو گئے۔ ان کو جب بھی ان کی قیادت کی طرف سے حکم دیا جاتا ہے، تو وہ سکیورٹی کے انتظامات اور جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے ہدف کو نشانہ بنانے میں دیر نہیں لگاتے۔ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ ان کی اکثر کارروائیاں کامیاب رہتی ہیں، جس سے ریاستی اداروں کی کارکردگی اور انٹیلی جنس کے نظام کے حوالے سے بہت سے خدشات پیدا ہوتے ہیں۔ 24 جولائی 2010ء کی شام کو ایسی ہی ایک منظم اور کامیاب کارروائی کے دوران اے این پی کے باجرأت رہنما اور صوبائی حکومت کے ترجمان میاں افتخار حسین کے جواں سال (26 سالہ) صاحبزادے راشد حسین کو ان کے آبائی گاؤں پبی میں نشانہ بنا کر شہید کر دیا گیا۔ راشد شہید نہ صرف یہ کہ انتہائی معصوم، تعلیم یافتہ اور خوش اخلاق انسان تھے بلکہ ان کو ایک سیاستدان کے صاحبزادے ہونے کے باوجود سیاسی اور پارٹی معاملات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ جو لوگ ان کو جانتے تھے، ان کو علم ہے کہ میاں افتخار کی غیر موجودگی میں علاقے اور حلقے کے معاملات ان کے بھائی نمٹایا کرتے تھے اور اس تمام عمل یا معمولات سے راشد حسین کا دور کا بھی کوئی تعلق اور واسطہ نہیں تھا۔ یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ میاں افتخار حسین کے اکلوتے صاحبزادے تھے بلکہ وہ پورے خاندان یعنی میاں صاحب سمیت ان کے دو دیگر بھائیوں کی بھی واحد اولادِ نرینہ تھے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شہادت سے پورا خاندان اپنے اکلوتے بیٹے سے محروم ہو کر رہ گیا۔ اس افسوسناک واقعے سے یہ بات ایک بار پھر کھل کر سامنے آ گئی ہے کہ حملہ

آوروں کی نظر میں اے این پی کو اب بھی اہم ترین دشمن کی حیثیت حاصل ہے۔

میاں افتخار حسین سمیت پارٹی کے رہنماؤں اور عوام سب کو علم تھا کہ میاں افتخار کو کسی بھی وقت نشانہ بنایا جاسکتا ہے کیونکہ موصوف روز اول سے جرأت اور استقامت کے ساتھ بلاخوف و خطر حملہ آوروں کی کھل کر مخالفت اور ان کو مسلسل چیلنج کر رہے تھے، چنانچہ یہ بہت پہلے واضح ہو گیا تھا کہ ان کو راستے سے ہٹانا ان کے مخالفین کی نہ صرف یہ کہ سب سے بڑی خواہش ہے بلکہ وہ ایسا کرنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور بھی لگا رہے ہیں۔اب یہی کہا جاسکتا ہے کہ حملہ آوروں نے باپ سے بدلہ اس کے بیٹے کی موت کی صورت میں لیا جس کا سیاست سے تو کوئی تعلق نہیں تھا مگر اس کی موت سے اس کے باجرأت باپ کو پسپا کیا جاسکتا تھا۔اے این پی کے بدترین مخالفین بھی اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ راشد حسین کی شہادت کا اقدام اٹھا کر حملہ آوروں نے جہاں ایک طرف ایک نئے رجحان کی بنیاد ڈال دی ہے، وہاں وہ لاکھ چاہتے ہوئے بھی کسی مرحلے پر بھی اس کارروائی کا اخلاقی اور سیاسی جواز فراہم کرنے میں کامیاب نہیں ہوں گے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک وزیر کی حیثیت سے میاں افتخار حسین کو اگر نشانہ بنایا جاتا تو ایسے کسی اقدام کیلئے حکومت، پارٹی اور قوم نہ صرف یہ کہ ذہنی طور پر تیار ہوتی بلکہ حملہ آوروں کے پاس ایک جواز بھی موجود ہوتا، تاہم ایک معصوم اور بے گناہ کو کسی اور کے کیے کی سزا دینے کی کارروائی کو کسی بھی صورت میں درست قرار نہیں دیا جاسکتا۔یہاں یہ یاددہانی کرانا بھی ضروری ہے کہ اس نوعیت کا یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے۔2008ء کے وسط میں ایسی ہی ایک کارروائی کے دوران اے این پی کے ایک اور صوبائی وزیر ایوب خان اشاڑے کے دو بھتیجوں کو سوات میں ان کے دو ساتھیوں سمیت نشانہ بنایا گیا تھا جبکہ اس سے اگلے برس ایک اور وزیر واجد علی خان کے بھائی فاروق خان کو بھی مینگورہ سوات میں دن دیہاڑے شہید کیا گیا تھا۔ایوب اشاڑے اور واجد علی خان کے بھتیجوں اور بھائی کی ہلاکتوں سے قبل اے این پی کے بزرگ رہنما محمد افضل خان لالہ اور ان کے بھتیجے عبدالجبار خان پر بھی مٹہ سوات میں قاتلانہ حملہ کیا گیا تھا۔اس حملے میں دو افراد مارے گئے تھے تاہم افضل خان لالہ بچ گئے تھے۔عین الیکشن مہم کے دوران ایوب اشاڑے کو بم سے اڑانے کی کوشش بھی کی گئی جبکہ وزیر بننے کے بعد ان کی ذاتی رہائش گاہ کو بم باندھ کر اڑایا گیا اور آگ بھڑک اٹھنے کے

باعث گھر کی حفاظت پر مامور چوکیدار زندہ جل گئے۔اسی عرصہ کے دوران ہی سوات کے ایک اور رُکن صوبائی اسمبلی وقار احمد خان کی رہائش گاہ پر طالبان حملہ آور ہوئے۔انہوں نے نہ صرف یہ کہ اُن کے گھر کو تباہ کر دیا بلکہ نتیجے کے طور پر ایم پی اے کے ایک بھائی اور ایک بھتیجے سمیت متعدد دوسرے لوگ بھی مارے گئے۔واجد علی خان کے بھائی کی شہادت کے بعد مینگورہ ہی کے ایک اور رُکن صوبائی اسمبلی ڈاکٹر شمشیر علی خان کو گزشتہ عید کے دوران خودکش حملے کا نشانہ بنا کر متعدد دوسرے لوگوں کے ہمراہ شہید کر دیا گیا جبکہ ان کی موت سے قبل ان کے دو دیگر رشتہ داروں کو بھی ٹارگٹ کر کے نشانہ بنایا گیا تھا۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق ارکانِ صوبائی اسمبلی، اے این پی کے عہدیداروں اور ان کے جن رشتہ داروں کو محض سوات میں نشانہ بنا کر شہید کیا گیا، ان کی تعداد دو سو سے زائد ہے۔ سوات کشیدگی سے قبل اے این پی اور حکومت کے حامیوں کی ایسی ہی ٹارگٹ کلنگ وزیرستان اور بعض دوسری ایجنسیوں اور شہروں میں ہو چکی ہے۔اس ضمن میں وزیرستان کی نامور شخصیت اور متلی خیل قبیلے (وزیر قبیلے کی سب سے بڑی شاخ) کے سربراہ مرزا عالم خان کی مثال دی جا سکتی ہے جن کو ان کے بھائیوں سمیت ڈی آئی خان میں شہید کیا گیا تھا۔وزیرستان کی دو ایجنسیوں میں ان کے علاوہ حکومت اور اے این پی کی حامی جن دوسری قابل ذکر شخصیات کو قتل کیا گیا، ان میں ملک طوطی، گل داوڑ، بسم اللہ خان دوتانی، شاہ عالم اور ظاہر شاہ خان شامل ہیں۔اے این پی کے ایک اور رہنما شاہ جہان کو ایسی ہی ایک کارروائی کے دوران 2008ء میں باجوڑ ایجنسی میں قتل کیا گیا تھا۔سیاسی پارٹیوں سے تعلق رکھنے والے رہنماؤں، ارکانِ اسمبلی اور عہدیداروں کیخلاف ایسی کارروائیوں پر زیادہ حیرت کا اظہار اس لئے نہیں کیا جاتا کہ ایسا ہونے کی گنجائش ہر جنگ میں موجود رہتی ہے، تاہم ان رہنماؤں کے رشتہ داروں خصوصاً معصوم جوانوں اور بچوں کو ٹارگٹ بنانے کے واقعات پر طالبان کے حامی بھی تشویش اور غصے کا اظہار کر رہے ہیں۔ایک برس قبل عید کے دوسرے روز اے این پی کے مرکزی صدر اسفندیار ولی خان کو جبکہ اس سے قبل آفتاب احمد خان شیرپاؤ اور افراسیاب خٹک سمیت دوسرے رہنماؤں کو بھی ماضی میں خودکش حملوں کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے۔شمشیر علی خان کے علاوہ اورنگزیب خان وہ دوسرے رُکنِ صوبائی اسمبلی تھے جن کو

پشاور میں نشانہ بنایا گیا۔ یہاں یہ بھی بتاتے چلیں کہ سیاسی مخالفین کے رشتہ داروں کے قتل کے اس قسم کے سلسلے کی ابتداء کابل میں طالبان کے داخلے اور مجاہدین کے انخلاء کے دوران ہوئی تھی۔ طالبان نے کابل میں داخلے کے بعد بائیں بازو کی ایک سیاسی جماعت کے اہم لیڈر ضالح محمد زیرے کے گھر میں گھس کر ان کی اہلیہ کے علاوہ ان کے پانچ بیٹے ذبح کر دیئے تھے۔ راشد حسین کی موت کے بعد ایک نئے رجحان کا خدشہ اب حقیقت کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ حملہ آور اب سیاستدانوں، وزراء اور اعلیٰ ترین حکام کو نشانہ بنانے میں ناکامی کے بعد ان کے قریبی رشتہ داروں کو نشانہ بنانے کی حکمت عملی اپنا سکتے ہیں۔ میاں افتخار حسین کے صاحبزادے کی شہادت کے روز متعدد لوگوں کو یہ کہتے سنا گیا کہ شہید اور گھر والوں کی کافی پہلے سے یہ خواہش تھی کہ ان کو بیرون ملک بھیجا جائے تاہم میاں افتخار حسین ہر بار یہ کہہ کر یہ خواہش رد کر دیتے کہ ایسا ہونے کی صورت میں لوگ یہ کہیں گے کہ انہوں نے اپنے بیٹے کو خوف کے باعث بیرونِ ملک بھیج دیا ہے۔ موت کا ایک دن مقرر ہے تاہم باہر جانے کی خواہش پوری کرنے کی بجائے راشد حسین اگلی دنیا کے ایسے سفر پر روانہ کر دیئے گئے کہ جہاں سے واپسی ممکن ہی نہیں ہے۔ حرف آخر کے طور پر انسانی ہمدردی اور احساس ذمہ داری کی بنیاد پر یہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ والدین کے کئے کی سزا اولاد کو نہیں ملنی چاہیے۔

وہ کون تھا؟

وہ سوات کے ایک چھوٹے سے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس کی ولادت کے چند ہی دنوں بعد اس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ وہ پانچ بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ ممتا کی محرومی کے باوجود وہ بلا کا ذہین تھا۔ اس کا والد ایک مقامی سکول میں پڑھاتا اور مقامی مسجد میں امامت بھی کرتا تھا۔ ابتداء میں والد نے تمام بچوں کی تعلیم پر بہت توجہ کی۔ والدہ کے انتقال کے بعد اس کے والد نے دوسری شادی کر لی۔ اُس کی سوتیلی ماں ایک روایتی عورت ثابت ہوئی اور اس نے گھر میں قدم رکھتے ہی ان بچوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ اس مرحلے پر باپ نے بچوں کو مکمل تحفظ فراہم کرنے کی بجائے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے اسے اور اس کے ایک بھائی کو سوات کے ایک مدرسے میں داخل کرا دیا۔ اس اقدام کا مقصد محض یہ تھا کہ بچوں کے فرائض سے جان چھڑائی جائے۔ وہ اور اس کا بھائی مدرسہ میں پڑھنے لگے اور اس نے چند مہینوں کے اندر ہی دینی علوم سیکھ کر دوسرے طلباء کے اندر اپنی ایک الگ پہچان بنا لی۔ ممتا کی محرومی، گھر سے دوری اور والد کے رویے نے اس کے اندر مزاحمت کی ایک ایسی لہر کو جنم دیا کہ وہ زندگی اور انسانوں سے نفرت کرنے لگا۔ اسی دوران طالبان نامی قوت کا ظہور ہوا تو پاکستان کے تمام مدارس سے اس تحریک کیلئے طلباء کی بھرتیاں شروع ہو گئیں۔ وہ بھی اس تحریک کا حصہ بن گیا۔ اس نے ہزارہ ڈویژن کے ایک کیمپ میں ابتدائی تربیت حاصل کی۔ پہلے مرحلے میں اسے کشمیر کے محاذ پر بھیجا گیا جہاں اس کی کارکردگی اور بہادری کو عملاً آزمایا گیا اور وہ اپنے استادوں کی آزمائش پر پورا اترا۔ دوسرے مرحلے میں اس کو قندھار بھیجا گیا، اس کے دوسرے بھائی نے ان سرگرمیوں کا حصہ بننے کی بجائے واپسی کی راہ اپنائی اور گاؤں آ کر محنت مزدوری کرنے لگا، البتہ وہ محاذ جنگ پر ڈٹا رہا۔ وہ روایتی جہادی نہیں تھا بلکہ عملی انسان ہونے کے علاوہ نظریات کا بھی پکا تھا۔ وہ قلبی اور ذہنی طور پر جہاد کا حامی اور داعی تھا۔ اس ضمن میں وہ اپنے مؤقف کے حق میں بے شمار دلائل دیا کرتا تھا۔ افغانستان کے مختلف محاذوں پر لڑنے کے دوران متعدد اہم کمانڈروں کے ساتھ اس کے قریبی مراسم پیدا ہوئے۔ وہ کشمیری اور پنجابی طالبان یا جہادیوں کے بھی بہت قریب تھا اور یہی وجہ تھی کہ جب مولانا مسعود اظہر بھارتی جیل سے رہائی

کے بعد سوات اور شانگلہ کے دورے پر آئے تو وہ ان کے حفاظتی دستے میں شامل تھا۔ بعدازاں وہ طویل عرصے تک ان کی تنظیم کے ساتھ وابستہ رہا۔ چونکہ اس قسم کی تنظیموں کو پاکستان کی مقتدر قوتوں کی آشیر باد حاصل تھی، اس لئے وہ بھی ان قوتوں کو نہ صرف یہ کہ پسند کرتا تھا بلکہ ان لوگوں کے ساتھ اس کا رابطہ بھی رہا کرتا تھا۔ وہ پاکستان کی افغان پالیسی کا حامی تھا اور کشمیر کی آزادی کا خواہش مند بھی۔ وہ بیک وقت افغان، کشمیری، پنجابی اور پشتون عسکریت پسندوں کے علاوہ بعض خفیہ اداروں کے ساتھ بھی مسلسل رابطے میں رہا۔

اس دوران افغانستان پر امریکہ اور اس کے اتحادی حملہ آور ہوئے تو اس کا بھائی اسے زبردستی سوات واپس لے آیا جہاں پر اس نے عام لوگوں کی طرح محنت مزدوری شروع کر دی۔ اس کے والد اور بڑے بھائی نے یہ سوچ کر اس کی شادی کر دی کہ ایسا ہونے کے بعد اس کی زندگی میں تبدیلی واقع ہو گی اور وہ امن اور سکون کی زندگی گزرنے لگے گا۔ شادی کے بعد اس کی زندگی میں واقعتاً تبدیلی رونما ہونے لگی۔ لیکن معاشی مجبوریاں اس کو ایک بار پھر پرانے راستے پر لانے کی وجہ بن گئیں اور حالات نے اسے چند برس کے وقفے کے بعد جہادی تنظیموں اور ان کے سرپرست ریاستی اداروں کے ساتھ ایک بار پھر رابطوں پر مجبور کر دیا۔ اب وہ مختلف اداروں اور تنظیموں کے درمیان رابطوں کا ایک ذریعہ بن گیا۔ اس نے وزیرستان کے کمانڈروں کے ساتھ بھی مراسم قائم کیئے، وہ ہفتوں اور مہینوں تک گھر اور گاؤں سے دور رہا کرتا تھا۔ اس دوران اللہ نے اس کو ایک خوبصورت بیٹا بھی عطا کیا۔ باپ بننے کے بعد اس کو اپنی ذمہ داریوں کا مزید احساس ہونے لگا۔ اس عرصہ کے دوران مولوی فضل اللہ نے سوات میں ریاست کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور اس طرح کے جوانوں کے ساتھ رابطے کر کے ان سے مزاحمتی تحریک کا دوبارہ حصہ بننے کی باقاعدہ درخواست کی۔ کافی عرصے تک وہ ان سرگرمیوں سے الگ رہا۔ اس کا خیال تھا کہ مولوی فضل اللہ اور ان کے ساتھی پاکستان اور اسلام کو نقصان پہنچانے اور سوات کو میدان جنگ بنانے کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کی پالیسیوں کو بہتر سمجھتے رہے اور ان کا مؤقف رہا کہ جہادیوں کو پاکستان کی بجائے افغانستان اور بھارت میں جنگ لڑنی چاہیے۔ سوات میں جب اس کے سابقہ استاد بھی طالبان کے ساتھ شامل ہو گئے تو وہ بھی مقامی طالبان

کے ایک گروپ کا حصہ بن گیا۔ اس دوران اس کو یہ کہتے بھی سنا گیا کہ وہ خفیہ اداروں کی ہدایت کے تحت طالبان کا حصہ بنا ہے۔ خفیہ اداروں کے ساتھ اس کا رابطہ قائم بھی رہا۔ یہی وجہ تھی کہ سواتی طالبان کو اس کی سرگرمیوں اور بعض مواقع پر مزاحمتی رویے پر سرزنش بھی کرنا پڑی۔ طالبان نے اس کو ڈرانے، دھمکانے اور مانیٹر کرنے سے بھی گریز نہیں کیا تاہم اس کی ذہانت، بہادری اور چالاکی اس کو محاسبے سے بچاتی رہی۔ سوات میں آپریشن کا آغاز کیا گیا اور طالبان کے گرد گھیرا سخت کر دیا گیا تو اس کی جان کو بھی خطرہ لاحق ہوا۔ اس کے گھر والوں نے نقل مکانی کی، لیکن وہ سوات میں ہی قیام کرنے پر مُصر رہا۔ گھر والوں خصوصاً اس کے تین سالہ خوبصورت اور ذہین بیٹے نے اس کو سوات چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ وہ شانگلہ کے راستے ہزارہ اور پھر وہاں سے پشاور آ گیا۔ وہ پولیس اور دوسرے اداروں سے چھپ کر رہنے لگا۔

کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ان لوگوں کے ساتھ اس کے ایک بار پھر رابطے قائم ہوئے، جن کے لیے وہ ماضی میں محدود پیمانے پر کام کیا کرتا تھا۔ ان لوگوں نے اس کو پھر سے اپنے نیٹ ورک کا حصہ بنا لیا۔ یہ کوئی حیرت کی بات اس لئے نہیں تھی کہ اس سمیت دوسرے بے شمار لوگ بھی متعلقہ لوگوں کے ساتھ وقتاً فوقتاً رابطے میں رہا کرتے تھے اور ایک دوسرے کو ممکنہ اور درکار معاونت فراہم کرتے تھے۔ اداروں کے ساتھ دوبارہ رابطوں کے بعد وہ پشاور، سوات اور کراچی کا سفر کرنے لگا اور گھر بہت کم جاتا۔ اس دوران پاکستانی فوج نے سوات میں اس کے بڑے بھائی کے گھر کو بارود سے تباہ کر دیا جبکہ اس کے والد کو بھی ایک بار پھر گرفتار کر لیا گیا۔ عجیب تماشا یہ تھا کہ سوات میں اس کو طالب کمانڈر سمجھا جاتا رہا جبکہ ادھر وہ اداروں کے ساتھ رابطوں کے باعث طالبان کے لیے مشکوک رہا۔ 26 جون کو وہ سوات سے پشاور اور وہاں سے کراچی چلا گیا۔ اس نے اپنے ایک بھائی کو بتایا کہ وہ چوہے بلی کے اس کھیل سے بے زار ہو کر کسی خلیجی ملک میں جانے کی کوشش میں ہے، تاکہ اپنے اکلوتے بیٹے کے مستقبل کو محفوظ اور آرام دہ بنا سکے۔ وہ بلا کا جرأت مند انسان تھا۔ لوگوں سے بہت محبت کرتا تھا، منافقت سے کوسوں دور تھا اور انتہائی غریب ہونے کے باوجود دل کا بہت سخی تھا۔ 26 جون کو وہ رات 10 بجے آئس کریم کھانے گھر سے نکلا تو دو نامعلوم افراد نے پستول سے تین فائر کر کے اس کو زندگی کی قید سے آزاد کر دیا۔ اس کی بیوی بیوہ ہو گئی جبکہ

اس کا اکلوتا بیٹا باپ کے سائے سے محروم ہو گیا۔ گولی کس نے چلائی ؟ اس کا نہ تو کوئی پتہ چلا اور نہ ہی پتہ چلنے کا کوئی امکان ہے کیونکہ اسی رات اس کے علاوہ بھی کراچی میں سات افراد کو ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس پوری کہانی سے یہ سوال اُبھرتا ہے کہ وہ طالب تھا، دہشت گرد تھا یا اداروں کیلئے کام کرنے والا محض ایک مہرہ۔ اس کو مثال بنا کر ہمیں اس جیسے دوسرے نوجوانوں کے بارے میں اب سوچنا ہی ہوگا۔
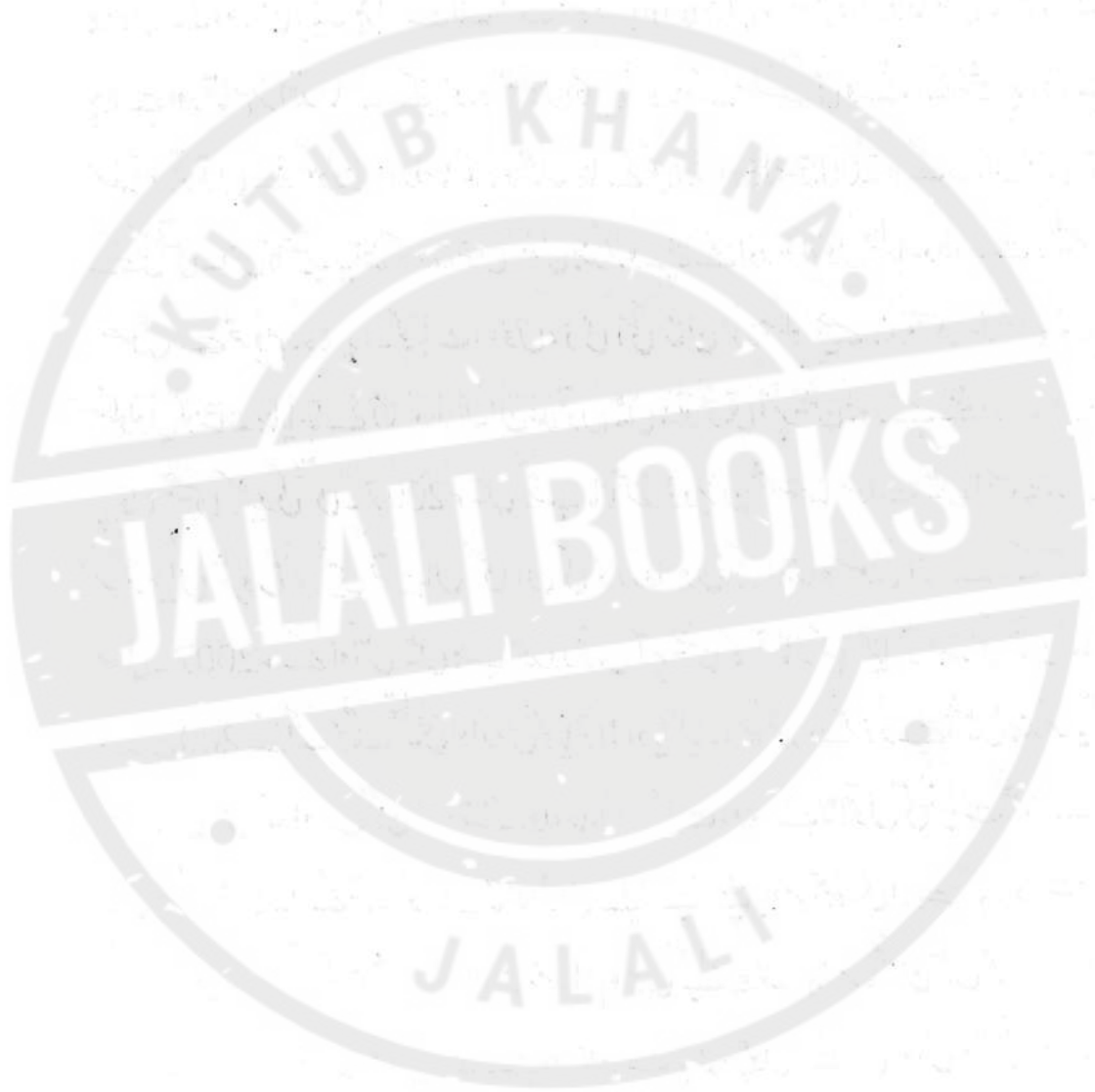
پڑھنا منع ہے

28 مئی کو بعض نامعلوم افراد یا تنظیموں کی جانب سے پشاور کے متعدد سکولوں کو بھیجے گئے دھمکی آمیز خطوط نے ہزاروں بچوں اور بچیوں کے علاوہ ان کے والدین کو بھی بدترین خوف اور تشویش میں مبتلا کر دیا۔ ان کا خوف بے جا اس لئے نہیں کہ صوبہ خیبر پختونخوا اور فاٹا میں گزشتہ چند برسوں کے دوران ایک ہزار کے لگ بھگ سکولوں اور کالجوں کو حملوں اور دھماکوں کا نشانہ بنایا جا چکا ہے اور تمام تر اقدامات کے باوجود حملوں کا یہ افسوسناک سلسلہ کسی وقفے کے بغیر جاری ہے۔ حملہ آور قوتوں نے سکولوں اور اساتذہ کو نشانہ بنانے کی ابتداء 06-2005ء کے دوران وزیرستان سے کی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ درجنوں سکول بند کر دیئے گئے اور ہزاروں طلباء و طالبات کو تعلیم کے حصول سے محروم ہونا پڑا۔ کوہاٹ، بنوں، ڈی آئی خان اور ہنگو جیسے بندوبستی علاقوں میں بھی سکولوں کو نشانہ بنایا جانے لگا، حالانکہ ان علاقوں میں نہ تو فوجی آپریشن ہو رہے تھے اور نہ ہی یہاں پر فاٹا جیسی کشیدگی تھی۔ 2007ء میں جب مالاکنڈ ڈویژن خصوصاً سوات میں انتہا پسندوں کی سرگرمیاں شروع ہوئیں تو یہاں بھی ان کی کارروائیوں کی ابتداء سکول اڑانے کے عمل سے ہوئی۔ 2007ء کے اوائل میں جب محدود فوجی آپریشن کا آغاز کیا گیا تو ابتدائی تین ماہ کے دوران 200 کے لگ بھگ تعلیمی اداروں کو یا تو اڑا دیا گیا یا دھماکوں کے ذریعے انہیں بند کرایا گیا۔ بعد ازاں اس تعداد میں تین گنا اضافہ ہوا، حالانکہ سوات دوسرے علاقوں کی نسبت تعلیم کے شعبے میں کافی بہتر بلکہ آگے تھا۔ خوشحال خاندانوں نے اپنے بچے بامر مجبوری ایبٹ آباد اور پشاور کے نجی سکولوں میں منتقل کرنا شروع کیے، تاہم عام لوگوں کیلئے چونکہ ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس لئے وہ لاچارگی اور بے بسی کی تصویر بنے رہے اور ان کے پاس بچوں کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا کہ ان کو سکول کیوں نہیں بھیجا جا رہا ہے۔ فاٹا اور سوات کے بعد انتہا پسندی کی لہر نے وادی پشاور کو اپنی لپیٹ میں لینا شروع کیا تو یہاں بھی درجنوں کے حساب سے سکولوں کو حملوں کا نشانہ بنایا گیا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق پشاور اور اس کے مضافات میں اب تک سو سے زائد سکولوں پر حملے کئے گئے ہیں، تیرہ بار مختلف سکولوں کی گاڑیوں جبکہ اتنی ہی تعداد میں اساتذہ کو نشانہ بنایا

جا چکا ہے۔ایسے ہی ایک حملے میں ۴ بجگی روڈ کی دو بہنوں کو شہید کیا گیا تھا۔تعلیم دشمن کارروائیوں کا یہ سلسلہ صرف حملوں تک محدود نہیں رہا بلکہ بیسیوں اساتذہ کو اس عرصہ کے دوران اغواء اور قتل بھی کیا گیا۔اس ضمن میں ہم دوسروں کے علاوہ اسلامیہ کالج یونیورسٹی کے وائس چانسلر اجمل خان کی مثال دے سکتے ہیں، جن کو اغواء ہوئے نصف سال ہوگیا ہے۔اس سے قبل سوات یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر کو بھی مردان میں شہید کیا گیا، جبکہ ایک اور وی سی لطف اللہ کاکا خیل بھی اغواء ہوئے تھے۔فاٹا اور ایف آر زمیں تو صورتحال اس قدر سنگین ہے کہ اس کا اکیسویں صدی میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ فاٹا میں صورتحال کس قدر خراب رہی، اس کا انداز محض اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ حکومت کو رزمک کیڈٹ کالج کو چار سال تک بند رکھنا پڑا اور خدا خدا کر کے 29 مئی کو اسے کھولنے کا اعلان کیا گیا۔اس سے قبل اسی کالج کی ایک سے زائد گاڑیوں کو طالب علموں سمیت اغواء بھی کیا گیا تھا۔حملہ آور قوتوں کی اس ضمن میں دلیل یہ رہی ہے کہ وہ سکولوں کی عمارتوں کو اس لئے بموں سے اڑاتے ہیں کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے انہیں اپنی کارروائیوں کے لیے استعمال کرتے ہیں، تاہم اس دلیل کو درست اس لئے قرار نہیں دیا جاسکتا کہ ان علاقوں کے سکولوں کو بھی بار بار نشانہ بنایا گیا جہاں پر حالات معمول کے مطابق تھے اور وہاں کسی قسم کی فوجی کارروائی نہیں ہو رہی تھی۔

افسوس ناک امر یہ ہے کہ یہ لوگ گرلز سکولوں کے علاوہ بوائز سکولوں پر بھی حملے کرتے ہیں اور اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ جو قوتیں تعلیمی اداروں کو تباہ کرنا چاہتی ہیں وہ فورسز یا حکومت کی نہیں بلکہ عوام، نئی نسل اور تعلیم کی دشمن ہیں۔اگر ایسا نہ ہوتا تو اب تک تعلیمی اداروں پر کئے جانے والے حملوں میں کمی واقع ہو جاتی یا عسکریت پسند تنظیمیں ایسا نہ کرنے کے باقاعدہ احکامات جاری کرتیں۔جن سکول کی تعمیر پر کئی مہینے اور لاکھوں روپے صرف ہوتے ہیں، ان کو تباہ کرنے میں چند منٹ بھی نہیں لگتے۔ایک طرف تو مقامی آبادی تعلیم کی سہولت سے محروم ہوتی جا رہی ہے، جبکہ دوسری طرف حکومت کا تعلیمی انفراسٹرکچر بھی متاثر ہو رہا ہے۔اس کے ساتھ ہی طالب علموں نئی نسل اور ان کے والدین میں بدترین قسم کا خوف اور عدم تحفظ بھی جنم لینے لگا ہے۔ ان کارروائیوں کا نتیجہ ہے کہ فاٹا اور صوبہ پختونخوا میں پرائمری کی سطح پر تعلیمی سلسلہ بری طرح متاثر

ہوا ہے۔اس ضمن میں ایک اور بڑا المیہ یہ رہا ہے کہ پشاور میں اب تک ایک درجن سے زائد عام دھماکے یا حملے ان اوقات میں کئے گئے، جب بچے سکول جانے کی تیاری کر رہے تھے یا راستے میں تھے۔چنانچہ ان بچوں پر ہولناک قسم کے نفسیاتی اثرات مرتب ہوتے ہیں جبکہ ان کے والدین کے خوف اور تشویش کا تو محض تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔والدین یا تو بچوں کو سکول بھیجنے سے گریز کرتے ہیں یا وہ ان کی بخیریت واپسی کیلئے آدھا دن خوف کی سولی پر لٹکے رہتے ہیں۔

سوات اور فاٹا کے مختلف علاقوں میں سکولوں کی تباہی کے باعث گرمی کی اس شدید لہر کے دوران بھی ہزاروں بچے کھلے آسمان تلے سبق پڑھنے پر مجبور ہیں اور حکومت کی سست روی یا فنڈز کی قلت کے باعث سکولوں کی تعمیر میں تاخیر ہو رہی ہے۔اس تلخ حقیقت میں کوئی شک نہیں کہ حملہ آور قوتیں بوجوہ ریاست اور معاشرہ کیخلاف برسر پیکار ہیں اور ان کی کارروائیوں میں کچھ عرصہ سے شدت آرہی ہے، تاہم ان کی خدمت میں یہ گزارش تو کی جاسکتی ہے کہ خدارا عام شہریوں کے ساتھ رعایت برتنے کی پالیسی اپنایئے اور نئی نسل کے مستقبل پر رحم کر کے ان سکولوں یا ہسپتالوں کو نشانہ بنانے سے گریز کریں جو عوام کے ٹیکسوں سے تعمیر کئے جاتے ہیں اور تباہ ہونے کے بعد ان کی تعمیر یا بحالی میں کئی کئی ماہ لگ جاتے ہیں۔حالیہ دھمکی آمیز خطوط کا بھی حکومت کو سنجیدگی سے نوٹس لینا چاہیے۔

قیامِ امن کے لیے چند تجاویز

متعدد سیاسی لیڈروں اور قارئین کی ایک بڑی تعداد کا خیال اور مشورہ ہے کہ دہشت گردی سے متاثرہ علاقوں کی حالت زار بیان کرنے اور اطلاعات اور تبصروں کے ساتھ اس امر پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ اس خطے یا سوات جیسے علاقوں کو مستقبل میں پرامن رکھنے اور ریاست کی عمل داری مستقل بنیادوں پر یقینی بنانے کے امکانات اور تجاویز پر بھی بحث ہونی چاہیے۔ دیکھا جائے تو اس مشورے کے پس منظر اور اہمیت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ پشتو زبان کے نامور شاعر رحمت شاہ سائل نے گلہ کیا کہ ہم سمیت میڈیا کے دوسرے ساتھی بھی ان سرگرمیوں کو بری طرح نظر انداز کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں، جن کو میڈیا کے ذریعے اجاگر کرنے سے دہشت گردی کے شکار عوام میں زندگی، امید اور امن کی خواہش پھر سے جنم لے سکتی ہے۔ ان کا مؤقف ہے کہ اگر میڈیا نے صحت مندانہ سرگرمیوں خصوصاً موسیقی اور شاعری کی محافل کو اجاگر کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا اور عوام کو امید دلانے کی کوشش کو اپنے صفحات اور نشریات کا حصہ بنانا شروع کیا تو اس سے خوف اور مایوسی کے موجودہ ماحول میں کمی واقع ہوگی۔ بلاشبہ میڈیا کے فرائض میں یہ شامل ہونا چاہیے کہ وہ نسبتاً پرامن ماحول کے اندر سے معمول کی سرگرمیوں اور خوشی کے لمحات کو عوام کے سامنے پیش کر کے گھٹن کے ماحول کو کم کرنے پر توجہ دے۔ سوات اور ایسے دوسرے علاقوں کو آئندہ اس قسم کے خوفناک حالات سے کیسے بچایا جائے؟ اس پر بہت بحث کی جا چکی ہے اور مزید کی جانی چاہیے کیونکہ اس بات کا قوی امکان موجود ہے کہ ماضی کی طرح ایسے علاقوں میں پھر سے کشیدگی اور جنگ کا ماحول پیدا ہو سکتا ہے۔ سوات میں ٹارگٹ کلنگ کے بڑھتے ہوئے سلسلے کو ایک نئی پالیسی کے تناظر میں ابھی سے جانچنے اور کنٹرول کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ بعض اطلاعات ایسی ہیں کہ حملہ آور مختلف گروپوں اور علاقوں میں گھس کر ان لوگوں کی فہرستیں ترتیب دے رہے ہیں، جنھوں نے آپریشن کے دوران حکومت اور فوج کو طالبان کے بارے میں معلومات فراہم کر کے جاسوسی کے جرم کا ارتکاب کیا۔ گزشتہ چند ہفتوں کے دوران متعدد افراد کو نشانہ بنایا جا چکا ہے۔ یہ اطلاعات بھی تشویشناک ہیں کہ سوات کے علاوہ بونیر اور شانگلہ کے دور دراز کے بعض علاقوں میں

طالبان پھر سے جمع ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ زیرِ نظر سطور میں ہم سوات قومی جرگہ کے ان مطالبات اور تجاویز کو شامل کر رہے ہیں جنہیں صاحب الرائے لوگوں نے زمینی حقائق کی روشنی میں امن کے مستقل قیام کیلئے تجویز کیا ہے۔ ان نکات کو اس لئے بھی ایک بار پھر سامنے لانے کی ضرورت ہے کہ ارباب اختیار کو ان کی ان ذمہ داریوں کا احساس دلایا جائے، جنہیں ہم تجزیہ کار اور عوام پاکستان کے امن اور استحکام کیلئے ضروری سمجھتے ہیں۔ سوات قومی جرگہ کے جو نکات یا مطالبے ہمارے باجرأت بھائی ضیاء الدین یوسفزئی نے بھیجے ہیں، ان کی تفصیل اور ترتیب کچھ یوں ہے۔

1- ان تمام افراد، گروپوں، لوگوں اور قوتوں کیخلاف سخت کارروائی کی جائے جنہوں نے طالبان کے ساتھ مذاکرات، صلح اور انہیں رعایت حق میں ریلیاں نکالیں اور دوسرے طریقوں سے ان کو معاونت فراہم کی۔ ایسے تمام لوگ دہشت گردوں کے ساتھی اور امن پسند لوگوں کے دشمن رہے ہیں۔

2- دہشت گردوں کیخلاف عوام میں شعور پیدا کرنے، ان کا راستہ روکنے اور ان کی مزاحمت کیلئے رائے عامہ ہموار کرنے کیلئے ان تنظیموں اور لوگوں کی معاونت اور سرپرستی کی جائے جو کہ امن خوشحالی اور ترقی پر یقین رکھتے ہیں اور امن کے قیام کیلئے ذاتی مفادات کی بجائے قومی اور ملکی مفادات کو مقدم جانتے ہیں۔ فوج اور عوام کے درمیان اعتماد سازی اور بہتر تعلقات کار کیلئے ایک مربوط نظام قائم کرنے پر توجہ دی جائے۔

3- سویلین ایڈمنسٹریشن کی بحالی اور فعالیت کیلئے فوری اور بروقت اقدامات کرنا اور انتظامی اور سیاسی معاملات میں پرامن اور بلاصلاحیت لوگوں کی شرکت کو ممکن بنانا تاکہ جمہوری قوتوں کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا جائے۔

4- صوبائی حکومت کی جانب سے پولیس شہداء کے ورثاء کیلئے نئے اعلان کردہ پیکیج میں سابق پولیس اہلکاروں کو بھی شامل کرنا تاکہ ان کے ورثاء کے ساتھ زیادتی نہ ہو اور ان کی قربانیوں کا اعتراف بھی کیا جا سکے۔ دھماکوں اور حملوں کے دوران ہلاک ہونے والے قومی مشران، عام لوگوں اور دوسرے ملازمین کے ورثاء کو بھی پولیس کی طرح معاوضے ادا کیے جائیں۔

5- جن ہوٹلوں میں فوجی جوان قیام پذیر ہیں، وہ یہ ہوٹل ان کے مالکان کو رضا کارانہ طور پر واپس کردیں یا مالکان کو باہمی رضا مندی سے مناسب کرایہ ادا کیا جائے اور جن لوگوں کی املاک کو نقصان پہنچا ہے، ان کو معاوضوں کی ادائیگی یقینی بنائی جائے۔

6- گرفتار دہشت گردوں پر فوری اور مؤثر مقدمے چلانا، مفرور افراد کی گرفتاریوں کو ممکن بنانا اور شک کی بنیاد پر گرفتار ہونے والے بے گناہ افراد کو رہائی دلانے کیلئے ٹھوس اقدامات کرنا۔

7- کراچی کی طرز پر صنعت کاروں، ہوٹلوں کے مالکان اور دوسرے طبقوں کیلئے امدادی پیکیج کا اعلان کرنا۔ کاروباری سرگرمیوں کی بحالی کیلئے بلاسود قرضوں کا اجراء کرنا، قرضوں کو معاف کرنا اور یوٹیلٹی بلز کی معافی دینے جیسے اقدامات کرنا۔

8- جنگ بندی کے دوران عوام کے ساتھ بہتر طور پر پیش آنا اور علاقے کے عوام کی روایات اور ثقافت کا احترام کرنا۔

9- سوات کی تعمیر نو کیلئے عالمی برادری کے ساتھ رابطے فعال بنانا اور عوامی نمائندوں کے ساتھ ساتھ قومی مشران اور دوسرے متعلقہ حلقوں کے تعاون سے شفاف، تیز اور فعال میکانزم تشکیل دینا تاکہ کوئی کوتاہی نہ ہو۔

10- سوات میں سپریم کورٹ اور ہائیکورٹ کے بینچ قائم کرنا اور اس بات کو یقینی بنانا کہ تمام لوگوں کو شناختی کارڈ جاری ہوں۔

11- پاک فوج اور عوام کے درمیان احترام اور محبت پر مبنی تعلقات قائم کرنا اور فوج کی جانب سے عام لوگوں سے بیگار لینے کا خاتمہ کرنا۔

12- وزارت داخلہ کی جانب سے سیاحوں کی آمد پر عائد پابندی ختم کرنا، سیاحوں کو تحفظ اور سہولیات فراہم کرنا تاکہ سیاحت کی صنعت پھر سے بحال ہو اور معیشت کو سہارا مل سکے۔ اس امر کو یقینی بنانا کہ جو عناصر علاقے کی تباہی اور پاکستان کی بدنامی کا باعث بنے ہیں ان کو مزید کسی تاخیر کے بغیر انصاف کے کٹہرے میں کھڑا کر کے سخت سزائیں دی جائیں۔

اگر ان نکات یا مطالبات کا بغور جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اگر حکومت نے عوام

کے مطالبات پر مشتمل ان تجاویز پر فوری عمل کیا اور عوام کو اعتماد میں لیکر آگے بڑھتی رہی تو نہ صرف یہ کہ عوام کا ریاست پر اعتماد بحال ہو جائے گا بلکہ آئندہ سوات اور ایسے دوسرے علاقوں میں ان عناصر کے اثر و رسوخ حاصل کرنے کا راستہ بھی بند ہو جائے گا جو کہ پاکستان کی سلامتی اور عوام کی خوشحال کیلئے خطرہ بنتے رہتے ہیں۔سوات قومی جرگہ جیسی تنظیموں کی موجودگی اور ان کی تجاویز حکومت اور فورسز کیلئے کسی غنیمت سے کم نہیں ہیں، کیونکہ کوئی بھی جنگ عوام کی مدد کے بغیر نہیں جیتی جاسکتی۔ چند روز قبل امن تحریک نامی ایک اور موئثر تنظیم کے پلیٹ فارم سے پشاور میں منعقدہ ایک مذاکرہ کے دوران بھی ایسی ہی سفارشات اور مطالبات کیئے گئے تھے۔امن تحریک نے فورسز اور حکومت سے بڑی شدت کے ساتھ اعداد وشمار اور واقعات کو بنیاد بنا کر یہ مطالبہ بھی کیا تھا کہ پاکستان کی سلامتی کی خاطر پنجابی طالبان کیخلاف بھر پور کارروائی کی جائے تا کہ پاکستان کے استحکام اور ایک پرامن معاشرے کے قیام کو یقینی بنانے کے علاوہ ملکی ترقی کا راستہ بھی ہموار کیا جائے۔ضرورت اس اَمر کی ہے کہ صاحب الرائے لوگوں اور ایسی تنظیموں کی تجاویز، مشاورت اور مطالبات کو پوری توجہ سے سنا جائے۔

ڈیورنڈ لائن انڈر پریشر

ڈیورنڈ لائن کے اطراف میں جاری شورش اور جنگ ایک نئے مرحلے میں داخل ہوگئی ہے۔ عالمی اور علاقائی قوتیں اور ریاستیں اپنے اپنے مفادات کے تناظر میں نئی صف بندیوں میں مصروف ہوگئی ہیں، جبکہ ایک دوسرے پر نفسیاتی دباؤ ڈالنے کا سلسلہ بھی عروج پر ہے۔ یہ واضح نہیں ہورہا کہ امریکی اور اتحادی افواج 2012ء، میں افغانستان اور خطے سے واقعتاً نکل بھی رہی ہیں یا نہیں۔ امریکی حکام اس ضمن میں کوئی واضح اعلان کرنے سے گریز کی پالیسی پر عمل پیرا دکھائی دے رہے ہیں جبکہ بعض اطلاعات کے مؤجب پینٹاگون اور وائٹ ہاؤس کے درمیان اس معاملے پر سنجیدہ نوعیت کے اختلافات پائے جاتے ہیں، انہیں سیاسی اور عسکری قوتوں کے درمیان اختلافات کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔ دوسری طرف امریکی صدر اوباما کے سیاسی مخالفین موجودہ امریکی انتظامیہ پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ افغانستان اور خطے میں امریکی مفادات کے تحفظ اور اہداف کے حصول کے بغیر فوجیں نکالنے کا کوئی اقدام نہ کیا جائے۔ افغانستان کا دورہ کرنے والے غیر جانبدار مبصرین کی رائے ہے کہ امریکہ اس وقت تک افغانستان سے نکلنے کا کوئی منصوبہ نہیں بنائے گا، جب تک وہ اپنی پسند کا متبادل سیاسی نظام قائم نہیں کرلیتا یا طالبان کی کمر توڑنے کے لئے آئندہ چند ماہ کے دوران انتہائی جارحانہ رویہ اختیار نہیں کرتا۔ جنرل پیٹریاس اور جنرل مائیک مولن امریکی سیاسی قیادت کے افغانستان سے فوج کے انخلاء کے فیصلے سے خوش نظر نہیں آرہے، جبکہ سی آئی اے کے بارے میں بھی یہی تاثر پایا جاتا ہے۔ جنرل پیٹریاس کو امید ہے کہ وہ آئندہ چھ ماہ کے دوران طالبان اور ان کے حامیوں کو پسپا کر کے ان کے القاعدہ کے ساتھ روابط ختم کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے، بلکہ وہ طالبان کو امریکی شرائط پر مذاکرات کی میز پر لانے میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جنرل پیٹریاس گزشتہ چند ماہ کے دوران فوجی

کارروائیوں میں تیزی لانے اور گوریلا حملوں کی تیکنیک استعمال کرنے پر بہت زیادہ توجہ دیتے نظر آئے ہیں۔ وہ فضائی حملوں کی بجائے زمینی کارروائیوں کو بہت اہمیت دے رہے ہیں اور اس حکمتِ عملی کے ماضی کے برعکس خاصے بہتر نتائج نکلنے کی اطلاعات ہیں۔ امریکی کارروائیوں کے ساتھ ہی طالبان کے حملوں کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی ہے اور وہ جنوبی افغانستان میں اپنی سرگرمیاں بڑھاتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ حملوں میں دوطرفہ شدت آنے سے یہ تاثر پیدا ہوا ہے کہ اس جنگ کے دو بڑے فریق یعنی طالبان اور امریکہ 2012ء سے قبل ایک دوسرے پر دباؤ ڈال کر بارگیننگ میں بہتر پوزیشن حاصل کرنے کی تگ و دو میں مصروف عمل ہیں، کیونکہ اس حقیقت کا دونوں کو پوری طرح علم ہے کہ کسی ایک بھی فریق کے لئے اس جنگ میں مکمل فتح پانا یقینی نہیں ہے۔ اس حقیقت کو طالبان بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اگر امریکہ اور اس کے اتحادی یہ جنگ جیت نہیں رہے، تو طالبان اور ان کے اتحادی بھی جنگ جیتنے یا حکومت قائم کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ امریکہ اپنے مکمل مقاصد کے حصول میں ناکامی کے باوجود سپر پاور کی اپنی حیثیت کے پیشِ نظر افغانستان سے لاتعلق نہیں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ افغانستان میں اپنے اڈوں کو اپ ڈیٹ کرنے میں مصروفِ عمل ہے اور دوسرے متعلقہ منصوبوں کے لئے اربوں ڈالرز مختص کر کے عالمی تعمیراتی اداروں کو 2018ء اور 2022ء تک کے عرصہ کے لئے ٹھیکے دے چکا ہے۔ اس قدر خطیر سرمایہ کاری سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ امریکہ، افغانستان سے 2012ء تک انخلا کے اعلان پر قائم نہیں رہ سکے گا یا بعض علاقوں میں اہم اڈے قائم رکھے گا۔

امریکی حکام کی جانب سے سامنے آنے والے بیانات سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا رہا ہے کہ امریکہ انخلاء کے اپنے اعلان کے باوجود بعض دوسرے آپشنز پر بھی کام کر رہا ہے۔ اس اہم مسئلے پر ڈیموکریٹس اور ریپبلکنز کے علاوہ امریکی رائے عامہ بھی تذبذب کا شکار ہے۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق اکثر عوامی حلقے یہ چاہتے ہیں کہ اگر حکومت اپنے مقاصد کی تکمیل میں کامیاب نہیں ہو رہی تو اسے چاہئے کہ امریکی معیشت پر مزید بوجھ ڈالنے کی بجائے افغانستان سے فوج کے انخلا کو اعلان کردہ مدت کے دوران یقینی بنائے۔ تاہم ان بااثر حلقوں کی بھی کوئی کمی نہیں ہے، جن کا خیال ہے کہ اتنی بڑی سرمایہ کاری کرنے اور قربانیاں دینے کے باوجود افغانستان سے مقاصد کے حصول

کے بغیر اس طرح ناکام نکلنا امریکی شان اور ساکھ کے لئے کسی بھی طور مناسب اور سودمند نہیں ہے۔ امریکی سروے کے مطابق 55 سے 60 فیصد امریکی شہری افغانستان سے فوجوں کے انخلا کے حق میں تھے، جبکہ 30 فیصد مقاصد کے حصول کے لئے مزید اقدامات کرنے کے حامی تھے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ امریکی حکام، میڈیا اور سیاستدانوں کے علاوہ رائے عامہ بھی اس اہم ایشو پر تقسیم کا شکار ہے؟ پاکستان اور افغانستان میں بھی متعدد ایسے بااثر حلقے موجود ہیں، جن کا خیال ہے کہ اگر امریکہ نے افغانستان کو ایک بار پھر شورش میں چھوڑ کر واپسی کا راستہ اختیار کیا تو اس کے خاصے خطرناک نتائج برآمد ہوں گے اور طالبان ایک بار پھر خطے کے لئے خطرہ بن جائیں گے۔ اگرچہ پاکستان اب بھی افغان طالبان کو اپنا ہمدرد اور دوست سمجھ رہا ہے، تاہم اس تلخ حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ طالبان سمیت بہت سے افغان گروہ بھی اب پہلے کی طرح پاکستان پر اعتماد کرنے پر تیار نہیں ہے۔ پاکستان کی کوشش ہے کہ اپنے مفادات کے حصول کے لیے افغانستان میں اپنے کردار کو بڑھائے بلکہ اپنے حامی طالبان کو کابل میں اہم کردار دینے کی اپنی ضرورت کو بھی پورا کرے، جس کے باعث پاکستان تمام تر مشکلات اور امریکی دباؤ کے باوجود اپنے مفادات کے حصول کے لیے امریکہ پر دباؤ ڈال رہا ہے۔

پاکستان، ایران، سعودی عرب اور ترکی وہ اسلامی ممالک ہیں جو کہ افغانستان کے معاملے میں نہ صرف یہ کہ غیر معمولی دلچسپی لے رہے ہیں، بلکہ بعض حلقے ان ممالک کو اس سارے معاملے میں اہم فریق بھی تصور کر رہے ہیں۔ ترکی نے حال ہی میں طالبان کو دفاتر قائم کرنے کی پیشکش کی ہے، تاکہ طالبان کی قیادت کو کسی ممکنہ آپشن یا فارمولے پر آمادہ کیا جاسکے۔ پاکستان اور ایران نے ترکی کی اس پیشکش کی کوئی مخالفت نہیں کی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ترکی مستقبل قریب میں اس معاملے میں اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔ بعض حلقوں کے مطابق ترکی کے اس فارمولے کو سعودی عرب کی آشیر باد بھی حاصل ہے، تاہم ابتدائی اطلاعات کے مطابق طالبان نے اس پیشکش کو قبول کرنے سے معذرت کر لی ہے اور مؤقف اپنایا ہے کہ ترکی چونکہ نیٹو کا ممبر ہے اور اس کی افواج طالبان کے خلاف لڑ بھی رہی ہیں، اس لئے ترکی کی اس پیشکش کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے باوجود بعض باخبر حلقوں کا کہنا ہے کہ ترکی اہم کردار ادا کرنے جا رہا ہے اور اس ضمن میں بڑی پیش

رفت کے امکان کو مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ افغانستان کی حکومت بھی یہ چاہتی ہے کہ امریکی افواج کا عمل دخل کم ہو، کیونکہ کافی عرصہ سے دونوں فریقین کے درمیان بعض اہم ایشوز پر اختلافات موجود ہیں۔ افغان حکومت چاہتی ہے کہ امریکہ افغانستان کی سکیورٹی کے معاملات افغان فورسز کے حوالے کرنا شروع کر دے۔ افغان حکومت افغانستان میں امریکہ کی مکمل موجودگی کے بجائے لاجسٹک اور اقتصادی تعاون کے ایک ٹھوس فارمولے کا مطالبہ کر رہی ہے اور چاہتی ہے کہ اسے طالبان کے ساتھ مذاکرات اور مفاہمت کا کھلا اختیار بھی دیا جائے۔ یہاں یہ نشاندہی کرنا ضروری ہے کہ 11-2010ء کے مالی سال کے لئے امریکہ نے افغانستان کے لئے 120 ارب ڈالرز دفاعی شعبے میں مختص کرنے کا اعلان کیا تھا، جبکہ افغانستان کی تعمیر نو اور اقتصادی ترقی کے لئے مختص کی گئی رقم صرف 4 ارب ڈالرز تھی۔ اسی نامناسب حکمتِ عملی نے افغان حکومت کی شکایات میں بہت اضافہ کیا کیونکہ افغان حکومت چاہتی ہے کہ تعمیرِ نو کے لئے رکھی گئی رقم غیر معمولی طور پر بڑھا دی جائے تاکہ ملک کی ترقی اور خوشحالی کی رفتار بڑھ جائے اور اس کے ادارے مضبوط ہوں۔

پاکستان میں اے این پی اور پی پی پی فی الحال افغانستان سے امریکی فوج کے انخلاء کے حق میں نظر نہیں آ رہی ہیں، کیونکہ ان کا خیال ہے کہ اگر سیاسی حل کے بغیر امریکہ خطے سے نکل گیا یا اس نے اپنے قیام کے فیصلہ کن اہداف حاصل کرنے کے لیے اقدامات نہیں کیے تو پاکستان کی مشکلات میں اضافہ ہوگا، تاہم عسکری قیادت کی حکمتِ عملی حکومت یا ان سیاسی جماعتوں کے مؤقف سے اسی طرح مختلف ہے، جیسا کہ امریکہ میں ہے۔

25 اپریل کے روز قندھار جیل سے 500 کے لگ بھگ جو قیدی فرار ہوئے، ان میں 200 طالبان جنگجو بھی تھے۔ اس واقعہ نے امریکی تشویش میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے کیونکہ قندھار میں ہی اتحادی اور افغان فورسز کو بہت زیادہ مزاحمت بلکہ ناکامی کا سامنا ہے۔ فرار ہونے والے طالبان جنگجوؤں کے باعث حملہ آوروں کی قوت میں اور بھی اضافہ ہوگا کیونکہ ان میں پچاس سے زائد اہم طالبان کمانڈر بھی شامل بتائے جاتے ہیں۔ اس سے قبل 2008ء کے دوران بھی قندھار جیل سے 1000 قیدی فرار کرائے گئے تھے۔ ان میں بھی نصف سے زائد طالبان تھے اور ان کے فرار سے طالبان کے حملوں کی شدت اور ان کی قوت میں خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔

پاکستان اور امریکہ کے دوطرفہ تعلقات کو نارمل بھی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ پاکستان امریکہ پر دباؤ بڑھا رہا ہے کہ وہ افغانستان میں اسے اہم کردار دے اور ملک کے قبائلی علاقوں میں ڈرون حملوں کا سلسلہ بھی ترک کر دے جبکہ دوسری طرف امریکہ کا مطالبہ ہے کہ وہ ڈرون حملوں اور دوسرے اقدامات کا سلسلہ اس وقت تک جاری رکھے گا جب تک پاکستان شمالی وزیرستان میں مبینہ طور پر موجود حقانی نیٹ ورک اور ان کے اتحادیوں کے خلاف فیصلہ کن آپریشن کر کے افغانستان پر ہونے والے حملوں کے خاتمے کو یقینی نہیں بناتا۔ پاکستان امریکہ کے اس مطالبے پر عمل کرنے پر ہنوز آمادہ نہیں ہوا، حالانکہ اس ضمن میں اپریل کے مہینے میں واشنگٹن میں سی آئی اے اور آئی ایس آئی کے سربراہوں کی ایک اہم ملاقات بھی ہوئی، جبکہ دونوں ممالک کی افواج کے سربراہان بھی راولپنڈی میں ملاقات کر چکے ہیں۔ ان ملاقاتوں کا مختصر خاکہ یہی بنتا ہوا دکھائی دیتا ہے کہ فریقین ایک دوسرے کے مطالبات ماننے پر تیار نہیں ہیں، جس کے باعث دونوں ممالک میں تناؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ ایک سپر پاور اور اس کا ایک کمزور اتحادی اپنے دوطرفہ تعلقات میں پیدا ہونے والے اس تناؤ کو کم کرنے کے لیے اپنے اپنے مفادات کے تناظر میں اس کا کیا حل نکالتے ہیں، اس کے بارے میں تاحال یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ شاید اس تناؤ کا نتیجہ ہی ہے کہ پاکستان کے سیاسی اور عسکری حلقوں میں ڈرون حملوں کی مخالفت بڑھ گئی ہے اور اس ایشو نے اپریل کے مہینے میں بہت زیادہ اہمیت حاصل کر لی۔ یہاں تک کہ اے این پی، پی پی پی اور ایم کیو ایم جیسی سیاسی قوتیں بھی عسکری مؤقف کی تائید میں پہلی بار کھل کر سامنے آ گئیں۔ پاکستان میں مارچ 2004ء سے ڈرون حملوں کا سلسلہ جاری ہے، تاہم کسی بھی اہم پارٹی نے اس کے خلاف نہ تو کھل کر آواز اٹھائی اور نہ ہی کوئی تحریک چلائی۔ اب سیاسی مخالفت کی شرح کافی زیادہ ہے۔ چنانچہ ان حالات کے تناظر میں یہ کہنا بجا ہوگا کہ خطے کے حالات اور فریقین کے تعلقات انتہائی اہم مگر نازک مرحلے میں داخل ہو گئے ہیں اور اس ضمن میں آئندہ چند ماہ انتہائی اہم ہیں۔

بہتری کی شاہراہ پر گامزن افغانستان

افغان طالبان کے مسلسل حملوں اور عوام میں امریکہ کے خلاف موجود نفرت کے باوجود افغانستان میں گزشتہ چند برسوں کے مقابلے میں حالات بہتر ہوئے ہیں اور افغانستان کی عوام مطمئن و آسودہ حال نظر آ رہی ہے۔ زمینی حقائق اور عوام کی خواہشات کے تناظر میں اگر آج کے افغانستان کا تجزیہ کیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ افغان عوام اور مختلف گروہ گزشتہ 30 برسوں سے جاری جنگ و جدل سے تنگ آ کر مزاحمت کے بجائے مفاہمت اور جنگ کے برعکس سیاست کے ذریعے اپنے اختلافات' معاملات اور سیاسی تنازعات حل کرنے کا راستہ اپنا رہے ہیں۔ ریاستی اور سفارتی حلقوں اور روایتی تجزیہ نگاروں کے برعکس اگر جلال آباد اور کابل کے شہریوں کی رائے معلوم کرنے کی کوشش کی جائے، تو اندازہ ہوتا ہے کہ افغان عوام نے 30 سال کی عالمی سازشوں' غیر ملکی مداخلت اور مختلف گروہوں کی آپس کی لڑائیوں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ عالمی متحارب قوتوں نے اپنے اپنے مفادات کے لئے غیور مگر سادہ لوح اور اسلام پسند افغانوں کو استعمال کر کے ان کی سرزمین کو عالمی اور علاقائی تنازعات کا میدان جنگ بنا کر تباہ کر دیا ہے۔ جلال آباد شہر میں نہ صرف یہ کہ زندگی رواں دواں نظر آتی ہے، بلکہ شہر میں ترقی اور تعمیرِ نو کا عمل دیکھ کر افغانیوں کی ہمت اور جدوجہد کی داد دینا پڑتی ہے۔ شہر کے دوسرے کونے پر دریائے کابل کے کنارے تعمیر کیے گئے پکنک سپاٹ میں شام کے وقت لوگوں کی آمد اور ان کی تعداد دیکھ کر یہ یقین پختہ ہو جاتا ہے کہ افغان عوام اگر مزاحمت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تو وہ اپنے ملک کی تعمیر و ترقی کے علاوہ پر امن لوگوں کی طرح زندگی گزارنے کا سلیقہ بھی جانتے ہیں۔ جلال آباد میں پشاور اور صوبہ سرحد سے تعلق رکھنے والے مختلف شعبوں کے کاریگروں کو افغانیوں کے ساتھ معقول تنخواہوں پر کام کرتے دیکھ کر کبھی کبھی یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے آپ پشاور کے کسی علاقے میں ہوں۔ شہر میں گھومتے وقت سکیورٹی کے نام پر ان چیک پوسٹوں اور دوسری رکاوٹوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے، جن کا ہم اپنے شہر پشاور میں گزشتہ تین برسوں سے سامنا کر رہے ہیں اور اب ان کے عادی ہو چکے ہیں۔ مرکزی شاہراہ پر بھی چیکنگ پاکستان کے مقابلے میں بہت کم ہے۔

عالمی اور مخصوص پاکستانی میڈیا کی رپورٹوں اور تجزیوں کے برعکس کابل شہر طالبان کے حملوں اور دوسرے خطرات کے باوجود خاصا پرامن اور پرسکون دکھائی دیتا ہے۔ امریکی وزیر دفاع رابرٹ گیٹس (اب ریٹائر ہو چکے ہیں) کابل آئے تو دو شاہراہوں کے علاوہ شہر کی باقی سڑکوں پر گاڑیوں اور عوام کی آمد و رفت کا سلسلہ معمول کے مطابق جاری تھا۔ سڑکوں پر ناکہ بندیاں نہیں کی گئی تھیں اور نہ ہی راستے بلاک کیے گئے تھے جبکہ لوگوں کی جامہ تلاشی بھی نہیں لی جا رہی تھیں۔ شام کے وقت مقامی لوگ اپنے خاندانوں کے ہمراہ شہر کے سیاحتی مقامات کا رُخ کر کے خوشگوار حیرت کا باعث بنتے ہیں، کیونکہ پاکستان یا کسی اور ملک میں موجود میڈیا کی رپورٹس پر انحصار کرنے والے لوگ یہی نتیجہ اخذ کر رہے ہیں کہ جلال آباد' کابل اور دوسرے شہر بدترین جنگ' حملوں' خوف' پسماندگی اور جہالت کا نقشہ پیش کر رہے ہوں گے۔

امریکہ کی مخالفت سے قطع نظر اس حقیقت کو بھی صاحب الرائے حلقوں اور عام لوگوں سے ملنے کے بعد تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے کہ افغان عوام صرف امریکہ سے ہی نالاں نہیں ہیں بلکہ وہ القاعدہ' پاکستان' ایران اور سعودی عرب سمیت ہر اس ریاست یا قوت کو بھی ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھ رہے ہیں، جو افغانستان میں مداخلت کی مرتکب ہوتی رہی ہے۔ افغان عوام کے علاوہ حکومت میں موجود بعض حلقے بھی افغان طالبان کو اپنی مٹی کے بیٹے قرار دے کر یہ امید لگائے بیٹھے ہیں کہ وہ القاعدہ اور دوسری عسکریت پسند تنظیموں یا قوتوں سے بہت جلد الگ ہو جائیں گے اور افغانستان کی سیاست اور ریاست کا حصہ بن کر امن کے قیام کو مستقل بنیادوں پر ممکن بنائیں گے۔ وہ ماضی کو فراموش کر کے مستقبل پر نظر رکھنے کے فارمولے پر چلتے ہوئے دکھائی دینے لگے ہیں۔ وہ ایران اور پاکستان سے محبت کرتے ہیں، تاہم افغانستان میں ان ممالک کی مداخلت کو انتہائی ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ پاکستان خصوصاً پشتون بیلٹ میں جاری عسکریت پسندی یا دہشت گردی پر متفکر دکھائی دیتے ہیں، تاہم وہ اسے پاکستان کی اس جہادی پالیسی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں جو کہ اس ملک نے 80 کی دہائی میں افغانستان کے لئے تشکیل دی تھی اور اس پالیسی میں امریکہ کا ایک قائدانہ اور کلیدی کردار تھا۔ وہ اس اَمر کو سراہتے ہیں کہ افغان طالبان پاکستانی عسکریت پسندوں کی طرح عام شہریوں' مساجد' حجروں' جرگوں اور مارکیٹوں کو نشانہ نہیں بناتے اور اس پالیسی کو وہ افغان

طالبان کے سیاسی وژن اور مثبت سوچ کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ افغان عوام متعدد شکایات کے باوجود پاکستان کو اپنا دوسرا گھر سمجھتے ہیں، تاہم وہ بھارت کو بھی پسند کرتے ہیں اور افغانستان کی تعمیر نو میں بھارت کی دلچسپی اور عملی اقدامات کو سراہنے کے علاوہ ویڈیو شاپس پر یہ استفسار کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ امیتابھ بچن، شاہ رخ خان، سلمان خان اور عامر خان کی نئی فلم کب ریلیز ہوگی۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ اندرون خانہ بہت سی منفی یا خطرناک پالیسیوں پر عمل پیرا ہونے یا ان الزامات کے باوجود افغان عوام پاکستان اور ایران کی نسبت بھارت کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس تاثر کو تمام تر اختلافات کے باوجود بھارت کی سفارت کاری اور رابطوں کا بہترین نتیجہ قرار نہ دینا حقائق سے نظریں چرانے والی بات ہوگی۔

حکومت اور سیاسی جماعتوں کے نمائندوں کے علاوہ عام لوگوں میں بھی یہ تاثر عام ہے کہ پاکستان اور افغانستان کے پشتونوں میں قریبی رابطے اور تعلقات ہونے چاہئیں اور چار کروڑ سے زائد پشتونوں کو امن اور خوشحالی کے ذریعے اپنی زندگی گزارنے کا حق ملنا چاہیے، تاہم وہ پشتون قوم پرستوں خصوصاً اے این پی کے کردار اور پالیسیوں پر انگلی اٹھانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ 1980ء کے بعد اے این پی نے افغانستان سے بہت کچھ حاصل کیا مگر اسے دیا کچھ نہیں ہے، یہاں تک کہ اے این پی کے رہنماؤں اور خوانین نے مجاہدین اور ان کے بعد افغانستان پر طالبان کے قبضے سے پیدا ہونے والی صورتحال کے دوران ان افغان رہنماؤں کو پناہ تک فراہم نہیں کی جو اپنے دورِ اقتدار میں اے این پی کے رہنماؤں کو کابل اور جلال آباد میں خصوصی پروٹوکول دیا کرتے تھے۔ اے این پی اور افغان حکومت کے درمیان موجود رسمی تعلقات کو وہ اپنے اسلاف کے روایتی سلسلے کا تسلسل قرار دیتے ہیں۔

کابل میں آج کل پشتو زبان میں لکھی گئی ایک کتاب کا بہت چرچا ہے۔ اس کتاب میں اے این پی کے موجودہ صوبائی صدر افراسیاب خٹک کے بارے میں بہت سے چونکا دینے والے انکشافات شامل ہیں۔ اگر ان انکشافات کو حقیقت تسلیم کیا جائے تو خطے کی سیاست کے حوالے سے بہت سے سوالات اور خدشات سر اٹھائے کھڑے نظر آئیں گے۔ افغان حکومتی حلقوں میں جن پاکستانی رہنماؤں کا نام احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے، ان میں افضل خان لالا، محمود خان

اچکزئی، اجمل خٹک مرحوم، آفتاب احمد شیر پاؤ اور صدر آصف علی زرداری شامل ہیں۔ یہ حلقے جنرل مشرف کے مقابلے میں جنرل کیانی اور صدر بش کے مقابلے میں صدر اوباما کے کردار اور پالیسیوں کو بھی محتاط انداز میں سراہتے ہیں۔ افغان عوام اور بہت سے سیاسی حلقے 'بُلٹ' پر 'بیلٹ' کو ترجیح دے کر افغان پارلیمان میں طالبان اور حزب اسلامی کے حامیوں کی موجودگی کو ایک جمہوری افغانستان کے قیام کی طرف ایک بڑی پیش رفت قرار دے رہے ہیں۔ وہ طالبان، حزب اسلامی اور کرزئی حکومت کے درمیان مفاہمتی رابطوں کو قیام امن کے لئے ناگزیر تصور کرتے ہیں، تاہم ان کی اکثریت اس بات سے متفق نہیں ہے کہ طالبان کی مزاحمت کے نتیجے میں امریکہ اور اس کے اتحادی افغانستان سے جلد نکل جائیں گے۔ وہ اپنی بات چیت اور دلائل کے دوران بتاتے ہیں کہ طالبان، پاکستان اور ایران کے متعلقہ حلقوں کو امریکہ سے چھٹکارا پانے کے لئے مزاحمت اور ڈیل کا فارمولہ اپنانا ہوگا، کیونکہ ان کے بقول طالبان کی مزاحمت امریکہ کو افغانستان میں مزید قیام کا بہانہ اور جواز فراہم کرنے کا سبب بن رہی ہے۔ دیکھا جائے تو اس مؤقف کو امریکی عزائم کے تناظر میں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ امریکی وزیر دفاع رابرٹ گیٹس نے دورہ کابل کے دوران واضح کیا تھا کہ امریکہ اور اس کے اتحادی قندھار میں طالبان کی مکمل پسپائی اور دوسرے علاقوں میں ان کا پیچھا کرنے کا پختہ ارادہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے ایران پر افغانستان کے حوالے سے دورُخی پالیسی کا الزام لگاتے ہوئے یہ کہا کہ اسے افغانستان میں امریکی مفادات کے تحفظ کے لئے عملاً بہت کچھ کرنا ہوگا۔ اسی روز امریکہ کے سینئر فوجی افسر جنرل سٹینلے میک کرسٹل نے کہا کہ طالبان کمانڈر سرنڈر کرنے کی بجائے جنگ لڑنے کو ترجیح دے رہے ہیں اور امریکہ ان کے خلاف بھرپور جنگ لڑے گا۔

افغانستان کے سیاسی، ریاستی اور عوامی حلقے پاکستانی حکومت اور فورسز کی جانب سے حقانی نیٹ ورک کے خاتمے، مغربی سرحدوں پر مزید پاکستانی فوجی دستوں کی تعیناتی، پاکستان میں گرفتار افغان کمانڈروں کی حوالگی کے حوالے سے ٹال مٹول اور پاک افغان تجارت کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے جیسے بنیادی ایشوز پر حکومت پاکستان اور عسکری قیادت کی عدم دلچسپی اور انکار پر مبنی ردعمل کو تشویش کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ پاکستان اور ایران کے ساتھ برابری اور تعاون پر

بنی تعلقات کے قیام کے علاوہ یہ خواہش بھی رکھتے ہیں کہ یہ دونوں ممالک امریکہ کو دباؤ کا شکار بنائے رکھنے کے لئے افغانستان کو بطور میدان یا ڈھال بنانے کی پالیسیوں سے گریز کریں اور خطے کے اہم ممالک پر مشتمل ایک علاقائی بلاک کے قیام کو ممکن بنائیں تا کہ تینوں ممالک کے درمیان ہم آہنگی اور اعتماد سازی پیدا ہو اور اس کے نتیجے میں امریکہ کو یہ خطہ چھوڑنے کا راستہ بھی دکھایا جائے۔

بہت سے تجزیہ نگار افغان پولیس، انٹیلی جنس اور افغان نیشنل آرمی کی تعداد، ان کی تربیت اور صلاحیتوں پر اعتماد کرتے ہوئے یہ توقع لگائے بیٹھے ہیں کہ اگر امریکہ کسی مرحلے پر افغانستان سے نکل بھی جاتا ہے تو یہ فورسز اپنے ملک کا دفاع کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔ اس تمام پس منظر کو سامنے رکھ کر یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ مقبول عام تجزیوں اور روایتی تبصروں کے برعکس افغانستان تمام تر مشکلات کے باوجود ماضی کے برعکس بہتری کی شاہراہ پر گامزن ہے۔

خطے میں بڑھتی ہوئی پیچیدگیاں

افغانستان میں جاری جنگ، اس کے اثرات اور مستقبل کے حالات نے واحد سپر پاور امریکہ کے علاوہ پوری دنیا خصوصاً برطانیہ، روس، چین، ایران، پاکستان اور سعودی عرب کی حکومتوں کو بھی اپنے اپنے مفادات کے تناظر میں بدترین نوعیت کی پیچیدگیوں سے دوچار کر دیا ہے۔ ان تمام ممالک کو ریاستی اور سیاسی سطح پر افغانستان کے حالات کے بارے میں جن سوالات اور خدشات کا سامنا ہے، ان میں سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ امریکہ اور اس کے اتحادی افغانستان سے نکل رہے ہیں یا نہیں؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر امریکہ اور اس کے اتحادیوں کا افغانستان سے انخلا عمل میں آ رہا ہے تو ملک میں جاری کشیدگی اور مزاحمت کیا شکل اختیار کرے گی اور امن و امان کی بحالی کا سنگین مسئلہ کیسے حل ہوگا؟ تیسرا سوال یہ ہے کہ پاکستان اور ایران کا کردار اور دائرۂ کار کیا ہوگا؟ سب سے اہم سوال یہ ہے کہ کیا افغان اور پاکستانی طالبان القاعدہ کے ساتھ اپنے تعلقات اور وابستگی پر نظرِ ثانی کرنے پر تیار ہیں یا نہیں کیونکہ موجودہ حالات کے تناظر میں القاعدہ کی موجودگی، اس کے نظریات اور کردار کو کسی بھی طور نظر انداز کرنا سرے سے ممکن ہی نہیں ہے۔

سیاسی تجزیہ کاروں کا ایک معتبر گروہ یہ یقین رکھتا ہے کہ امریکہ اپنے اعلان کے مطابق 2012ء میں افغانستان سے نہیں نکلے گا۔ اگر اس نے نکلنا بھی ہے تو اس سے قبل وہ ہر صورت میں اس بات کو یقینی بنائے گا کہ طالبان سیاسی سیٹ اپ کا حصہ بن کر امریکہ اور یورپ کے بارے میں جارحانہ پالیسی ترک کر دیں۔ اس ضمن میں امریکہ کی جانب سے افغان صدر حامد کرزئی کے مفاہمتی عمل کی حمایت کے اقدام کو انتہائی اہمیت دی جا رہی ہے۔ ان اطلاعات کو بھی تجزیہ کار بطور حوالہ پیش کر رہے ہیں، جن میں کہا گیا ہے کہ حامد کرزئی نے حقانی نیٹ ورک کے ایک وفد سے ملاقات کر کے ان کو اپنے مجوزہ مفاہمتی فارمولے کے بارے میں اعتماد میں لینے کی کوشش کی ہے۔ حامد کرزئی اس سے قبل بھی مفاہمتی عمل کے حوالے سے طالبان کے متعدد اہم رہنماؤں کے علاوہ گلبدین حکمت یار کی حزبِ اسلامی کو بھی اعتماد میں لینے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ غیر جانبدار تجزیہ کاروں کے مطابق اگر امریکہ افغانستان میں اپنے متعین کردہ اہداف حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو

رہاتوایک ٹھوس حقیقت یہ بھی ہے کہ طالبان یاان کے حامی بھی زمینی حقائق کی روشنی میں جنگ جیتنے یا حکومت بنانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، چنانچہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا امریکہ کسی بھی طور پر متحمل ہوسکتا ہے کہ وہ افغانستان اور خطے کو موجودہ کشیدگی اور بے یقینی کی حالت میں چھوڑ کر یہاں سے نکل جائے، فی الحال اس سوال کا جواب نفی میں ہی ہے۔

کچھ عرصہ قبل نیٹو کے سربراہ آندرز رسموسن پاکستان اور افغانستان کے دورہ پر آئے تو انہوں نے دوٹوک انداز میں واضح کردیا کہ نیٹو کا افغانستان سے اپنے اہداف کے حصول کے بغیر کسی بھی قیمت پر نکلنے کا ارادہ نہیں ہے۔ان کے اس اعلان سے وہ تمام خوش فہمیاں دور ہوگئیں کہ امریکہ اور نیٹو کے درمیان فوجوں کی موجودگی، پالیسی یا افواج کے انخلا کے معاملے پر کوئی بڑا اختلاف موجود ہے۔ جہاں تک دوسرے سوال کے جواب کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں اسلام آباد' پشاور اور کابل میں موجود تجزیہ کار مختلف آراء کا اظہار کرتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔اس وقت قابلِ عمل نظر آنے والی دلیل یہ ہے کہ امریکہ کی ناکامی یا اس کی شورش زدہ خطے سے غیر مشروط واپسی کے انتہائی منفی اور خطرناک نتائج برآمد ہوں گے۔اس کی بڑی وجہ یہ بتائی جارہی ہے کہ امریکی فوجوں کے انخلاء کے باوجود اس بات کا امکان بہت کم ہے کہ طالبان' حزب اسلامی اور القاعدہ کے جنگجو افغانستان اور خطے کے سیاسی منظرنامے یا مستقبل کے حوالے سے کسی ایک قابل عمل فارمولے پر متفق ہو پائیں گے۔امریکہ اور پاکستان کبھی یہ نہیں چاہیں گے کہ 1990ء کی دہائی کی طرح افغانستان میں ایک بار پھر متحارب گروپوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہو۔اس ناکام اور تلخ تجربے سے بچنے کا واحد رستہ یہ بتایا جارہا ہے کہ امریکہ اور اتحادیوں کے افغانستان سے انخلاء سے قبل اس امر کو ہر صورت میں یقینی بنایا جائے کہ متحارب گروہ سیاسی اور جمہوری نظام کا حصہ بن جائیں اور ماضی کی طرح تصادم کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔

یہ مسئلہ بھی ہنوز حل طلب ہی ہے کہ حامد کرزئی اور ان کے حامیوں کو مستقبل کے کسی ممکنہ منظرنامے میں کس حد تک شامل کیا جائے گا، کیونکہ تمام تر ناپسندیدگی کے باوجود حامد کرزئی اور ان کے ساتھیوں کے اہم کردار کو نظرانداز کرنا ممکن نہیں ہے۔ کرزئی کو نہ صرف یہ کہ افغان پارلیمنٹ اور عوام کی ایک بڑی اکثریت کا مینڈیٹ حاصل ہے، بلکہ وہ بعض دوسرے فریقین کے علاوہ امریکہ

اور پاکستان جیسے اہم ترین ملکوں کی گڈ بک میں بھی شامل ہیں۔شمالی اتحاد کے اہم رہنماؤں کو اپنا ہمنوا بنانے اور ریاستی اختیارات میں حصہ دینے کے اقدام کے باعث کرزئی کو بڑی حد تک ایران کی حمایت بھی حاصل ہے۔کابل میں پاکستان کے سابق ملٹری اتاشی بریگیڈیئر محمد سعد کا کہنا ہے کہ موجودہ حالات کے تناظر میں کرزئی کو افغانستان کے داخلی معاملات سے الگ کرنا کافی گھاٹے کا سودا ثابت ہوسکتا ہے۔ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ پاکستان کے کردار کو بھی علاقائی اور عالمی سطح پر غیر معمولی اہمیت دی جارہی ہے۔اگر امریکہ' پاکستان اور افغانستان کے درمیان اعتماد کا ماحول قائم ہو اور ان کے درمیان اس مسئلے پر اتفاقِ رائے پیدا ہو جائے تو خطے میں جاری شورش اور کشیدگی پر قابو پانے کے امکانات خاصے بڑھ جاتے ہیں۔ جہاں تک ایران اور پاکستان کے کردار کا تعلق ہے تو تمام فریقین اس اَمر پر متفق ہیں کہ ان دونوں ممالک کو اگر ایک طرف خطے میں امریکہ کی موجودگی پر سخت تشویش ہے تو دوسری طرف ان ممالک کو اس بات کی بھی فکر ہے کہ اگر طالبان کسی سیاسی اور جمہوری سیٹ اپ کا حصہ نہیں بنتے تو افغانستان کے حالات اور تبدیلیوں کے براہ راست اثرات سے یہ ممالک کسی بھی طور بچ نہیں پائیں گے۔

پاکستان کو گزشتہ چند برسوں سے جس عسکریت پسندی اور دہشت گردی کا سامنا ہے، اس کو خطرناک' طویل اور پیچیدہ جنگ کے سوا کوئی دوسرا نام دینا شاید درست نہ ہو۔گزشتہ چند برسوں کے دوران پاک فوج کے تین ہزار افسر اور جوان جبکہ دیگر فورسز کے تقریباً چار ہزار اہلکار دہشت گردی کے خلاف جنگ میں شہید ہو چکے ہیں۔اس کے مقابلے میں افغانستان میں اس عرصہ کے دوران ہلاک ہونے والے سکیورٹی فورسز کے اہلکاروں کی تعداد اس سے تین گنا کم ہے۔دستیاب اعداد و شمار کے مطابق اب تک افغانستان میں اتحادی افواج کے سولہ سو اہلکار ہلاک ہوئے ہیں، اسی طرح عسکریت پسندوں کی کارروائیوں میں جاں بحق ہونے والے سیاسی مخالفین اور عام لوگوں کی ہلاکتوں کی تعداد بھی پاکستانیوں کے مقابلے میں انتہائی کم ہے۔اس صورتحال سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ پاکستان نہ صرف یہ کہ 2007ء کے بعد سے بدترین حملوں کی زد میں ہے بلکہ پاکستانی عسکریت پسند افغان طالبان کے مقابلے میں زیادہ منظّم اور فعال ہیں۔پاکستان کی قبائلی ایجنسیوں شمالی اور جنوبی وزیرستان میں ہونے والے امریکی ڈرون حملوں کی شرح

افغانستان کی نسبت خاصی زیادہ ہیں۔ان حالات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ فوجی کارروائیوں کی کامیابی اور اعتراف کے باوجود امریکہ اس بات کا قائل ہے کہ وزیرستان کی دونوں ایجنسیاں اب بھی ان عسکریت پسندوں کا گڑھ ہیں جو کہ سرحد پار کر کے افغانستان میں اتحادی اور افغان فورسز کو نشانہ بنا رہے ہیں۔26 جولائی (2010ء) کی صبح امریکہ کی جانب سے پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں پر ایک بار پھر الزام عائد کیا گیا کہ اس کے افسر اور اہلکار شدت پسندوں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں، اگرچہ امریکہ میں متعین پاکستانی سفیر حسین حقانی نے اس الزام کو بے بنیاد قرار دیا ہے، تاہم اس حقیقت سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا کہ امریکہ اپنے اتحادی پاکستان کے حوالے سے نہ صرف یہ کہ خدشات کا شکار ہے بلکہ وہ اعلیٰ ترین سطح پر پاکستان پر اس قسم کے سنگین الزامات عائد کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔بعض سیاسی، دفاعی اور صحافتی حلقے جنرل ڈیوڈ پیٹریاس (انہیں کچھ عرصہ قبل سی آئی اے کا سربراہ بنا دیا گیا ہے) کی امریکی اور نیٹو فورسز کے سربراہ کے طور پر تعیناتی پر بھی شدید تحفظات اور خدشات کا اظہار کرتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ان کا مؤقف ہے کہ اگر امریکہ طالبان کو 2011ء سے قبل قابو کرنے میں ناکام رہا تو وہ جنرل پیٹریاس کے ذریعے افغانستان کو لسانی، مسلکی اور علاقائی سطح پر تقسیم کرنے کے علاوہ مختلف قوتوں کو آپس میں لڑانے کا فارمولہ آزمانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا، جو کہ جنرل پیٹریاس عراق میں کامیابی سے آزما چکے ہیں۔اس ضمن میں یہ دلیل دی جا رہی ہے کہ افغانستان میں پشتونوں اور غیر پشتونوں کے اختلافات کے علاوہ شیعہ اور سنی مسالک میں پہلے ہی وسیع فرقہ ورانہ خلیج حائل ہے اور اگر معاملات میں بہتری نہ آئی تو جنرل پیٹریاس اس آپشن پر غور کریں گے۔ان حلقوں کا کہنا ہے کہ اگر افغانیوں کو آپس میں لڑانے یا تقسیم کرنے کا فارمولہ آزمایا گیا تو اس سے ایران اور پاکستان کی مشکلات میں مزید اضافہ ہو جائے گا کیونکہ ایسا ہونے کی صورت میں ایران شمالی افغانستان میں موجود اپنے حامیوں جبکہ پاکستان نہ چاہتے ہوئے بھی پشتونوں کی حمایت پر مجبور ہو گا۔اس کی وجہ یہ بتائی جا رہی ہے کہ دونوں ممالک اپنی سرحدوں اور اپنے مفادات کے تناظر میں افغانستان میں رونما ہونے والی کسی بھی تبدیلی سے الگ نہیں رہ پائیں گے۔

اس حقیقت میں بھی کوئی مبالغہ نہیں کہ پاکستان اور افغانستان کو حملہ آوروں کے علاوہ عالمی

اور علاقائی قوتوں کے مفادات اور آپس کی چپقلش کی صورت میں بدترین مشکلات اور پیچیدگیوں کا سامنا بھی ہے۔ اگر افغانستان میں حامد کرزئی کی حکومت کی رٹ کمزور ہے تو پاکستانی ریاست کی قبائلی علاقوں اور بلوچستان میں رٹ کمزور ہے۔ اگر افغانستان کے پشتون علاقے شورش اور جنگ کی زد میں ہیں تو پاکستان کے پشتون علاقے فاٹا' خیبر پختونخوا اور یہاں تک کہ کراچی میں بھی کشیدگی برقرار ہے۔ ان حالات کے باعث بعض حلقے افغانستان' فاٹا' خیبر پختونخوا اور بلوچستان کی پشتون بیلٹ پر مشتمل خطے کے نئے سیاسی اور جغرافیائی نقشے کی تشکیل کی بات بھی کر رہے ہیں، تاہم ایسا ہونے سے قبل وہ بڑے پیمانے پر خونریزی اور مختلف ریاستوں کے درمیان تصادم کو ناگزیر قرار دے رہے ہیں یہ حلقے ایسے کسی ممکنہ آپشن کو حالات کے جبر کے علاوہ اس امریکی منصوبے کا نام دے رہے ہیں جس پر امریکی سی آئی اے نے 2007-08ء سے Blood and Ethnic Borders کے نام سے کام کا آغاز کر دیا ہے اور اس فارمولے کے تحت جن ممالک میں متوقع تبدیلیوں کی نشاندہی کی گئی ہے، ان میں افغانستان' ایران' پاکستان' سعودی عرب' عراق اور شام شامل ہیں۔

پاکستان کی افغان پالیسی

پاکستان بالخصوص خیبر پختونخوا میں سیلاب کی شکل میں نازل ہونے والی قیامت کے باعث میڈیا کی نظروں سے بعض ایسے ایشوز اور واقعات اوجھل رہے جن کی اہمیت اور اثرات کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔ زیرِ نظر سطور میں کوشش کرتے ہیں کہ ایسے کچھ ایشوز کو قارئین کے سامنے ان واقعات کے پس منظر کے ساتھ مختصراً پیش کیا جا سکے۔ 'ہندوستان ٹائمز' بھارت کا ایک موثر اور بڑا اخبار ہے۔ اس اخبار نے چند روز قبل صفحہ اول پر افغانستان میں یو این مشن کے ایک سابق ڈپٹی چیف کریس الیگزینڈر (Cres Alexander) کے ایک تہلکہ خیز مضمون کے بعض اقتباسات شائع کئے ہیں۔ کینیڈا سے تعلق رکھنے والے الیگزینڈر کو متعدد ممالک میں سفارتی خدمات سرانجام دینے کے علاوہ شورش زدہ علاقوں اور انٹیلی جنس اداروں کی پالیسیوں کا ماہرانہ تجزیہ کرنے کا بھی خاصا تجربہ ہے۔ انہوں نے پاک فوج کی موجودہ قیادت خصوصاً آرمی چیف اشفاق پرویز کیانی کی افغانستان کے بارے میں پالیسی کے بعض اہم نکات اور اس کے خدوخال پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے پاک افغان تعلقات کی بحالی کو افغانستان میں بھارت کے اثر و رسوخ کے مکمل خاتمے سے مشروط کر دیا ہے۔ موصوف نے متعدد دلائل اور واقعات کو بنیاد بنا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جنرل کیانی خطے کی سیاست کو پاکستان کے مفادات کے تحفظ کے لئے آگے بڑھا رہے ہیں اور ان کی حکمتِ عملی کا امریکہ اور بھارت کو بھی پورا علم ہے۔ معزز تجزیہ نگار کے مطابق امریکہ اور پاک فوج کے درمیان بھارت کی افغانستان میں مبینہ مداخلت کے ایشو پر نہ صرف یہ کہ اختلافات موجود ہیں بلکہ پاک فوج متعدد اہم معاملات کے حوالے سے مزاحمت کی پالیسی پر بھی عمل پیرا ہے۔ اس حوالے سے وہ تین ایشوز کو بطور مثال پیش کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ پاک فوج نے ان طالبان کمانڈروں کی گرفتاری سے لاتعلقی کا اظہار کیا ہے جو کہ امریکہ کے خیال میں پاکستان کے مختلف علاقوں سے گرفتار کئے جا چکے ہیں۔ اس پالیسی کا مقصد یہ پیغام دینا ہے کہ جو بھی افغان کمانڈر پاکستان کی مرضی کے بغیر امریکہ یا کرزئی کے ساتھ کسی مصالحتی عمل کا حصہ بن سکتا ہے، اس کو ایسا کرنے سے روکا جائے۔

تجزیہ نگار کا مزید کہنا ہے کہ شمالی وزیرستان، بلوچستان اور جنوبی پنجاب میں امریکی دباؤ کے باوجود طالبان کے خلاف آپریشن کرنے سے انکار بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے، جبکہ افغانستان میں بھارتی قونصل خانوں کی بندش یا ان میں کمی کا مسلسل مطالبہ بھی جنرل کیانی کی اس حکمتِ عملی کا پرتو ہے۔ موصوف کا کہنا ہے کہ آئی ایس آئی اب بھی افغان جنگ کی اہم ترین فریق ہے جبکہ اسلامی امارت آف افغانستان کو زیادہ تعاون اسلام آباد اور راولپنڈی ہی سے مہیا کیا جارہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ پاک فوج کے لیے افغانستان اب بھی ایک 'شکارگاہ' کی مانند ہی ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ بظاہر افغانستان میں بھارت کی غیر ضروری مداخلت ہی نظر آرہی ہے۔ انہوں نے اپنے تجزیئے میں دعویٰ کیا ہے کہ جنرل کیانی متعدد بار افغان صدر حامد کرزئی کو صاف صاف کہہ چکے ہیں کہ جب تک کابل اپنی سرزمین پر دہلی کا اثر و سوخ ختم نہیں کرے گا، تب تک پاکستان افغان طالبان کی مزاحمت کم کرنے کے لیے افغانستان اور امریکہ کے ساتھ کوئی خاص تعاون کرنے پر تیار اور آمادہ نہیں ہوگا۔ مضمون نگار کے مؤقف سے اختلاف کی خاصی گنجائش موجود ہے، تاہم مضمون کا حوالہ دینا اس لئے ضروری تھا کہ اس کے ذریعے پاکستان کی عسکری قیادت کی ایک اہم پالیسی کے بارے میں یہ تجزیہ کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ پاکستان کو افغانستان میں مبینہ بھارتی اثر و رسوخ اور مداخلت پر غیر معمولی تشویش لاحق ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ پاک بھارت تعلقات میں کشیدگی افغانستان کے حالات پر بری طرح اثر انداز ہو رہی ہے۔ بعض حلقوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ امریکہ کا پی پی پی اور اے این پی پر افغان پالیسی اور پاکستانی طالبان کے حوالے سے دباؤ بھی ماضی کے برعکس اب بڑھتا جارہا ہے۔

اب ایک اور رپورٹ کا جائزہ لیتے ہیں جو کہ ایک معتبر دفاعی اور تحقیقی ادارے نے مرتب کی ہے جو 2002ء سے جولائی 2010ء تک امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو افغانستان کے محاذ پر ہونے والے جانی نقصان سے متعلق ہے۔ رپورٹ میں اعداد و شمار کی صورت میں یہ بتایا گیا ہے کہ امریکہ نے گزشتہ ایک صدی کے دوران جتنی بھی جنگیں لڑی ہیں، اس کے سب سے کم فوجی افغانستان میں ہلاک ہوئے ہیں۔ اس عرصہ کے دوران امریکی فوجیوں کی ہلاکتوں کی تعداد 1260 رہی، جن میں سی آئی اے کے گیارہ اہلکار بھی شامل تھے۔ رپورٹ کے مطابق امریکہ اور

اس کی اتحادی فورسز کے اہلکاروں کی مجموعی ہلاکتوں کی تعداد 1920 تھی، جبکہ رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ 2008ء کے مقابلے میں 2009ء کے دوران امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے خلاف طالبان کے حملوں میں 45 فیصد جبکہ 2010ء کے دوران ان حملوں میں 61 فیصد اضافہ ہوا۔ رپورٹ کے مطابق افغان جنگ میں 2010ء تک برطانیہ کے 320 ' کینیڈا کے 149 ' جرمنی کے 49 ' فرانس کے 46 ' اٹلی کے 29 ' ڈنمارک کے 36 ' سپین کے 29 ' نیدرلینڈ کے 24 ' پولینڈ کے 20 ' آسٹریلیا کے 16 ہلاک اور ترکی کے 4 فوجی اہلکار ہلاک ہوئے۔ 2009ء کے دوران اتحادی ممالک کے 410 فوجی ہلاک ہوئے، جبکہ جولائی 2010 تک 70 فوجی ہلاک ہوئے تھے۔ سب سے زیادہ ہلاکتیں 2009ء کے دوران ہوئیں اور یہ تعداد 521 بنتی ہے۔ رپورٹ میں یہ بھی نشاندہی کی گئی ہے کہ ان برسوں کے دوران 442 فوجی اہلکار طالبان کے خلاف دوبدو کارروائی کرتے ہوئے ہلاک ہوئے۔ سب سے پرامن اور پرسکون برس 2001ء اور 2004ء رہے جب ہلاکتوں کی تعداد بالترتیب 12 اور 57 رہی۔

دوسری جانب ایک امریکی اخبار بوسٹن گلوب نے 2002ء سے 2010ء تک عسکریت پسندوں کی کارروائیوں میں پاکستانی سکیورٹی فورسز کے افسروں اور اہلکاروں کی ہلاکتوں پر مبنی ایک رپورٹ شائع کی ہے۔ اس رپورٹ میں آرمی چیف جنرل کیانی کے ایک بیان کے علاوہ مختلف ذرائع کو بنیاد بنا کر کہا گیا ہے کہ پاکستانی فوج اور پیراملٹری فورسز کے جوانوں اور افسروں کی جو ہلاکتیں ہوئیں، ان کی تعداد 8000 سے زائد ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خطے میں جاری جنگ کے دوران امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے مقابلے میں پاکستانی فورسز کو زیادہ جانی نقصان کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ یہ رپورٹس ان لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہیں جن کا کہنا ہے کہ امریکہ اور اس کے اتحادی افغانستان میں لاشیں اٹھاتے اٹھاتے تھک گئے ہیں۔

الجزیرہ ٹیلی ویژن کی ایک ڈاکیومنٹری No Go Area میں صوبہ خیبر پختونخوا کو بارہ اگست (2010ء) کو جشن آزادی سے صرف دو روز قبل شوٹ کیا گیا ہے۔ اس ڈاکیومنٹری میں یہ دکھایا گیا ہے کہ طالبان' القاعدہ اور دوسری ریاست مخالف قوتوں کی موجودگی' دھمکیوں اور خوف کے باعث عالمی برادری اور اسلامی دنیا تو ایک طرف پاکستان کے حکمران بھی سیلاب زدگان کی

امداد اور دادرسی کے لئے اس نوگو ایریا میں داخل ہونے سے گریزاں رہے ہیں۔ اس ڈاکیومنٹری میں طالبان کی اس دھمکی کا بطور خاص ذکر کیا گیا ہے جس میں پاکستانی حکومت کو متنبہ کیا گیا تھا کہ وہ امریکہ سے سیلاب زدگان کے لئے امداد نہ لیں۔ اس ڈاکیومنٹری میں پشاور، نوشہرہ، مینگورہ اور ملتان میں بعض کالعدم تنظیموں کے امدادی سٹالز بھی دکھائے گئے ہیں۔ ایک اور خبر کے مطابق القاعدہ نے سعودی عرب کو دھمکی دی کہ وہ امریکی تعاون حاصل نہ کرے، ورنہ سعودی حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے گا اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ سعودی فوج کے بعض حلقوں کی جانب سے القاعدہ کی حمایت کے پیغامات موصول ہو رہے ہیں۔ شہزادوں، اعلیٰ حکام اور غیر ملکیوں کے اغواء کی دھمکی بھی دی گئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سوڈان، یمن، عراق، افغانستان اور پاکستان کے بعد اب سعودی عرب کی باری بھی آنے والی ہے۔ سعودی عرب ہی وہ ملک ہے جس سے القاعدہ اور جہادیوں کو سب سے زیادہ مالی معاونت حاصل ہوتی رہی ہے۔

دوسری جانب بعض تبصرہ نگار تحریک طالبان کی جانب سے کراچی میں جاری کشیدگی پر غیر متوقع سیاسی بیان کو بھی غیر معمولی اہمیت دے رہے ہیں۔ ان کے خیال میں تحریکِ طالبان پاکستان سیاسی جماعتوں خصوصاً اے این پی کے حوالے سے عوام میں پائی جانے والی ناراضگی سے فائدہ اٹھا کر اپنی پالیسی میں تھوڑی سی تبدیلی اور نرمی لا کر عوام کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ عوامی حلقوں کو خودکش حملوں کا نشانہ بنانے کے باعث عوام کے دلوں میں پیدا ہونے والی نفرت کے خاتمہ کے لئے تحریکِ طالبان پاکستان نہ صرف یہ کہ اب ٹارگٹ کلنگ کی پالیسی پر عمل پیرا ہوگئی ہے بلکہ وہ اس بات کا بھی بغور جائزہ لے رہے ہیں کہ اگر وہ سیاسی ایشوز خصوصاً پشتونوں کے مفادات سے وابستہ معاملات میں سیاسی طریقے سے دلچسپی لے کر لوگوں کی حمایت حاصل کریں تو اس کے کتنے مثبت نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ کراچی کے پشتونوں کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں پر قاری حسین (استاد فدائین) نے جو دھمکی آمیز آڈیو بیان جاری کیا، اس میں وہ کسی طالب لیڈر کی بجائے کوئی پشتون قوم پرست لگ رہے تھے اور متعدد لوگوں کو ان کے اس بیان پر حیرت بھی ہوئی۔ اے این پی کی بری طرزِ حکمرانی خصوصاً خیبر پختونخوا میں سیلاب کے دوران حکومتی اداروں اور سیاستدانوں کی مایوس کن کارکردگی کے باعث سیاسی

قوتوں خصوصاً اے این پی کی مقبولیت میں غیر معمولی کمی آنے کا عندیہ دیا گیا، جس سے سیاسی وغیر سیاسی قوتیں فائدہ اٹھا سکتی ہیں، ان میں جے یو آئی اور پی پی شیر پاؤ کے علاوہ بعض لوگ بوجوہ طالبان کے معتدل مزاج گروپوں کا بھی نام لے رہے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اگر حکومت کے حوالے سے عوام کی بددلی اور مایوسی کی شرح اسی رفتار سے بڑھتی رہی اور سیاسی پارٹیوں خصوصاً اے این پی نے اپنے رویئے میں بنیادی تبدیلیاں لانے کی ضرورت کا احساس نہ کیا اور عوامی حمایت کے حصول کے لئے ٹھوس اور فوری اقدامات نہ کئے تو وہ کون سی متبادل قوتیں ہوں گی جو اس صورتحال سے فائدہ اٹھانے کے لئے میدان میں نکل کھڑی ہوں گی۔
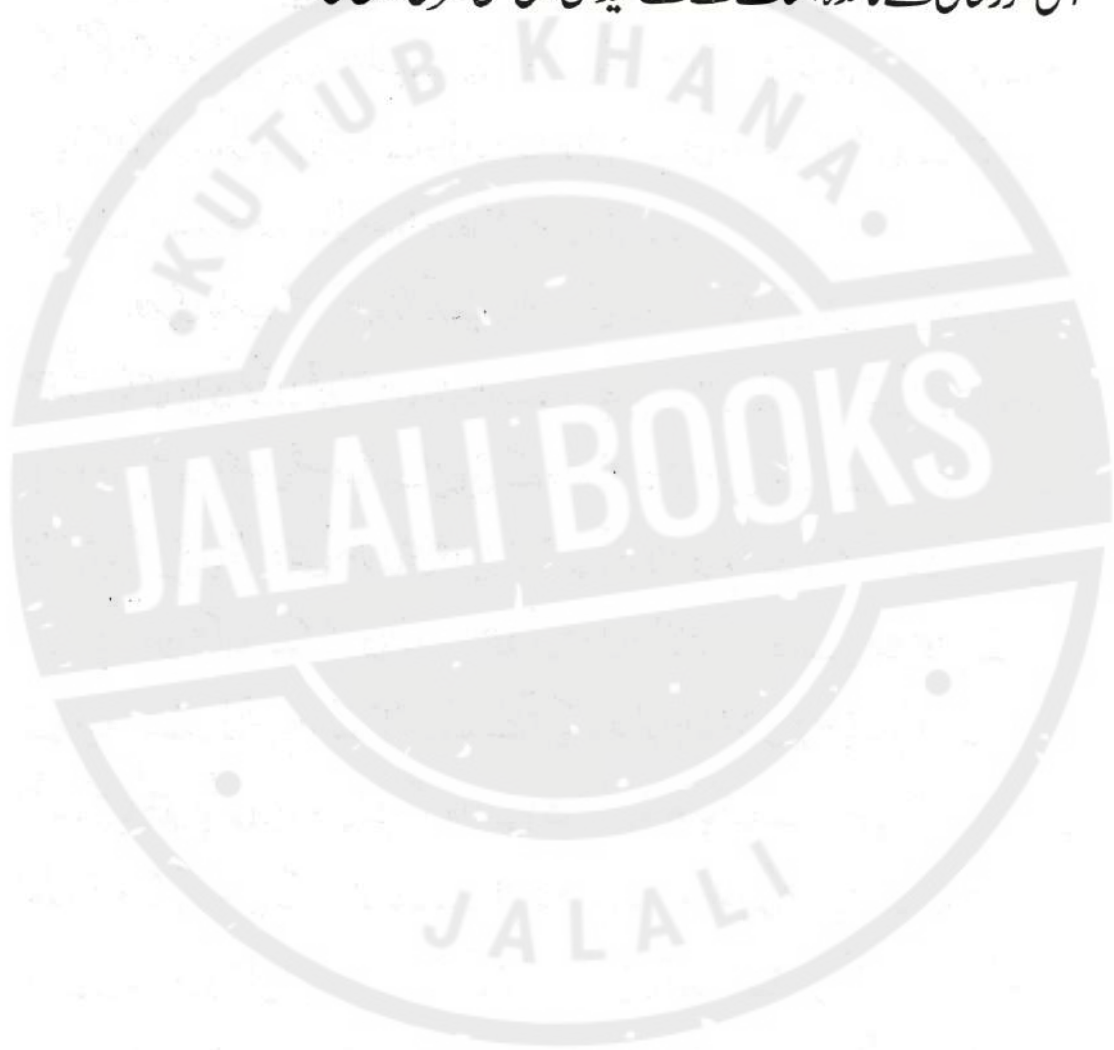
خطے کی تاریخ کا بدترین دور

افغانستان میں لڑی جانے والی جنگ کے جانی اور مالی نقصانات کے بارے میں کسی بھی حکومت' ادارے یا شخص کے پاس ٹھوس معلومات اور اعداد وشمار نہیں ہیں۔ اس طویل جنگ میں کتنے طالبان' القاعدہ ارکان اور سب سے بڑھ کر عام لوگ ہلاک ہوئے، اس بارے میں بعض اعداد وشمار انتہائی غلط ہیں۔ مثال کے طور پر امریکہ کی ایک ویب سائٹ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ امریکی کارروائیوں میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد تقریباً 30 لاکھ ہے جبکہ اسی ادارے نے معذور اور زخمیوں کی تعداد 20 لاکھ بتائی ہے۔ عراق میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد 11 لاکھ بتائی گئی ہے۔ آزاد ذرائع ہلاکتوں کی اس تعداد کو انتہائی مبالغے پر مبنی قرار دے رہے ہیں اور ان کا مؤقف ہے کہ افغانستان میں چونکہ صرف اہداف پر ہی کارروائی کی جاتی ہے، اس لئے اتنی ہلاکتوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور یہ اعداد وشمار وہ ادارے جاری کر رہے ہیں جن کا کوئی تحقیقی پس منظر یا مؤثر نیٹ ورک نہیں ہے۔ بعض اداروں کی جانب سے افغانستان میں ان برسوں کے دوران امریکی اور اس کی اتحادی فورسز کے اہلکاروں کی ہلاکتوں کی تعداد کے بارے میں بھی انتہائی مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ اب تک جو تفصیلات سامنے آتی رہی ہیں اور ان کے ذرائع پر اعتماد بھی کیا جا سکتا ہے، وہ کچھ یوں ہیں کہ دوسری بڑی جنگوں کے برعکس افغان جنگ میں ہونے والی ہلاکتیں حقیقتاً بہت کم ہیں اور یہ تعداد مجموعی طور پر 2500 سے 3000 تک بتائی جاتی ہے۔ ان میں امریکہ جانی نقصان کے حوالے سے سب سے آگے رہا ہے، تاہم اس کی فوجی ہلاکتوں کی تعداد بھی ایک ہزار کا ہندسہ عبور نہیں کرتی۔

ناروے کے ایک تحقیقی ادارے کے سروے کے مطابق عراق کے مقابلے میں افغانستان میں فریقین کی ہلاکتوں کی تعداد میں غیر معمولی فرق پایا جاتا ہے اور افغان جنگ میں شرحِ نقصان زیادہ نہیں ہے۔ ایسے میں یہ کہنا کہ عراق کے مقابلے میں کم آبادی کے ملک افغانستان میں زیادہ ہلاکتیں ہوئی ہوں گی، سراسر مبالغہ آرائی ہے۔ دراصل امریکہ خود ایسی اطلاعات عام کرتا رہا ہے تاکہ وہ اپنے اتحادیوں کے علاوہ اپنے عوام اور مخالفین کو بھی یہ باور کروا سکے کہ اس سپر پاور کو ایک

خطرناک اور منظم دشمن کا سامنا ہے اور یہ کہ 2001ء کے دوران افغانستان پر کیا جانے والا حملہ انتہائی ضروری اور ناگزیر تھا۔ اگر اس جنگ کے اصل حقائق کا درست تجزیہ کیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ دس سال کے دوران امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو عملاً اس مستقل مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا، جس کا خدشہ ظاہر کیا جارہا تھا۔ 2004ء تک القاعدہ اور طالبان نے روپوشی اختیار کیے رکھی جبکہ اس کے بعد محض چھاپہ مار کارروائیوں تک محدود رہے اور یہ حملے بھی مخصوص علاقوں میں کیے گئے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ 2004ء کے بعد افغانستان کی ریاستی فورسز کے مقابلے میں پاکستانی فورسز، سیاسی کارکنوں اور عام شہریوں کو پاکستانی جہادی گروہوں کی جانب سے زیادہ شدید حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔ معتبر ترین ذرائع کی ان رپورٹس کو سامنے رکھنے کی اشد ضرورت ہے کہ اس عرصہ کے دوران آٹھ ہزار سکیورٹی اہلکاروں کے علاوہ پاکستان کی ریاست کو مجموعی طور پر 25 ہزار ہلاکتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پاکستان کے برعکس افغانستان میں انتہا پسندوں کے خلاف بڑے پیمانے پر فوجی آپریشن کی ضرورت اور نوبت بھی بہت کم آئی جبکہ افسروں کی ہلاکتوں کی شرح بھی پاکستان کے مقابلے میں انتہائی کم رہی۔ متعدد کتابوں کے مصنف اور تھنک ٹینک پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز کے ڈائریکٹر محمد عامر رانا کے مطابق ''پاکستانی فورسز کو اس کے باوجود شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا کہ ہماری فورسز امریکہ کے برعکس اپنے ہی ملک کے اندر لڑ رہی تھیں۔ ہم اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ کئی برسوں تک فاٹا شر پسندوں کے مکمل کنٹرول میں رہا ہے اور کئی مہینوں تک ان لوگوں نے مالاکنڈ ڈویژن کو بھی عملاً یرغمال بنایا ہوا تھا۔'' ان کا کہنا تھا کہ ''چونکہ افغانستان میں ریاستی ادارے نہ ہونے کے برابر تھے، اس لئے وہاں ریاست کو عملاً بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، جبکہ پاکستان کے عسکریت پسندوں نے ریاستی اداروں کو عملاً سرنڈر کر کے رکھ دیا۔ یہ اَمر ریاست کے لئے پریشان کن تھا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ فورسز کو حکومت اور عوام کی مدد سے کارروائیاں کرنا پڑیں۔'' محمد عامر رانا کے مطابق ''2007ء کے بعد سے پاکستان میں امن وامان کی صورتحال بہت تشویش ناک رہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم میں سے بہت سے لوگ اس صورتحال کو افغانستان میں امریکہ کی موجودگی کا نتیجہ قرار دیتے رہے۔

افغانستان کے برعکس پاکستان میں خودکش حملوں کی شرح بھی بہت زیادہ رہی۔ مثال کے

طور پر گزشتہ تین ساڑھے تین سال کے عرصہ میں دہشت گردی کی دوسری بدترین کارروائیوں کے علاوہ پاکستان میں 189 خودکش حملے کئے گئے اوران حملوں میں ہر شہراورصوبے کے علاوہ ہر طبقے کو نشانہ بنایا گیا۔اس کے برعکس افغانستان کے جن شہروں یا علاقوں میں عسکریت پسند کارروائیاں کی گئیں، ان میں قندھار، ہرات، پکتیا، پکتیکا، خوست، گردیز اور ننگرہار شامل ہیں۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ یہ تمام وہ علاقے ہیں جن کی سرحدیں پاکستان کے ساتھ ملحق ہیں، جس کے باعث امریکہ اوراس کے اتحادی دہشت گردی کی ان کارروائیوں کو پاکستان کی سرحد پر عسکریت پسندوں کے محفوظ ٹھکانوں کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

پاکستان اور افغانستان میں حملوں کی نوعیت کے اعتبار سے بھی فرق رہا ہے۔ پاکستان میں مسلکی اور سیاسی بنیاد پر مخالفین کو نشانہ بنانے کے واقعات افغانستان کی نسبت بہت زیادہ ہوئے۔ پاکستان میں 2007ء کے دوران اندازاً 56، 2008ء میں 60 اور 2009ء میں 70 خودکش حملے ہوئے۔ 2009ء دہشت گردی کی کارروائیوں کے ضمن میں پاکستان کی تاریخ کا بدترین سال رہا۔اس کے برعکس ان تین سالوں کے دوران افغانستان میں حملوں کی شدت کم رہی اوران میں جانی نقصان بھی پاکستان سے کم ہی ہوا، تاہم 2010ء میں افغانستان کے حالات پھر سے بگڑنا شروع ہو گئے اور طالبان اور القاعدہ کی ان کارروائیوں کا مقصد امریکہ کو فیصلہ کن دباؤ سے دوچار کرنا بتایا گیا۔ 2010ء امریکہ اور نیٹو فورسز کے جانی نقصان کے اعتبار سے بدترین سال رہا، تاہم اتحادی افواج نے بھی چار، پانچ صوبوں میں فضائی اور زمینی حملے کر کے سینکڑوں عسکریت پسندوں کو نشانہ بنایا۔ افغانستان میں جاری جنگ کا ایک منفرد پہلو یہ بھی رہا ہے کہ افغان طالبان نے شہریوں کو نشانہ بنانے سے حتیٰ المقدور گریز کیا ہے اور زیادہ مواقع پر فورسز کو ہی نشانہ بنایا ہے۔ افغانستان میں شہریوں اور مخالفین کو ذبح کرنے کے واقعات بھی پاکستان کے شورش زدہ علاقوں کے مقابلے میں کم ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس پاکستانی طالبان اوران کے اتحادیوں نے نہ صرف یہ کہ مستقل طور پر اعلیٰ ترین عسکری اور حکومتی شخصیات کو نشانہ بنایا ہے بلکہ انہوں نے شہریوں پر بھی حملے کیے اور مخالفین کو ذبح کرنے کے واقعات میں ریکارڈ اضافہ ہوا۔ سوات کے علاوہ وزیرستان، باجوڑ، کرم، مہمند اوراورکزئی ایجنسی میں بے شمار مخالفین کو امریکہ اور پاکستان کا ایجنٹ قرار دیکر بے

دردی سے ذبح کر دیا گیا۔ امریکہ نے اس تمام عرصہ کے دوران جہاں پاکستان کو مسلسل دباؤ کا شکار بنائے رکھا، وہاں وزیرستان کی دونوں ایجنسیوں پر مسلسل ڈرون حملے کر کے ایک طرف القاعدہ اور طالبان کو منتشر کیا تو دوسری طرف بیسیوں مقامی اور غیر مقامی عسکریت پسند رہنماؤں اور کمانڈروں کو بھی نشانہ بنایا۔ ڈرون حملوں کے باعث ان حلقوں نے پاکستانی حکومت پر زیادہ شدت سے تنقید کی جو کہ ڈرون حملوں کی مسلسل مخالفت کر کے اس پالیسی کو پاکستان کی سلامتی کیلئے خطرہ قرار دیتے رہے ہیں۔

ایک رپورٹ کے مطابق امریکہ نے 2008ء میں فاٹا پر 36، 2009ء میں 50 جبکہ اکتوبر 2010ء تک 82 ڈرون حملے کئے تھے۔ ابتدائی دو برسوں کے دوران جنوبی وزیرستان کو جبکہ 2010ء میں شمالی وزیرستان کو ڈرون حملوں کا نشانہ بنایا گیا، اس کے ساتھ ہی کرم اور اورکزئی کی قبائلی ایجنسیوں کو بھی نشانہ بنایا جاتا رہا۔ 2010ء میں تمام تر خدشات کے باوجود افغانستان میں پارلیمانی انتخابات کا انعقاد کیا گیا، اور طالبان کی دھمکیوں کے باوجود عوام قندھار اور ہرات جیسے صوبوں میں بھی ووٹ ڈالنے کے لیے گھروں سے نکلے۔ اس کے برعکس پاکستان کی صوبائی حکومتیں امن وامان کی بدترین صورتحال کے باعث ضمنی انتخابات کرانے سے بھی معذور اور گریزاں نظر آئیں۔ افغان صدر حامد کرزئی نے رواں برس کے دوران ملک کے متعدد دوسرے صوبوں کے علاوہ 9 اکتوبر کو شورش زدہ قندھار کا بھی دورہ کیا، تاہم پاکستان کے صدر یا وزیراعظم فاٹا کا دورہ نہیں کر سکے۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ سوال شدت کے ساتھ ابھرتا ہے کہ گزشتہ ایک دہائی کے دوران اگر افغانستان میں عالمی برادری کی کوششوں کے باوجود امن قائم نہیں ہو سکا تو پاکستان جیسا مضبوط ملک کیونکر بدترین صورتحال سے دوچار رہا۔ اس سوال کا جواب ڈھونڈنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ اگر امریکہ اور اس کے اتحادی واقعتاً افغانستان سے نکل رہے ہیں تو عسکریت پسندوں کا نیا پڑاؤ کیا ہوگا؟ اور پاکستان کے بارے میں ان کی پالیسی عملاً کیا رخ اختیار کرے گی؟

گلے میں پھنسی ہڈی

پاکستان کے برعکس جنگ زدہ افغانستان کے امریکہ نواز حکمران جہاں ایک طرف طالبان کے ساتھ مذاکراتی عمل کو بتدریج آگے بڑھانے میں مصروف ہیں وہاں حامد کرزئی اور ان کے ساتھی وقتاً فوقتاً امریکیوں کو مکا دکھا کر ان کی پریشانی میں اضافے کا بھی باعث بن جایا کرتے ہیں۔ حامد کرزئی اور امریکی انتظامیہ کے درمیان لوگوں کی توقعات اور اندازوں کے برعکس متعدد بار نہ صرف یہ کہ تعلقات خراب ہوئے بلکہ کئی بار تو ایسا بھی ہوا کہ فریقین بعض ایشوز پر عملاً ایک دوسرے کے خلاف صف آراء بھی ہوئے۔ حال ہی میں کابل میں منعقدہ جرگہ پر جب راکٹ داغے گئے تو افغان صدر نے شدید ناراضگی اور ردِعمل کا اظہار کیا اور انٹیلی جنس ایجنسی کے سربراہ اور ایک متعلقہ وزیر سے استعفیٰ لے لیا۔ بظاہر امریکہ پر انحصار کرنے والے حامد کرزئی سے اس قدر سخت مؤقف اختیار کرنے اور فیصلے کی توقع نہیں کی جا رہی تھی کیونکہ مستعفی ہونے والے دونوں افراد کو افغان سیٹ اپ میں کافی اہمیت حاصل تھی۔ استعفوں کے فیصلے کے بعد مغربی میڈیا پر یہ خبریں آنا شروع ہو گئیں کہ حامد کرزئی اور امریکہ کے درمیان بعض معاملات پر پھر کشیدگی پیدا ہو گئی ہے، تاہم کشیدگی کے اسباب کے بارے میں تفصیلات معلوم نہیں ہو رہی تھیں۔ تیرہ جون کے روزنامہ مشرق اور اس سے قبل اہم امریکی اخبار نیویارک ٹائمز میں شائع ہونے والی خبر سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ کشیدگی کی خاص وجہ کیا تھی۔ اس خبر کے مطابق کرزئی نے جرگے پر حملے کو طالبان کی بجائے امریکی حملے یا سازش کا نتیجہ قرار دیا۔ دیکھا جائے تو اس خبر کا ایک پسِ منظر اور جواز بھی موجود ہے اور وہ یہ کہ امریکہ کی موجودہ انتظامیہ نے اقتدار میں آنے سے قبل کرزئی پر نہ صرف یہ کہ براہ راست الزامات لگانے شروع کر دیئے تھے بلکہ موجودہ صدر بارک اوباما نے انتخابی مہم کے دوران کرزئی کو ناکام حکمران اور کرپٹ رہنما قرار دینے کی ''بداحتیاطی'' سے بھی گریز نہیں کیا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب حامد کرزئی ایک خوددار پشتون کی طرح امریکہ کو ٹف ٹائم دینے کے منصوبے پر عمل پیرا ہونے لگے۔ امریکہ کی نئی حکومت نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد سب سے پہلے کرزئی کی بجائے کسی اور موزوں اور کمزور امیدوار کیلئے کوششیں شروع کر دیں، تاہم اس دوران کرزئی اتنے

مضبوط ہو چکے تھے کہ امریکیوں کو بڑی محنت کے بعد عبداللہ عبداللہ کو صدارتی الیکشن کے لیے میدان میں اتارنا پڑا۔

امریکی اور امریکہ نواز میڈیا نے پولنگ سے قبل اپنی خبروں اور تبصروں میں کرزئی کی کچھ اس انداز سے مخالفت کی کہ متعدد اہم ادارے صحافتی اصولوں کو نظر انداز کر کے کرزئی کیخلاف عملاً فریق بن کر رہ گئے۔ عبداللہ عبداللہ کو افغانستان کا متحرک، قابل اور مستقل مزاج سیاستدان اور مستقبل کا کامیاب حکمران قرار دینے کی زبردست مہم چلائی گئی جبکہ حامد کرزئی میں وہ نقائص نکالے گئے جو اس سے قبل امریکیوں اور ان کے میڈیا کو شاید نظر ہی نہیں آرہے تھے۔ کرزئی کی کردار کشی کرنے سے بھی گریز نہیں کیا گیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا دکھائی دینے لگا کہ کرزئی اور ان کے ساتھی الیکشن کے بعد سیاسی منظر نامے سے غائب ہو جائیں گے۔ کرزئی کو جب امریکی عزائم اور بے وفائی کا مکمل احساس ہونے لگا تو انہوں نے کاؤنٹر اٹیک کے طور پر نہ صرف یہ کہ عبداللہ عبداللہ کے بعض ساتھیوں اور شمالی اتحاد کے لیڈروں کو اپنے ساتھ ملا لیا بلکہ انہوں نے طالبان اور حزب اسلامی کے ساتھ مفاہمتی عمل کی رفتار بھی تیز کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عوامی سطح پر کرزئی کو پہلی بار ایک جرأت مند لیڈر سمجھا جانے لگا جبکہ طالبان اور حزب اسلامی کی جانب سے انتخابات کے دوران ممکنہ گڑبڑ یا مزاحمت کے خطرات بھی کم ہوتے گئے۔ اس عمل سے جہاں ایک طرف کرزئی کی حمایت میں اضافہ ہونے لگا، وہاں ان کی بعض نمائندہ قوتوں کے ساتھ قربت بھی بڑھ گئی۔ الیکشن کا عمل جب شروع ہوا تو اس پالیسی کے باعث بعض دوسرے علاقوں کے علاوہ طالبان کے زیر اثر علاقوں، مثال کے طور پر قندھار وغیرہ میں بھی لوگ کرزئی کو ووٹ دینے نکل آئے۔ اس سے قبل جب امریکہ نے عبداللہ عبداللہ کو میدان میں اتارا تو پاکستان کو نہ چاہتے ہوئے بھی نسبتاً بہتر آپشن کے طور پر غیر اعلانیہ طور پر حامد کرزئی کی حمایت کا فیصلہ کرنا پڑا۔ ذرائع کا کہنا ہے کہ کرزئی اور پاکستان کو اس خاص مرحلے کے دوران قریب لانے میں پی پی پی اور اے این پی کے بعض لیڈروں کے علاوہ کابل میں پاکستان کے پشتون سفیر محمد صادق نے اہم کردار ادا کیا تھا جبکہ اس عمل کو پاکستان کی مقتدر قوتوں کی آشیر باد بھی حاصل تھی کیونکہ ان کیلئے عبداللہ عبداللہ اور ان کی پاکستان مخالف ٹیم کا کابل کے قصرِ صدارت تک پہنچنا کسی بھی صورت میں سود مند اور قابل

برداشت آپشن نہیں تھا۔

کرزئی نے افغان پارلیمنٹ کو بااختیار اور طاقتور بنانے کیلئے اپنے نامزد وزراء کی منظوری پارلیمنٹ سے لینے کی پالیسی اپنائی۔ اس عمل کے دوران پارلیمنٹ نے ایک درجن سے زائد نامزد وزراء پر جب اعتراضات کئے تو کرزئی نے ان کو کابینہ کی فہرست سے نکال کر متبادل اور قابل قبول وزراء کو اپنی ٹیم میں شامل کر کے ایک اچھی مثال قائم کی۔ اس حکمت عملی کا نتیجہ یہ نکلا کہ عوام کو کسی بڑی تبدیلی کا احساس ہونے لگا اور کرزئی کی قوت، خود اعتمادی اور شہرت میں اضافہ ہونے لگا۔ اس تمام عرصہ کے دوران افغان صدر امریکی انتظامیہ سے اس کے باوجود خاصے فاصلے پر رہے کہ ان کا اب بھی کافی انحصار امریکہ اور اس کے اتحادیوں پر تھا، تاہم بعض اتحادی ایسے تھے جو کرزئی کی اس پالیسی یا مزاحمت کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھ کر ان کو ڈٹے رہنے کا مشورہ دے رہے تھے۔ ان ممالک میں سے اکثریت کا تعلق یورپ سے تھا اور وہ پہلے سے ہی یہ نہیں چاہتے تھے کہ امریکہ کو افغانستان میں اس حد تک فری ہینڈ دیا جائے کہ یورپ کا عمل دخل اور اس کے مفادات پس منظر میں چلے جائیں۔ دوسرا، طالبان اور حزب اسلامی جیسی امریکہ مخالف قوتیں بتدریج امریکہ پر دباؤ بڑھا رہی تھیں، تاہم اندرون خانہ وہ کرزئی کے قریب بھی آتی گئیں۔ ان تبدیل ہوتے ہوئے حالات نے امریکہ کو مجبور کیا کہ وہ کرزئی کے ساتھ سرد مہری اور مخالفت پر مبنی اپنا رویہ ترک کر دے کیونکہ متبادل کے طور پر دوسرا صدر لانے اور دباؤ کی صورت میں کرزئی کو جھکانے کی امریکہ کی تمام کوششیں ناکام ہو گئی تھیں اور اس کی ناکامی کے بعد کرزئی پر انحصار کرنے کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ باقی نہیں بچا تھا۔ امریکہ کی طرف سے اعتماد سازی کی کوششوں کے باوجود عملاً یوں دکھائی دینے لگا کہ کرزئی اب باغی بچے کی صورت اختیار کر گئے ہیں اور وہ موزوں حالات سے فائدہ اٹھا کر اپنی من مانیاں کرنے کی پوزیشن میں آ گئے ہیں۔ اس عرصہ کے دوران وہ امریکہ کو ٹف فائم دینے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دے رہے تھے اور اس رویے کے باعث ان کے سیاسی اثر ورسوخ اور شہرت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس دوران کرزئی نے یہ بھی کہنا شروع کر دیا کہ امریکہ اور اس کی اتحادی فورسز افغانستان سے نکل بھی جائیں تو افغان فورسز افغانستان کے دفاع کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہیں۔ اس مؤقف یا دعوے نے امریکیوں کی تشویش میں اور بھی اضافہ

کر دیا اور جب کرزئی واشنگٹن کا دورہ کرنے گئے تو ان کو نہ صرف یہ کہ زبردست پروٹوکول دیا گیا بلکہ اس دورہ کے دوران وہ فاتح اور امریکی مفتوح نظر آنے لگے۔ اگلے مرحلے میں قندھار آپریشن کے معاملے پر کرزئی ایک بار پھر سے مخالفت پر اتر آئے کیونکہ قندھار سے تعلق رکھنے کے باعث وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ اس اہم علاقے میں آپریشن کی ناکامی کی صورت میں علاقائی سطح پر ان کی مشکلات میں اور بھی اضافہ ہو اور اس کے ساتھ ساتھ طالبان کے ساتھ ان کا مذاکراتی عمل بھی متاثر ہو۔ اس تمام صورتحال سے جو نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے، اس کا خلاصہ کچھ یوں بنتا دکھائی دیتا ہے کہ امریکہ کی اپنی غلط پالیسیوں کے باعث حامد کرزئی اس کے گلے میں پھنسی ہڈی کی صورت اختیار کر گئے ہیں جن کو امریکہ بوجوہ اقتدار میں لے کر آیا تھا۔

زیرِ نظر کتاب سینئر صحافی، کالم نگار اور محقق عقیل یوسفزئی کے مضامین کا مجموعہ ہے جو انہوں نے گزشتہ کچھ عرصہ کے دوران مختلف اخبارات اور جرائد کے لیے تحریر کیے ہیں۔ یوں یہ کتاب اس عہد کی ایک تاریخی دستاویز قرار پاتی ہے۔ اس کتاب میں وہ طالبانائزیشن، فاٹا کی تاریخ اور مستقبل، پاکستان اور خاص طور پر خیبر پختونخوا میں دہشت گردی کے منظرنامے، حکومت کی جانب سے انسدادِ دہشت گردی کے لیے کیے جانے والے اقدامات اور دیگر اہم موضوعات کو زیرِ بحث لائے ہیں۔ مصنف عقیل یوسفزئی عسکریت پسندی کے امور کے ماہر ہیں۔ علاوہ ازیں ان کی اس موضوع پر دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

Narratives

پوسٹ بکس نمبر 2110، اسلام آباد
فون: 051-2291586
ای میل: info@narratives.pk
ویب سائٹ: narratives.pk

ISBN-978-969-9645-01-3
9 789699 645013
Price: 450/-